Scanned by CamScanner

گیسوئے افکار

(ادبی مضامین)

ڈاکٹر امام اعظم

Scanned by CamScanner

© بحق مصنف محفوظ

اس کتاب کی اشاعت میں محکمہ راج بھاشا، اردو ڈائریکٹوریٹ، حکومت بہار کا مالی تعاون شامل ہے۔

Gesu-e-Afkaar

(Literary Essays)

by **Dr. Imam Azam**

Regional Director, MANUU Regional Center
1A/1, Chatu Babu Lane, 3rd Floor, Mohsin Hall, Kolkata-14 (WB)
E-mail: **imamazam96@gmail.com ; Blog: drimamazam.blogspot.com**
Cell: 8902496545 / 9431085816

ISBN : 978-93-89358-19-3
Year of Edition: **2019** ; Price: **Rs. 300/-**, Library Edition: **Rs. 350/-**

نام کتاب : **گیسوئے افکار** (ادبی مضامین)
مصنف : ڈاکٹر امام اعظم
زیر اہتمام : الفاروق ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ گنگوارہ، دربھنگہ-۸۴۶۰۰۷ (بہار)
تعداد : ۶۰۰
اشاعت اول : جولائی ۲۰۱۹ء
کمپوزنگ : رفعت کمال حاجی نگر، شمالی ۲۴ پرگنہ (مغربی بنگال) موبائل: **9062367278**
صفحات : ۲۷۲
قیمت : ۳۰۰/روپے لائبریری ایڈیشن: ۳۵۰/روپے
مطبع : روشان پرنٹرز، دہلی-۶
ملنے کے پتے : ☆ تمثیل نو پبلی کیشنز، محلہ: گنگوارہ، پوسٹ: سارا موہن پور، دربھنگہ-۸۴۶۰۰۷
☆ بک امپوریم، اردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ-۸۰۰۰۰۴ (بہار)
☆ ناولٹی بکس، قلعہ گھاٹ، دربھنگہ-۸۴۶۰۰۴ (بہار)
☆ شمسی بک سینٹر، اسٹیشن روڈ، سمستی پور-۸۴۸۱۰۱ (بہار)
☆ عثمانیہ بک ڈپو، ۱۱/ رکولوٹولہ لین، کولکاتا-۷۰۰۰۷۳ (مغربی بنگال)

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3191, Wakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (India)
Ph. : 23216162, 23214465 Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbook.com, ephindia@gmail.com
Website: www.ephbooks.com

Scanned by CamScanner

انتساب

اردو دوست

جناب **عامر سبحانی** آئی اے ایس

(ایڈیشنل چیف سکریٹری داخلہ اور اقلیتی فلاح، حکومت بہار)

کے نام

ع اپنا لہو بھی سرخیٔ شام و سحر میں ہے!

Scanned by CamScanner

پیش خدمت ہے کتب خانہ گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے
https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
0307-2128068
@Stranger

مشمولات

- حرفِ اوّل 6

O

- اکیسویں صدی میں اردو زبان کی عالمگیر مقبولیت 7
- سہرے کی ادبی معنویت 16
- فورٹ ولیم کالج کے اہم مصنفین اور ان کی خدمات 35
- لسانی جامعات اور فاصلاتی تعلیم: اردو زبان کے حوالے سے 43
- ہندوستانی فلموں میں تفریح کے پہلو 49
- عبدالغفور شہباز کے خطوط کی اہمیت 52
- پروفیسر گوپی چند نارنگ: مابعد جدیدیت کے سالار 61
- 'شاہ مقبول احمد: حیات وخدمات': جائزہ 66
- ڈاکٹر محمد اسلم پرویز: اردو اور سائنس کے نکتہ شناس 70
- ظہیر انور کا "چراغ رہ گذر": اردو سفرنامے کا سنگ میل 76
- ریحانہ محمد علی اور مشاہیر کے ازدواجی خطوط کا تجزیہ 81
- شکیل افروز کی "عملی صحافت" ایک بصیرت افروز کتاب 86
- محمد ارشد جمیل: احساسات کے آئینے میں 91
- حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ: پیکرِ علم وادب 95

O

- نظیر اکبرآبادی کی شاعری کے تنوعات 103
- پرویز شاہدی: ترقی پسند تحریک کی توانا آواز 109
- شاکر کلکتوی: منفرد احساس کا شاعر 119

Scanned by CamScanner

- مظہر امام کی شاعری ''زخم تمنا'' کے حوالے سے 124
- منظر شہاب کا ادبی منظر نامہ 142
- مظفر حنفی کی شاعری کا منفرد آہنگ 152
- سیّد احمد شمیم: عصرِ نو کا ایک اہم شاعر 158
- مناظر عاشق ہرگانوی کی نعتوں میں جاگتے احساس کی چبھن 163
- ارشد مینا نگری کی تخلیقی بصیرت 'ماں' کے آئینے میں 168
- نواز دیوبندی کی غزلیہ شاعری میں عصری مسائل 172
- عبرت بہرائچی: شاعرِ 'دُرِ ناسفتہ' 176
- احسان ثاقب: لفظوں کا کیمیاگر 180
- سجاد شاکری کا ''رقصِ الہام'' 184
- قمر رئیس بہرائچی کی غزل گوئی 187
- بدر محمدی کی شاعری میں رمزیت 190
- ظفر فاروقی: گنگا جمنی تہذیب کے پیکر 196
- اکیسویں صدی میں آزاد غزل گو شاعرات 224

O

- عبدالحلیم شرر اور 'فردوسِ بریں' 229
- ظفر اوگانوی: جدید اردو افسانے کا اہم نام 238
- عابد معز کے افسانوں میں شگفتگی 246
- بیگ احساس کا افسانوی مجموعہ ''دخمہ'' 251
- صدیق عالم: ''چارنک کی کشتی'' اور عورتوں کے مسائل 260
- اسلم جمشید پوری: ایک ہمہ جہت فنکار 268

❖❖❖

Scanned by CamScanner

حرفِ اوّل

''گیسوئے تنقید''، ''گیسوئے تحریر'' اور ''گیسوئے اسلوب'' کے بعد ''گیسوئے افکار'' میرے ادبی مضامین کا تازہ مجموعہ ہے۔ اس میں ادب کے اعترافات کی روایت کے اثرات نمایاں ہیں۔ ان مضامین میں کئی اصناف کی رفاقت اور فیض رسانی ہے، ساتھ ہی ان میں وجود کی قفل کشائی بھی ہے تاکہ نئے موضوعات اور اہم شخصیات کا گہرا نقش سامنے آسکے، افق پر اُن ستاروں کے تخلیقی و تنقیدی کارنامے کے فنی لوازمات دیکھنے کو مل سکیں اور نیا جہانِ معنیٰ پیدا ہو کر آگاہی سے ظہور پذیر ہو سکے۔ توازن اور اعتدال کو میں نے سامنے رکھا ہے اور ہم عصر کردار کو اہمیت دی ہے۔ مختلف النوع موضوعات کی کئی جہتیں ہیں جن میں اثرات کی روشنی ہے، واقعات کے تانا بانا میں تحریر کی قوت ہے اور مؤثر اور فعال شعور کے اظہار کی تقویت بھی ہے۔ میں نے تہذیبی معنویت کو اجاگر کیا ہے اور مفہوم کی ترجمانی کی ذہنی عکاسی کی ہے، ساتھ ہی حقائق کو اپنے دامن میں سمیٹنے کی سعی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حقیقت کی تلاش اور حقائق کی بازیافت ان مضامین میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ حس و ادراک کی صحیح سمت کا تعین میں نے کیا ہے اور طرزِ عمل پر کاربند رہ کر تفصیل پر نظر ڈالی ہے۔ عقل و دلائل کے لئے میں نے معنیٰ آفرینی کو فوقیت دی ہے اور تنقید و تحقیق میں دیدہ ریزی کا التزام برتا ہے۔ اس لئے میرے یہ مضامین علم و آگہی کے نئے چراغ روشن کرتے ہیں، دلائل کی روشنی میں حقائق کا انکشاف کرتے ہیں اور پوشیدہ و تاریک گوشوں کو نئی کرنوں سے منور کرتے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب اردو حلقوں میں پسند کی جائے گی—!

ڈاکٹر امام اعظم

کولکاتا، ۲۰ رجولائی ۲۰۱۹ء

❖❖❖

Scanned by CamScanner

اکیسویں صدی میں اردو زبان کی عالمگیر مقبولیت

اردو زبان دنیا کی چند بڑی اور ترقی یافتہ زبانوں میں ایک ہے۔ اس میں دوسری زبانوں اور تہذیبوں کو جذب کرنے کی صلاحیت اور روایت بدرجہ اتم موجود ہے۔ اسی مزاج نے اسے عوامی زبان بنایا اور برصغیر ہندو پاک میں ایک عرصہ تک دفاتر کی واحد زبان بنی رہی اور فی زمانہ دنیا کے تقریباً ہر بڑے شہر میں انگریزی کے بعد اردو رابطے کی زبان بن گئی ہے۔ ڈاکٹر اے جے مالوی کے خیالات یہاں بڑے ہی کار آمد ہیں۔ انھوں نے ویدک ادب میں تلاش و جستجو کے ضمن میں جو باتیں لکھی ہیں، اس کا تعلق اردو کی مقبولیت سے وابستہ ہے۔ وہ رقم طراز ہیں :

> ''...... ہندوستان کی تمام زبانیں مختلف لسانی تبدیلیوں کے ساتھ دسویں صدی میں وجود میں آئیں لیکن ویدک ادب میں استعمال کردہ لفظ اردو، امن اور ماورائے دماغ متواتر اکیسویں صدی تک ہو بہو استعمال ہو رہے ہیں اور اردو کی یہ مقدس ویدی اصطلاح اکیسویں صدی کے عالمی، قومی اور مقامی پس منظر میں حقیقی معنوں میں بین الاقوامی محبوبیت اور مقبولیت کی امین ہوگئی ہے۔ آج پوری دنیا سمٹ کر عالمی گاؤں میں تبدیل ہو چکی ہے اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب کا خورشید نشان اردو عالمی گاؤں کا جاگتا جگمگاتا ہوا عالمی نشانِ امتیاز بن چکا ہے۔''
>
> (''ویدک ادب اور اردو'' ص:۸۴)

آج دنیا کے تقریباً تمام ملکوں میں اردو ایک اہم زبان کی حیثیت سے پڑھائی جارہی ہے۔ برطانیہ تو اردو کے سوادِ اعظم سے باہر اردو کا تیسرا سب سے بڑا مرکز ہے اور وہاں کی تقریباً تمام یونیورسٹیوں میں اردو پڑھائی جاتی ہے۔ اردو کے متعدد اخبارات اور رسائل بھی شائع ہوتے ہیں اور درجنوں انجمنیں کام کر رہی ہیں۔ اسکول آف اورینٹل افریقن اسٹڈیز اردو کی اعلیٰ تعلیم اور

Scanned by CamScanner

تحقیقات کا مرکز ہے۔ امریکہ سے بھی اردو کے متعدد اخبارات و رسائل نکلتے ہیں اور کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ وہاں کی اکثر یونیورسٹیوں میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے۔ کینیڈا کی کئی یونیورسٹیوں میں بھی اردو کی تعلیم کا بندوبست ہے جہاں سے کتابیں بھی شائع ہوتی رہتی ہیں، اخبارات و رسائل بھی نکلتے ہیں اور ٹورنٹو یونیورسٹی کے علاوہ دیگر یونیورسٹیوں میں اردو تعلیم کا نظم ہے۔ یہاں کی مونٹریل یونیورسٹی میں اقبال چیئر قائم ہے۔ جاپان، چین، جنوبی افریقہ، ناروے، پراگ، برلن اور سابقہ سویت یونین ممالک میں بھی اردو زبان پڑھائی جاتی ہے اور اس کے بولنے والوں کی اچھی تعداد موجود ہے۔ ماریشس میں اردو تیسری زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ استنبول یونیورسٹی میں باضابطہ اردو کا شعبہ ہے اور یہاں اکثر اردو کے پروگرام ہوتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ رنگون، سنگاپور اور ہانگ کانگ میں بھی رابطے کی زبان کے طور سے اردو رائج ہے اور وہاں سے اردو اخبارات و رسائل بھی شائع ہو رہے ہیں۔ عرب ممالک بشمول مصر اور خلیج کے بہت سے علاقے نیز ایران کی متعدد یونیورسٹیوں میں اردو کے شعبے قائم ہیں۔

برصغیر ہند و پاک، بنگلہ دیش اور نیپال کے کروڑوں لوگوں کی مادری زبان اردو ہے۔ سرکاری سطح پر دیکھا جائے تو پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہے۔ ہندوستان میں اردو کو ریاست جموں و کشمیر میں پہلی سرکاری زبان جب کہ بہار، اتر پردیش، تلنگانہ، مغربی بنگال اور دہلی ریاستوں میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ مہاراشٹر، کرناٹک اور آندھرا پردیش وغیرہ ریاستوں میں اردو داں طبقہ کثیر تعداد میں رہائش پذیر ہے۔ چنانچہ برصغیر میں اردو رابطے کی سب سے بڑی اور موثر زبان کی حیثیت رکھتی ہے نیز مذہب اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں عربی کے علاوہ اگر کسی زبان نے اہم رول ادا کیا ہے تو وہ اردو ہی ہے۔ اس زبان میں اسلامی لٹریچر کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ تفسیر، شرح حدیث، فقہ و سیرت کے علاوہ دیگر تمام علوم و فنون میں بھی اردو زبان میں بہترین کتابیں موجود ہیں۔ ایک دوسری اہم حقیقت یہ بھی ہے کہ اس وقت برصغیر کے مسلمانوں کی ایک اچھی تعداد روزگار کے سلسلے میں عرب کے مختلف ممالک میں پھیلی ہوئی ہے جن کی مادری زبان اردو ہے۔ عرب اقوام جو اس وقت بہت تیزی کے ساتھ ترقی کی راہ پر گامزن ہیں اور دنیا کی تیسری

Scanned by CamScanner

طاقت بلکہ موجودہ سیاسی صورت حال کے پیش نظر دوسری بڑی طاقت کے طور پر دیکھی جارہی ہیں، ان کے لئے اردو جیسی اہم اور ترقی یافتہ زبان سے گہری دلچسپی اور واقفیت وقت کی ضرورت ہے۔

اردو اپنے رسم الخط میں اور اپنی قواعد اور لغت میں عربی سے قریبی اشتراک رکھتی ہے۔اور اردو بولنے والے عربی زبان رغبت سے سیکھتے ہیں کیوں کہ یہ قرآن پاک اور حدیث کی زبان ہے۔ ساتھ ہی ملکِ عرب اور وہاں کے باشندوں کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔لہٰذا داعیٔ اسلام اور پاسبانِ حرم کی حیثیت سے عربوں کو چاہئے کہ وہ اردو زبان کو ایک غیر ملکی زبان کی حیثیت سے سیکھیں اور پڑھیں جس طرح وہ انگریزی اور فرنچ وغیرہ سیکھتے ہیں۔اس کے نتیجے میں عرب کے باشندوں اور اردو جاننے والوں کے درمیان رابطہ قوی ہوگا اور عالمی اسلامی اتحاد کی راہ میں یہ ایک مفید اور اہم قدم ہوگا ساتھ ہی اردو داں آبادی کے درمیان اسلامی عقیدہ اور دین کی اشاعت کا کام اہل عرب براہ راست کرسکیں گے۔

چونکہ زبانیں معاشرتی تہذیب کی ورثہ دار ہوتی ہیں۔ اس لئے بھی مربوط اور بہتر تعلقات کے استوار کرنے میں زبان کی مہارت اور واقفیت عالمی پیمانے پر مانی جاتی ہے۔مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں اردو زبان کی بین الاقوامی حیثیت مسلم ہوجاتی ہے۔جدید بین الملّی، سیاسی ،ثقافتی ،تجارتی اور اقتصادی تحولات کی روشنی میں اور اس کے ساتھ ساتھ عرب ممالک کے دنیا سے تجارتی تعلقات کی تاریخی اہمیت کے پیشِ نظر ایشیا میں پائیدار، پرامن اور ترقی پذیر ماحول قائم رکھنے کیلئے یہ ضروری ہے کہ ایشیائی ممالک کے درمیان ان کی مقبول عام زبانوں کی واقفیت کا منصوبہ بندلین دین ہوتا رہے۔اس لئے زبان عالمی برادری اور بھائی چارہ قائم کرنے میں ایک قوی محرک ہوسکتی ہے۔اسے بھی ایک اہم جواز کی حیثیت سے پیش کیا جاسکتا ہے۔

اردو کی عالمگیریت میں ایک بڑا کردار اطلاعاتی تکنالوجی بھی ادا کررہی ہے۔انٹرنیٹ کے وسیلے سے کمپیوٹر اور موبائل فون نے ایک انقلاب لادیا ہے۔دنیا دن بہ دن سمٹتی جارہی ہے۔ چند سطور کا ایس ایم ایس ہو، یا آڈیو/ویڈیو سے مزین ایم ایم ایس یا بھاری بھرکم فائلوں پر مشتمل ای میل سکنڈوں میں دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے میں پہنچ جانا اب ایک عام سی بات

Scanned by CamScanner

ہے۔زبان کے ہجے اور قواعد کی پابندیوں سے آزاد جملوں کی بھرمار اور مختصر سے پیرائے میں اپنی بات کو سموتے ہوئے ایک نئی زبان ایجاد ہورہی ہے اور اسے پسند کیا جارہا ہے۔اس لئے زبان پر جتنی زیادہ قدرت حاصل ہوگی اتنی زیادہ مہارت سے اظہار کا وسیلہ بہتر طریقہ سے سامنے آئے گا اس لئے اکیسویں صدی میں زبان کی اہمیت اور بھی زیادہ ہوگئی ہے۔

انٹرنیٹ پر نثر اور شاعری کے بے شمار نمونے روز دیکھنے کو ملتے ہیں۔اگر زبان کی اہمیت اکیسویں صدی میں کم ہوجاتی تو ابن انشاء کی طرح اردو کی آخری کتاب لکھنا پڑتا لیکن اوراق اگر اسکرین بن جائیں اور Font اگر ٹائپنگ میں قلم کا رول ادا کریں تو اس سے یہ سمجھ لینا کہ اکیسویں صدی میں کتابوں رسالوں اور زبانوں کی اہمیت گھٹ گئی ہے تنگ نظری ہے۔ کیونکہ زمانہ کی تبدیلی شعبۂ حیات کے ہر پہلو پر اثر انداز ہوتی ہے اور جدید ترٹکنالوجی کے بڑھتے سیلاب نے اس بھرم کو دور کردیا ہے کہ زبان اور اس کے ادب کا مطالعہ ہر لحہ کیا جاسکتا ہے۔اب تو روز کا تازہ اخبار ایک کی جگہ چار بہ آسانی انٹرنیٹ کے اسکرین پر پڑھا جاتا ہے۔ان میں ہر پل ہونے والی تبدیلیوں سے آگاہی ہوتی ہے۔اردو یونی کوڈ فونٹ کی ایجاد نے اردو میں ویب سائٹس اور ایپس کی تیاری میں بڑی مدد کی ہے۔اب ماؤس کی ایک کلک سے یا موبائل کے ایک بٹن کو دبا کر اپنی زبان میں بھی معلومات کا ذخیرہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔دنیا کے سب سے بڑے سرچ انجن گوگل پر اردو میں تلاش کرنے کے بہت سے متبادل دیگر بین اقوامی زبانوں کی طرح ہی دستیاب ہیں۔اسی طرح مشہور آن لائن انسائیکلوپیڈیا ''وکی پیڈیا'' پر اردو میں بھی مطلوبہ مواد مل جاتا ہے۔ساتھ ہی اس میں ترمیم واضافہ کی گنجائش بھی موجود ہے۔سی این این اور بی بی سی جیسی دنیا کی بڑی خبر رساں ایجنسیوں کے اردو ویب سائٹس معتبر اور مستند خبروں سے ہمہ وقت بھرے رہتے ہیں۔فیس بک، ٹوئٹر، انسٹاگرام اور دیگر مقبول عام سوشل میڈیا پلیٹ فارمس پر اسی یونی کوڈ ٹکنالوجی نے اردو لکھنے میں مدد پہنچائی ہے۔یوٹیوب پر اردو سیکھنے سکھانے کے متعلق بہت سے ویڈیو روزانہ اپ لوڈ کئے جاتے ہیں۔

اکیسویں صدی کی پہلی دہائی کے بعد یہ رفتار اور تیز ہوگئی ہے لیکن روایت پسند حضرات

Scanned by CamScanner

اسے دوسرے زاویوں سے دیکھ رہے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اردو جاننے والے، پڑھنے والے، لکھنے والے کم ہوتے جا رہے ہیں حالانکہ ایسی بات نہیں ہے۔ اب ترسیل وابلاغ کے نئے ذرائع کی سہولت کے بعد زبان میں اور بھی ترقی ہوئی ہے۔ نئے نئے الفاظ کا اضافہ ہوا ہے۔ نئے نئے طریقہ اظہار کے تجربے ہو رہے ہیں۔ اردو زبان میں یہ مکالمے، یہ خبریں یہ سیریل، یہ کہانیاں، ٹی وی اور کمپیوٹر کے ذریعہ ہم لوگوں تک پہنچ رہے ہیں۔ یہ زبان کا عروج نہیں تو اور کیا ہے؟ مارکونی نے ریڈیو ویب کے ذریعہ زبان کو مالا مال کیا تھا اور کچھ عرصہ قبل تک دور دراز علاقوں میں جہاں بجلی اور دیگر سہولیات نہیں تھیں اور رابطے کٹے ہوئے تھے وہاں ابلاغ کا زبردست ذریعہ ٹرانزسٹر ہوا کرتے تھے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس سے اخبار کی اہمیت گھٹ گئی تھی یا پرنٹ میڈیا ختم ہو گیا تھا۔ ڈرامے، شاعری، افسانے، سب ریڈیو سے براڈ کاسٹ ہونے لگے تھے اور اردو زبان وہاں تک پہنچنے لگی تھی جہاں تصور کام نہیں کرتا تھا۔ ریڈیو سے اس کا دائرہ وسیع ہوا۔ سیلولائڈ نے بھی اردو کے فروغ میں اہم رول ادا کیا اور اکیسویں صدی میں ٹی وی اور انٹرنیٹ نے اردو کو اور بھی مزین کرنے کا کام کیا۔

ہندوستانی فلموں نے اردو زبان کے فروغ میں جو کردار ادا کیا، اس کی اہمیت وافادیت کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس موضوع پر اب تک بے شمار سیمینار منعقد ہو چکے ہیں اور کئی یونیورسٹیوں میں پی ایچ ڈی کے مقالے بھی قلم بند کئے جا چکے ہیں۔ راقم الحروف کی کنوینرشپ میں مارچ ۲۰۱۱ء میں دربھنگہ (بہار) میں یکروزہ ''ہندوستانی فلمیں اور اردو'' کا کامیاب انعقاد قومی اردو کونسل کے تعاون سے ہوا تھا جس کی ادبی حلقوں میں بے حد پذیرائی ہوئی تھی۔ اس سیمینار میں پیش کئے گئے مقالوں پر مبنی ایک ضخیم اور وقیع کتاب ۲۰۱۲ء میں منظرِ عام پر آ چکی ہے جس سے ریسرچ اسکالروں اور طالب علموں کو اس موضوع پر کام کرنے میں بہت سہولت ہو گئی ہے۔ ٹیلی ویژن پر اردو کیبل چینلز بھی اب عام ہوتے جا رہے ہیں جن پر ۲۴ رگھنٹے پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔ ان پروگراموں میں فلمیں، سیریل، مشاعرے، اہم ادباء وشعراء پر دستاویزی فلمیں، ڈرامے اور اردو تہذیب وثقافت سے متعلق پروگرام شامل ہیں۔ ای. ٹی. وی.

Scanned by CamScanner

اردو چینل کا ۱۵ راگست ۲۰۰۱ء میں آغاز ہوا جو ہندوستان میں غالباً پہلا غیر سرکاری اردو چینل ہے جس کے روحِ رواں جناب راموجی راؤ ہیں۔ اردو زبان کے فروغ و اشاعت میں موصوف اور ان کے ٹی وی چینل کی خدمات نا قابلِ فراموش ہیں۔ ۲۰۰۸ء تک اس چینل پر ''آؤ اردو سیکھیں'' نامی ایک پروگرام نشر کیا جاتا تھا جس کے میزبان پروفیسر مظفر شہ میری ہوا کرتے تھے۔ اس پروگرام کے ذریعہ عالمی سطح پر لاکھوں افراد نے اردو لکھنا، پڑھنا سیکھا۔

اکیسویں صدی میں زبان کے عروج کے بہت سارے اسباب ہیں۔ پہلے زبان کے لئے ادبی کاوشیں ہی موثر ذریعہ تھیں جن سے لوگ اپنے آپ کو اظہار کے قابل سمجھتے تھے لیکن اب تو ہر شعبۂ حیات میں زبان کی ضرورت ہے۔ اگر کھیل کا میدان ہے تو اس کی رننگ کامنٹری کے لئے بھی زبان کا سہارا لینا ہے۔ زبان کی ضرورت بڑھی اور اس کا دائرہ بھی بڑھا اور لوگ زبان کو مزید چست درست بنانے میں لگے رہے اور دنیا کی زبانوں سے اختلاط کا موقع اردو زبان کو اور زیادہ ملا اور اس کے ذخیرہ الفاظ میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ زبان ایسی اہل ہوگئی کہ یہ اپنے تقاضوں کو اور ضرورتوں کو پیش کرنے میں کہیں بھی اور کسی صورت بھی کم نہیں رہی۔ اس لئے اکیسویں صدی زبان کے عروج کی اہم وجہ ہے۔

بیسویں صدی میں بالخصوص ہندوستان میں پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کی کوششوں سے بہت ساری اکیڈمیز کا قیام عمل میں آیا اور ہندوستان کے مختلف فنون لطیفہ کو مزید زندگی بخشی اور ان کے تحفظ کے لئے اس طرح کے ادارے قائم کئے۔ ساہتیہ اکیڈمی نے ہندوستان کی مختلف زبانوں میں ادبی کاوشوں کو محفوظ کرنے کا کام کیا اور بیسویں صدی کی آخری دہائی اور اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں عمدہ ادب کا ذخیرہ دیا۔ اس ذخیرہ میں اردو زبان کا بھی ایک بڑا حصہ ہے۔ بیسویں صدی میں ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں اردو اکاڈمیاں قائم کی گئیں۔ یہ اکاڈمیاں بیسویں صدی میں بہت زیادہ فعال نہیں تھیں لیکن اکیسویں صدی میں ان کی فعالیت میں اضافہ ہوا ہے اور اپنی حدود میں رہ کر یہ اکادمیاں قلم کاروں کو کتابوں کی اشاعت کیلئے مالی تعاون، کتابوں پر انعامات، نادار اور بزرگ قلم کاروں کو وظائف وغیرہ سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ غیر سرکاری

Scanned by CamScanner

اداروں میں غالب انسٹی ٹیوٹ اور غالب اکاڈمی جیسے ادارے فعال ہیں۔ان اکادمیوں کے علاوہ انجمن ترقی اردو ہند اور اس کی بعض ریاستی شاخوں نے بھی اپنے کام کو رفتار دی ہے اور اس کے زیرِ نگرانی اشاعتی کام تیزی سے ہوئے ہیں۔درمیان میں فنڈ اور حالات کی ناسازگاری کے سبب انجمن کی سرگرمیاں کسی حد تک تعطل کا شکار ہوگئی تھیں مگر اب انجمن اپنی اشاعتی سرگرمیوں اور خوبصورت ویب سائٹ کے ساتھ پھر سے اردو کی ترویج و اشاعت میں سرگرمِ عمل ہے۔

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان نے بھی دور دراز علاقوں تک اردو کی ترسیل میں اہم کردار ادا کیا ہے۔کونسل تقریباً دو دہائیوں سے مختلف اسکولوں، کالجوں اور اردو اداروں میں کمپیوٹر کی فراہمی کر کے اردو زبان میں کمپیوٹر ٹریننگ کورس کا اہتمام کرتی آرہی ہے جس کے ذریعہ آج لاکھوں اردو داں طالب علم اپنی مادری زبان میں کمپیوٹر سیکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔کونسل نے دوسری زبانوں کی اہم کتابوں کے ترجمے بھی بحسن وخوبی کرائے ہیں۔گاڑی پر کتابوں کی فروخت کا سلسلہ قائم کر کے اردو کتابوں کو کونسل نے ایسی دور دراز اردو بستیوں تک پہنچایا ہے جہاں کے لوگوں کے لئے کتابوں کی خرید آسان نہیں تھی۔اردو قلم کاروں کی کتابوں کی تھوک خریداری اور اشاعت پر مالی تعاون کے ذریعہ کونسل نے بڑا کام کیا ہے۔کونسل کے اس وقت کے ڈائریکٹر کی میعادِ کار کے دوران تیسری عالمی اردو کانفرنس بھی ہوئی جس کا شاندار انعقاد پچھلی دو کانفرنسوں کی کامیابی کی دلیل ہے۔قومی اردو کونسل کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ ای۔کتاب جو دنیا کا پہلا مفت ای۔پب ہے جسے ڈاؤن لوڈ کر کے کونسل کی مطبوعہ کتابوں کا مطالعہ کوئی بھی کرسکتا ہے۔یہ ایپ اردو کے مقبول ترین خط 'نستعلیق' میں اینڈرائڈ موبائل نیز کمپیوٹرس و لیپ ٹاپ پر اردو برقی کتابیں پڑھنے کا بہترین ذریعہ ہے۔اس ایپ کا اجراء ۲۴ رمارچ ۲۰۱۸ء کو پانچویں عالمی اردو کانفرنس کے دوران دہلی کے ہوٹل دی اشوک میں ہوا۔ہندوستان میں لسانی ادارے اور اردو میڈیم سے تعلیم دینے کے لئے جس شد و مد کے ساتھ اکیسویں صدی میں کام ہوا ہے اس سے پہلے ایسی کاوش دیکھنے کو نہیں ملتی۔مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے قیام سے اردو زبان کے گیسو سنوارنے کا ہی کام نہیں کیا گیا بلکہ ادب کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی اردو میں کتابیں فراہم

Scanned by CamScanner

کر کے ایک بڑا کام انجام دیا گیا اس سے اردو آبادی اکیسویں صدی میں فیضیاب ہو رہی ہے۔ یونیورسٹی کے موجودہ شیخ الجامعہ کی قیادت میں یونیورسٹی ترقی کے نئے مدارج طے کر رہی ہے۔ اردو ذریعہ تعلیم کے درجنوں روایتی اور فاصلاتی کورسز کے ذریعہ یونیورسٹی اردو داں طبقے کی اپنی مادری زبان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کر رہی ہے۔

سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کے علاوہ بہت سی ویب سائٹس بھی اردو زبان و ادب کے فروغ کا کام بڑے پیمانے پر کر رہی ہیں جن میں ریختہ ڈاٹ او آر جی سرفہرست ہے۔ ایک محبّ اردو جناب سنجیو صراف کی قیادت میں ریختہ کی ویب سائٹ پر ہزاروں اردو کتابوں کو ڈیجیٹائز کر دیا گیا ہے جس سے دنیا بھر کی بڑی لائبریریوں میں موجود نادر و نایاب اردو کتابیں ڈیسک ٹاپ یا لیپ ٹاپ پر ویب سائٹ اور موبائل میں ایپ کے ذریعہ قارئین کو دستیاب ہو گئی ہیں، جن سے خصوصی طور پر ریسرچ اسکالرز بھرپور فائدہ حاصل کر رہے ہیں۔ غیر اردو داں طبقہ کو اس زبان کی شیرینیت کا احساس دلانے کے لیے ہر سال اس ویب سائٹ کے زیر اہتمام ''جشنِ ریختہ'' کا انعقاد بڑے پیمانے پر کیا جاتا ہے۔ ایم قمر علیگ نے اپنی تحریر بعنوان ''اردو زبان کی زبوں حالی کا المیہ'' مطبوعہ روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' کولکاتا مرقومہ ۱۶ر فروری ۲۰۱۸ء میں اس پیاری زبان کی بقا پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''......خاموشی کے ساتھ جو لوگ اردو کی ارتقا کے لئے کام کر رہے ہیں، وہ قابل مبارک باد ہیں، لہٰذا امید کی جا سکتی ہے اردو کی نشاۃ ثانیہ اب بہت زیادہ دور نہیں ہے اور وہ اپنی روایتی آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہونے والی ہے۔ غیر مسلم ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے ذریعہ اردو کی ترقی و ترویج کے لئے جو کارہائے نمایاں انجام دئے جا رہے ہیں وہ بھی اردو کے تابناک مستقبل کی عکاسی کرتے ہیں۔ ذات پات یا مذہب کی بنیاد پر کوئی بھی زبان کسی دوسری زبان سے کمتر نہیں ہوتی ہے۔ یہ صرف کچھ لوگوں کے سوچنے کا غیر مناسب نظریہ ہے۔ سوشل میڈیا کے توسط سے آج اردو کو جس طرح سے فروغ مل رہا

Scanned by CamScanner

ہے وہی اس بات کی ضمانت ہے کہ زبانیں خود نہیں مرتیں بلکہ انہیں مارا جاتا ہے
اور ہم میں سے ہی کچھ لوگ ان کو برقرار رکھنے کے لئے سامنے آجاتے ہیں......"

مجھے اس بات کا پورا یقین ہے کہ اردو اپنی شیرینی، لطافت اور پرزور انداز میں متاثر کرنے کی صلاحیت کی بناپر اکیسویں صدی میں یقینی طور پر مزید وسعت اختیار کرے گی اور دلوں کو جوڑنے میں پر جوش عمل دکھلائے گی۔ اردو نے قومی یکجہتی اور اتحاد سے بھی اپنی شناخت کو منور کیا ہے۔ یہ ایک زندہ زبان کی علامت ہے جس سے افادیت اور مقصدیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اردو زبان اظہار کا بہترین مرقع ہے جس میں معنی و مفہوم کی گیرائی و گہرائی ملتی ہے۔ اکیسویں صدی میں معاشرہ کے بطون میں داخل ہوکر اردو جذبہ کی تسکین کا ذریعہ بنے گی اور پژمردگی کے چہرے کو صحت مند کرے گی۔ اپنی بات کا اختتام اپنے ہی ان دو قطعات پر کرتا ہوں :

پھیل جاتی ہے جو وہ خوشبو ہے　　دل کے اندر بسی ہوئی تو ہے
تجھ پہ لاکھوں نے دل نثار کئے　　تو ہماری زبان اردو ہے

....

دلوں پہ اس کا ہے راج اب تک　　مخالفوں سے نہ ڈر سکے گی
زمانہ چاہے ہزار بدلے　　زبانِ اردو نہ مر سکے گی

❖❖❖

پیش خدمت ہے کتب خانہ گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے
https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
0307-2128068
@Stranger

سہرے کی ادبی معنویت

روایت اور ضرورت کا رشتہ اٹوٹ ہوتا ہے۔شاعری محض اظہار جذبات اور فکری تجربوں کا نام نہیں ہے۔ یہ کبھی کبھی ضرورت بھی بن جاتی ہے۔شاعر جب شعر کہتا ہے تو اس کا مقصد صرف اپنی بات قاری تک پہنچانا نہیں ہوتا بلکہ خود اپنے ذوق کی تسکین بھی ہوتا ہے۔شاعری حساس ذہن و دل رکھنے والوں کے لئے ایک طرح کی خوراک ہے۔ سماج میں شاعری کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ یہ ایک فنکارانہ اظہار ہے اور اس میں ظاہری اور باطنی کیفیت کی آمیزش ہوتی ہے۔شاعری کے لئے اکثر موڈ کا ذکر کیا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ کبھی اشعار روانی کے ساتھ نازل ہوتے ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ شاعر موڈ میں تھا اور کبھی اشعار اتنی روانی سے شاعر پر نہیں اترتے ۔ یہ القاء شاعر پر کب ہوتا ہے یہ کہنا مشکل ہے۔

سہرا موقع محل کی صنف ہے اور فرمائش پر ضرورتاً لکھا جاتا ہے،لیکن اس کی روایت بہت قدیم ہے اور ہر زمانے میں شعراء نے صنف سہرا پر طبع آزمائی کی ہے۔عربی، فارسی اور اردو میں قصیدوں کی روایت قدیم ہے،سہرا بھی گویا قصیدے ہی کی ایک شاخ ہے،اس کی روایت قدماء کے یہاں موجود ہے جس سے اہلِ علم بخوبی واقف ہیں۔ممتاز شاعر و ادیب مظہر امام راقم الحروف (امام اعظم) کی شادی (۲۸ ردسمبر ۱۹۸۸ء) کے موقع پر شائع کئے جانے والے تہنیتی نظموں کے مجموعہ ”آرزو کے گلاب“ (مرتب: پروفیسر ایم اے ضیاء) کے پیش لفظ میں سہرے کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

> ”شادی، خوشی اور کامیابی کی اطلاع پا کر ہدیۂ تبریک و تہنیت نذر کرنا ایک فطری جذبہ ہے اور شاید روز آفرینش سے ہی یہ رسم بھی زندگی کے آداب میں شامل ہے۔ شادی بیاہ کے موقع پر منظوم سہرے پیش کرنے کا سلسلہ بھی دیرینہ ہے۔ہندوستان کے آخری فرماں روا بہادر شاہ ظفر کے شاہزادہ کی تقریب کتخدائی پر اس وقت

کے دو بلند پایہ شعراء کی باہمی چشمک کا اظہار بھی ان کے سہروں میں ہوا ہے۔
غالب کا یہ دعویٰ :

دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بڑھ کر سہرا

اور ذوق کا فی البدیہہ یہ جواب :

دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

اور پھر غالب کی انا آمیز معذرت اردو ادب کی تاریخ کا حصہ ہے۔
سہرے روایتی انداز میں بھی ہوتے ہیں اور تہنیتی نظموں کی صورت میں بھی، جو پابند بھی ہوتی ہیں اور آزاد بھی۔ ممکن ہے آئندہ تہنیت گزاری کے لیے نثری نظم، آزاد غزل یا ہائیکو جیسی اصناف کا بھی استعمال کیا جائے۔......" (ص:۳۰)

ڈاکٹر سرور کریم اپنی کتاب "دربھنگہ کا ادبی منظر نامہ: ڈاکٹر امام اعظم کی ادبی وصحافتی خدمات کے حوالے سے" میں سہروں کی روایت پر اس طرح اظہارِ خیال کرتے ہیں :

"شادی کی تقریبات کے موقع پر تہنیتی نظموں اور سہروں کی روایت اردو تہذیب کا حصہ رہی ہے۔......اردو کے بیشتر مراکز میں سہرا نویسی کا چلن رہا ہے۔ دربھنگہ کے شاعروں میں بھی تقریبات کے مواقع کو ادبی رنگ دینے کا رجحان پایا جاتا ہے۔......سہرے یا تقریبات کے موقع پر کہی گئی بیشتر نظمیں لحاتی یا وقتی نوعیت کی حامل ہوتی ہیں، لیکن شعرا اپنے تخلیقی اظہار سے بعض اوقات انھیں آفاقی حیثیت عطا کر دیتے ہیں۔ دراصل فن کاروں کا ایسا ہی تخلیقی رویہ ایسی نظموں کو ادبی معنویت کا حامل بنا دیتا ہے۔......" (ص:۲۵۶-۲۵۷)

سہرے کے لیے کوئی مخصوص زمین طے نہیں ہے۔ ہر طرح کے سہرے لکھے گئے ہیں اور آج بھی لکھے جا رہے ہیں۔ آزاد نظموں کی صورت میں بھی سہرے موجود ہیں۔ کہیں کہیں کاغذ کے رومال اور کیلنڈر پر بھی سہرے طبع کرا کے شادیوں میں تقسیم کرائے جاتے ہیں لیکن آج اکیسویں صدی کی شادیوں میں شاذ و نادر ہی سہرا خوانی ہوتی ہے۔

سہرے کی جو روایت رہی ہے اس میں بہت سارے تجربے کیے گئے ہیں اور غالب سے لے کر آج تک شعرائے کرام اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ بزمِ طرب جو سجائی گئی ہے اس میں دولہا دلہن کے علاوہ جو قابلِ احترام لوگ عزیز و اقارب سب کو مبارک باد نام بنام جہاں تک ممکن ہو پیش کریں۔ یہ مشکل کام اس لیے ہے کہ ناموں کی شمولیت سہرے میں مناسبت کے اعتبار سے کرنا فنکاری، مہارت اور لفظوں پر قدرت نیز بحور و اوزان کی پابندی کے دائرے میں رہ کر شاعر کی زود گوئی اور شعر کہنے کے ملکہ کو سامنے لاتا ہے۔ فنکاری کے ساتھ ناموں کی شمولیت سب کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ اب اگر شاعر اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہے تو اس کی قادر الکلامی پر سوالیہ نشان لگتا ہے، اور اگر ناموں کو شامل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ لفظی بازی گری ہے۔ بہر حال بہت سارے ناموں کی شمولیت سہرے میں ہونے سے مصرعے بوجھل ہو جاتے ہیں اور آمد کی کیفیت نہیں رہ جاتی لیکن قادر الکلام شعراء سہرے کی تمام پابندیوں کا لحاظ رکھتے ہوئے کبھی بخالت سے کام نہیں لیتے اور اس کے لئے جو شعری لوازمات ہیں ان کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔ **پروفیسر ایم صدر الدین** (کراچی، پاکستان) سہرے کی روایت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے گویا ہیں :

> "......تہنیتی نظموں کی اپنی الگ حیثیت ہے اور یہ ہماری روایات اور کلچر کا حصہ رہی ہیں۔......موجودہ سائنسی دور میں ڈاکٹر امام اعظم نے اس فن کو جو جلا بخشی ہے اور زندگی دی ہے، اور لالہ و گل کھلائے ہیں، واقعی یہ ادبی اور ثقافتی کارنامہ ہے۔ یہ ادبی ورثہ ہے۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ رسم کم و بیش تفاوت کے ساتھ ہندوؤں میں بھی مقبول تھی۔ سوئمبر رچانے کا رواج تھا۔ بننے والے دولہا نئے انداز، بھبن اور بانکپن کے ساتھ سوئمبر میں جمع ہوتے تھے اور اپنی طالع آزمائی کرتے تھے۔ دولہا کا انتخاب خود دلہن کیا کرتی تھی۔......"

(مکتوب بنام ڈاکٹر امام اعظم)

ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری (کٹک، اڈیشا) سہرے کی معنویت پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں :

''...... تہنیتی نظموں اور سہروں کی روایت زوال پذیر ہرگز نہیں ہے بلکہ پورے ملک کے مختلف علاقوں سے علاقائی خوشبو لے کر مجموعے اشاعت پذیر ہوتے رہتے ہیں۔'' (مکتوب بنام ڈاکٹر امام اعظم)

سہرا کہنے والوں میں کہنہ مشق و نومشق شعراء دونوں کے کلام دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ فنکارانہ مہارت جتنی ہوتی ہے جذبہ کا اظہار اور لفظوں کی نشست و برخاست اتنی ہی اچھی ہوتی ہے لیکن کبھی کبھی تک بندی بھی در آتی ہے۔ خیال کی یکسانیت بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ بحروں کا انتخاب بھی مخصوص ہوتا ہے۔ شاعر کے سامنے مجبوری یہ ہوتی ہے کہ سہرے میں ناموں کو باندھنا ذرا دشوار ہوتا ہے اس لئے شعری اظہار میں غنائیت اور ملاحت پیدا کرنے میں شاعر بہت حد تک کامیاب نہیں ہوتا، لیکن موجودہ روایت کا تقاضہ یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ ناموں کو مصرعوں میں باندھا جائے اور جس طرح کے نام ہیں اس طرح کی بحروں کا بھی انتخاب کیا جائے۔ سہرے کے لئے کوئی مخصوص بحر نہیں ہے اس کے لئے مخصوص فارم بھی نہیں ہے۔ جس کا جو جی چاہے جس انداز میں چاہے اپنے دل کے جذبات کا اظہار کر سکتا ہے۔ پابند سہرے عموماً زیادہ تعداد میں دیکھنے کو ملتے ہیں لیکن آزاد شاعری کے فارم میں اور نثری نظمیہ کیفیت کے فارم میں بھی سہرے دستیاب ہیں اور بہت سارے گلدستوں کی ترتیب میں شعراء کے حفظ مراتب کا خیال رکھا جاتا ہے۔ سہرے کی معنویت اور ادبی حیثیت کے متعلق بہت سے قلم کاروں نے قلم اٹھایا ہے۔ اسی نوع کے ۹ رمضامین ادبی جریدہ ''تمثیل نو'' دربھنگہ (شمارہ اکتوبر ۲۰۰۷ء - جون ۲۰۰۸ء) میں خصوصی مطالعہ کے تحت شامل کیے گئے تھے۔ یہ اپنی طرز کا پہلا قدم تھا کہ کسی ادبی رسالے میں اتنے سارے مضامین اس منفرد صنفِ سخن کے حوالے سے قلم بند کیے گئے۔ موضوع کی مناسبت سے ان مضامین میں سے چند اقتباسات ذیل میں پیش ہیں جن سے سہرے کی ادبی معنویت پر خصوصی روشنی پڑتی ہے۔

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی صنف سخن ''سہرا'' کے متعلق اپنے مضمون ''اردو میں سہرے کی معنویت'' میں اس طرح لکھتے ہیں :

''اخلاقی اقدار سے مالا مال صنفِ سخن 'سہرا' شخصیت کی عظمت کا اعتراف کراتا

ہے، جذبات صادق سے بہرہ مند کراتا ہے، شعور و عرفان اور بصیرت و ایمان کی روشنی سے تسخیر ذات کراتا ہے اور احوالاتی بنیادیں دریافت کراتا ہے۔......

''سہرا'' ایک حقیقت ہے جس میں دوئی کو مٹانے کا بکھان ہوتا ہے۔ خراجِ تحسین ہوتا ہے۔ وابستگی کے وسیلے کی آمادگی ہوتی ہے اور انفرادی سطح پر سیرت اور صورت کی تعریف ہوتی ہے۔ ساتھ ہی شاعرانہ خلوص کی اثر پذیری ہوتی ہے۔''

(کتاب ''سہرے کی ادبی معنویت'' مرتب: ڈاکٹر امام اعظم ص:۶۰-۶۱)

پروفیسر سیّد شاہ طلحہ رضوی برق سہرے کی تاریخی حیثیت کا ذکر اپنے مضمون ''سہرا نویسی'' میں اس طرح کرتے ہیں :

''عوام و خواص ہر دو طبقوں میں اسے یکساں مقبولیت حاصل ہوئی۔ سہرا بندی و سہرا خوانی کی رسم عام محافلِ شادی سے عروج پا کر لال قلعہ میں شہزادوں کی بزمِ شادی تک پہنچ گئی۔ درباری شعرا میں اسد اللہ خاں غالب اور بہادر شاہ ظفر کے استاد شیخ ابراہیم ذوق بھی سہرا پڑھتے نظر آنے لگے۔ شہزادہ جواں بخت کی شادی کے موقع پر غالب نے سہرا کہا اور پڑھا۔ مقطع میں بات سخن گسترانہ آ گئی۔ استاد ذوق نے سمجھا مجھے چیلنج کیا ہے۔ بس ۱۵ ر شعر کا سہرا ذوق نے بھی لکھ مارا۔''

(ایضاً ص:۶۹)

پروفیسر مجید بیدار مضمون ''شاعری میں سہرا اور اس کی عصری معنویت'' میں صنف سہرا کی فنی اور ادبی تعریف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں :

''فنی اعتبار سے سہرا ایک مدحیہ نظم ہے جو صاحب شخصیت کی تعریف و توصیف کیلئے ایسے موقع کا انتخاب کرتی ہے جبکہ شخصیت خود خوش حالی سے ہمکنار ہونے والی ہوتی ہے۔ عام زبان میں کسی مرد یا عورت کے رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کے موقع پر لکھی جانے والی شاعری جو دلی جذبات اور احساسات کی نمائندگی کا حق ادا کرے اسے 'سہرا' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے......'' (ایضاً ص:۹۱)

پروفیسر عبدالمنان طرزی اپنے مضمون ''سہرے کی ادبی معنویت'' میں صنف سہرا کی ہیئت اور ساخت پر روشنی ڈالتے ہیں :

''......ارتقائے ادب نے جہاں اور اصناف میں خوش گوار تبدیلی کو نمو بخشا ہے، سہرا بھی تہنیتی نظموں میں تبدیل ہوگیا ہے۔ مخمس اور مسدس کی شکلوں میں بھی نمو پذیر ہوا ہے۔ مضامین نو کا التزام ہوتا ہے۔ حکمت و اخلاق، فلسفۂ حیات، اسرارِ زندگی، پند و نصیحت کا بیان دلکش اور موثر انداز میں ہوتا ہے۔......'' (ایضاً ص:۸۶-۸۷)

پروفیسر شاکر خلیق نے اپنے مضمون ''سہرے کی عظمت و ادبی معنویت'' میں اس صنف کے ادبی تقاضوں کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''سہرا نویسی کا یہ سلسلہ دورِ متوسط سے ہوتا ہوا دورِ حاضر تک نظر آتا ہے۔ شعرائے کرام اس فن میں نت نئے تجربے کراتے ہوئے اس کے اندر دلکشی و توانائی اور شگفتگی و رعنائی کے جلوے بکھیر رہے ہیں۔ عام طور پر تہنیتی نظموں میں بندش کی چستی، بلندئ خیال، موزوں الفاظ کا برمحل استعمال، قافیے اور ردیف کی ہم آہنگی، اظہارِ خیال کی ندرت، شوخی، شگفتگی، برجستگی اور لطافت کا خیال رکھا جاتا ہے۔ کبھی کبھی اظہارِ خیال اور ابلاغ میں افرادِ خانہ کے ناموں کی مقبولیت کی وجہ سے جھول پیدا ہو جاتا ہے، جسے فنی عیب تصور کیا جاتا ہے۔'' (ایضاً ص:۸۳)

جناب احسان ثاقب نے سہرے میں مقامی کلچر کی نشاندہی کرتے ہوئے ایک مضمون ''سہرا بندھاتے بابو سوئے رباجی'' کے عنوان سے لکھا۔ اس میں انھوں نے صنفِ سہرا میں امکانات کی موجودگی کا اظہار یوں کیا ہے :

''......جہاں تجربہ ہوتا ہے، وہاں فن ہوتا ہے اور یہی فن زندگی کی علامت بن جاتا ہے چنانچہ اس شمار میں آگے بلکہ بہت آگے کی طرف جھانکا جائے تو ''سہرا'' اپنی افادیت اور معنویت میں گیت اور رخصتی سے بالا نظر آتا ہے۔ کل بھی ''سہرا'' کے موضوع پر کی جانے والی شاعری کے امکانات محدود نہیں تھے اور آج بھی زبان

کے اندر اس کے حوصلہ افزا امکانات موجود ہیں۔جس موضوع پر غالب نے،
ذوق نے، درد نے طبع آزمائی کی ہو اور آج تک بھی جس پر تمام شعرا نے قلم اٹھایا
ہو اور اٹھا رہے ہیں وہ موضوع مہمل اور معمولی نہیں ہوسکتا۔" (ایضاً ص:۱۰۹)

جناب **سیف رحمانی** سہرے کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس طرح اپنے
مضمون "سہرے کی معنویت اور فن کاری" میں کرتے ہیں:

"......سہرا قصیدے کی ہی ایک قسم ہے۔جس طرح قصیدے میں کوئی ممدوح
ہوتا ہے، جس کی صفت بیان کی جاتی ہے۔تشبیب میں رومانیت کے تذکرے
ہوتے ہیں۔آخر میں دعائیہ اشعار پہ اختتام ہوتا ہے۔'سہرا' میں بھی حمد و ثنائے
باری تعالیٰ کے بعد نوشہ کی سج دھج، بانکپن، پھولوں کی سجاوٹ، مالن کی تعریف
کے بعد نوشہ، دلہن اور ان کے خاندان والوں کو مبارکباد دی جاتی ہے اور دعائیہ
اشعار پہ سہرے کا اختتام ہوتا ہے۔" (ایضاً ص:۱۲۱)

جناب **مامون ایمن** اپنے مضمون "سہرے کے پھول" میں امان خاں دل کا شعری اسلوب"
میں شمالی امریکہ سے شائع ہونے والے سہروں کے پہلے مجموعہ کا تعارف یوں پیش کرتے ہیں:

"بلاشبہ "سہرے کے پھول" شمالی امریکہ سے شائع ہونے والا پہلا مجموعہ ہے
جو سہرے کی صنف کا پاس دار ہے۔(اس میں رخصتی، ولادت اور گریجویشن کے
موقع پر کہی گئی نظمیں بھی ہیں۔) امان اللہ خاں دل المعروف بہ امان خاں دل
مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے شعر گوئی کے ضمن میں ایک تہذیبی ورثہ سینے
سے لگا کر رکھا ہے بلکہ اسے یہاں قبولِ عام بنانے کی کامیاب کاوشات سے
اسے ایک خوبصورت روایت مان کر تحفظ بھی دیا ہے اور قیادت بھی۔......"

("تمثیل نو" شمارہ اکتوبر ۲۰۰۷ء - جون ۲۰۰۸ء ص:۷۸)

جناب **اسلم حنیف** نے اپنے مضمون "کچھ سہرا کے بارے میں" میں میر، سودا، نظیر اکبرآبادی،
انیس، دبیر، میرحسن، دیا شنکر نسیم جیسے اکابرین کے یہاں سہرا کے حوالے سے شعروں کا عمدہ جائزہ

لیا ہے۔ وہ مضمون کا خاتمہ کچھ اس طرح کرتے ہیں :

"مذکورہ سہرے اردو ادب کے وہ گراں مایہ تخلیقی نمونے ہیں جو سہرا گیتوں سے الگ اپنی ادبی حیثیت اور باقاعدہ صنفی وقار قائم کراتے ہیں اور یہ احسان مذکورہ بالا شخصیتوں کا ہی ہے کہ اردو شعرا نے اس طرف توجہ دی لیکن اس کی ادبی حیثیت کا تعین نہ ہونے کی بناء پر سہروں کو دواوین میں شامل نہ کیا گیا۔ آج بھی معروف اور بڑے شاعر سہرے، کہتے ہیں، جھلی دار کاغذوں پر یا کلنڈروں کی شکل میں یہ چھپتے بھی ہیں لیکن محفوظ نہیں رہتے۔"

(مشمولہ کتاب "سہرے کی ادبی معنویت" مرتب: ڈاکٹر امام اعظم ص:۱۰۷)

صنف سہرا کے حوالے سے "تمثیل نو" کے اس خصوصی گوشہ کی چہار جانب پذیرائی ہوئی۔ اکابرینِ ادب سے لے کر "تمثیل نو" کے دیگر قارئین تک کے درجنوں خطوط موصول ہوئے۔ ان میں سے چند اہم مکاتیب سے اقتباسات ذیل میں پیش کئے جارہے ہیں جن سے سہرے کی ادبی معنویت مزید آشکار ہوتی ہے۔ یہ آراء "تمثیلِ نو" (شمارہ جولائی ۲۰۰۸ء - مارچ ۲۰۰۹ء) کا حصہ ہیں۔

پروفیسر قمر رئیس کے مطابق :

"......سہرا اردو کی تہذیبی روایت کا ایک حصہ ہے، جو اَب معدوم ہوتا جارہا ہے۔ اکابرین اور معتبر شعرا نے سہرے لکھے ہیں جیسا کہ آپ نے دکھایا ہے۔......"

("تمثیل نو" جولائی ۲۰۰۸ء - مارچ ۲۰۰۹ء مکتوب ص:۱۹۹)

ڈاکٹر سیّد امین اشرف (علی گڑھ) رقم طراز ہیں :

"......میں نے پہلی بار کسی ادبی رسالے میں سہرے کی معنویت و ادبیت پر ایسے وقیع مضامین دیکھے ہیں۔ غالب اور ذوق کے بعد بھی بہت سے شاعروں کے اشعار آپ نے حوالے کے طور پر پیش کئے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی ادبی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔......"

(ایضاً ص:۲۰۰)

جناب سہیل غازی پوری (کراچی) کا خیال ہے :

''......اس شمارے میں سہرے کے حوالے سے جو مضامین اور اشعار شامل کئے گئے ہیں، واللہ آپ مبارک باد کے لائق ہیں کہ ایسی صنف جو معدوم ہو رہی ہے، اسے زندہ کرنے کی کوشش کی ہے اور آپ اس میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔''

(ایضاً ص:۲۰۲)

پروفیسر محمد محفوظ الحسن (گیا) سہرا نویسی کے سلسلے میں اس طرح اظہارِ خیال کرتے ہیں :

''......سہرا نگاری کی ابتدا کب، کس نے اور کیسے شروع کی؟ اس تحقیق میں گئے بغیر یہ تو بہر حال کہنا ہی پڑتا ہے کہ اس کی ادبی معنویت وافادیت کے ساتھ ساتھ اس کی سماجی معنویت وافادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ غالب اور ذوق کی سہرا نویسی کی تو بات ہی الگ ہے۔ آج بھی جو سہرے لکھے جا رہے ہیں، ان میں ممکن ہے، بہتوں میں ادبیت کی چاشنی نہ ملے، مگر مخلصانہ جذبات کی رنگینی تو ان میں سے جھانکتی ہی ہے، اور آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جن فن پاروں میں خلوص ہوگا، وہ اپنی سادہ بیانی کے باوجود اثر انگیز ہوگا۔......سہروں میں ایک جانب سنجیدگی، سادگی، صفائی، خلوص اور پاکیزہ جذبات کا اگر اظہار ہوتا ہے تو بعض سہرہ نویسوں نے مزاحیہ سہرے بھی لکھے ہیں، جن سے سہرے کی سماجی معنویت اجاگر ہوتی ہے۔......''

(ایضاً ص:۲۰۳)

پروفیسر محمد منصور عالم (گیا) سہرے کی بابت گویا ہیں :

''......اردو میں سہرا نگاری پر خصوصی مطالعہ پیش کر کے آپ نے ایک بڑی ضرورت کو پیش کیا ہے۔ یہ تو باضابطہ ایک تحقیق کا موضوع ہے۔ کیوں کہ ہم اس بات سے کم ہی واقف ہیں کہ اردو سہروں میں ہمارے شاعروں نے کیسے کیسے احساسات و جذبات پیش کیے ہیں۔ سہرا نگاری تو اردو شاعری کی ایک صنف رہی ہے لیکن اس کو عموماً غیر سنجیدگی سے لیا گیا ہے۔......'' (ایضاً ص:۲۰۴)

جناب مشتاق احمد نوری (پٹنہ) کی رائے ہے :

''......میرے خیال سے سہرے کو ایک صنفی درجہ عطا کرتے ہوئے اسے مستند بنانے کی سمت میں آپ کی یہ پہل یادر کھی جائے گی۔......'' (ایضاً ص:۲۰۴)

ڈاکٹر نسیم اختر (وارانسی) کے الفاظ میں :

''......برصغیر میں سہرے کی روایات کی جڑیں کافی مضبوط ہیں۔اس دل نواز صنفِ سخن کے تعلق سے تلاش وتحقیق کی اشد ضرورت ہے۔اللہ کا شکر ہے کہ آپ نے اس کی بسم اللہ کر دی ہے۔......'' (ایضاً ص:۲۰۹)

ڈاکٹر عبدالحق امام (گورکھپور) کا ماننا ہے :

''......آپ نے ایک نئی زمین تلاش کی ہے۔سہرا جیسی خفیف صنف کو اوپر اٹھانے کی کوشش کی ہے جو آج تک نظر انداز کی جاتی رہی ہے۔آپ نے اس کی ادبی حیثیت اور عصری معنویت کو اجاگر کرنے کی جو پیش قدمی کی ہے، وہ لائق صد تحسین ہے۔'' (ایضاً ص:۲۱۱)

غلام مصطفیٰ روحی کٹیہاری کی رائے کچھ اس طرح ہے :

''......صنف سہرا پر اس طرح بھرپور تبصرہ بلاشبہ آپ کی جدوجہد کا نتیجہ ہے اور اردو ادب کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔آنے والی نسلوں میں جب بھی صنفِ سہرا پر تذکرہ ہوگا،تو ''تمثیلِ نو'' کا یہ شمارہ یقیناً ثبوت کے طور پر پیش کیا جائے گا جس کا سہرا آپ کے سر جاتا ہے۔......'' (ایضاً ص:۲۱۳)

دربھنگہ ضلع کے موضع علی نگر میں سہرا خوانی، میلاد خوانی، مرثیہ خوانی، منظوم دعوت نامہ، رخصتی نامہ وغیرہ کا رواج خوب رہا ہے۔میرے والد (محمد ظفر المنان ظفر فاروقی مرحوم) کے چھوٹے ماموں مولوی منظور حسن کو فارسی اور اردو شاعری پر خاصا درک تھا۔انھوں نے سہرے بھی کافی کہے لیکن محفوظ نہیں رکھ سکے۔۱۷/اگست ۱۹۷۶ء کو اپنے منجھلے بیٹے غلام فرید عرف چھنتو کی شادی سے قبل سہرے کے صرف ۳ رمصرعے کہے تھے، جو راقم الحروف کے پاس موجود ہیں:

سر پر بندھے گا سہرا ، دولہا بنیں گے چھنتو
خوشیاں منائیں گے سب ، افسوس ہم نہ ہوں گے
شادی رچائیں گے سب ، افسوس ہم نہ ہوں گے

اس وقت ان کی عمر ۸۵؍سال تھی۔ اپریل ۱۹۷۷ء میں شادی ہوئی اور وہ اس میں شریک ہوئے۔

شادی کے موقع پر دیگر ادبی مراکز کی طرح 'بہار' میں بھی شعری گلدستے شائع ہوتے رہے ہیں اس کی تفصیل میں نہ جاتے ہوئے چند ناموں پر اکتفا کرتا ہوں جس سے سہرا نویسی کی سمت و رفتار کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ دسمبر ۱۹۴۵ء میں ڈاکٹر سیّد ولی اختر (ولد انجینئر سیّد احسان اختر ، مظفر پور) کی شادی پر ''گلدستہ تبریک''، اپریل ۱۹۵۸ء میں کلکتہ سے ممتاز شاعر اور دانشور جناب مظہر امام (سابق ڈائرکٹر دوردرشن) کی شادی پر ''شاخِ حنا''، مئی ۱۹۶۳ء میں عطاء الرحمٰن رضوی (دربھنگہ) کی شادی پر ''ریاضِ گلِ رعنا'' (مرتب: محبوب انور)، مارچ ۱۹۶۵ء میں ایم اے مظفر انجم ، برہولیا (ولد محمد ابونصر) کی شادی پر ''روحِ حنا'' (مرتب: مجاز نوری)، اپریل ۱۹۶۶ء میں غلام غوث (ولد ڈاکٹر عبدالحکیم مرحوم) کی شادی پر ''روحِ غازہ'' (مرتب: نورالاسلام نشتر)، اپریل ۱۹۶۸ء میں ''رنگِ حنا'' (مرتب: اظہر نیر)، اپریل ۱۹۷۴ء میں اظہر نیر (ولد محمد ابونصر) کی شادی پر ''برگِ حنا'' (مرتب: مجاز نوری)، اکتوبر ۱۹۷۶ء میں محمد سالم (ولد محمد ہاشم مرحوم، حاجی نگر، شمالی چوبیس پرگنہ) کی شادی پر ''بہارِ جاوداں'' (پیش کنندگان: عبدالوہاب محسنی و دیگر)، اکتوبر ۱۹۷۸ء میں غلام ربانی (ولد ڈاکٹر عبدالحکیم مرحوم) کی شادی پر ''النکاح من سنتی'' (مرتب: نورالاسلام نشتر)، مارچ ۱۹۸۲ء عقیل احمد ہاشمی (ولد مجاز نوری) کی شادی پر ''جشنِ حنا'' (مرتب: سہیل احمد ہاشمی)، ۱۹۸۵ء میں سہیل الدین ظفر، دربھنگہ (ولد محمد شعیب) کی شادی پر ''حنا رنگ'' (مرتب: عطاء الرحمٰن رضوی)، اپریل ۱۹۸۵ء میں محمد اسلم (آسنسول) کی شادی پر ''گلدستہ محبت'' (مرتب: حامد حسین)، فروری ۱۹۸۷ء میں جاوید اشرف کی شادی پر گلدستہ ''تحفہ ہائے رنگ و بو'' (مرتب: خورشید انور، مظفر پور)، جون ۱۹۸۷ء میں قیصر جمال ، بھاگلپور (اردو مترجم ولد ڈاکٹر

احمد جمال مرحوم) کی شادی پر ''گلہائے منور'' (مرتب: ارشد رضا)، دسمبر ۱۹۸۸ء میں ڈاکٹر امام اعظم (ولد ایم زیڈ ایم زیڈ فاروقی، سابق پولیس آفیسر، گنگوارہ، دربھنگہ) کی شادی پر ''آرزو کے گلاب'' (مرتب: پروفیسر ایم اے ضیا)، فروری ۱۹۸۹ء میں محمد ابو منظر نوشاد (ولد محمد ابوظفر) کی شادی پر ''نگارِ حنا'' (مرتب: اظہر نیر) اکتوبر ۱۹۸۹ء میں خورشید حیات ولد جناب ابوالحیات شیدا کی شادی پر ''نغمہ حیات'' (مرتب: احسان تابش)، اکتوبر ۱۹۹۰ء میں ڈاکٹر ایس احمد ناصح (ولد سیّد شاہ حکیم محمد تاج الدین احمد چشتی صابری القادری، شیام پور، علی نگر، دربھنگہ) کی شادی پر ''تجدید حیات'' (مرتب: ڈاکٹر امام اعظم)، اکتوبر ۱۹۹۰ء خورشید اقبال (جگتدل، شمالی چوبیس پرگنہ) کی شادی پر ''شاخِ حنا'' (مرتب: قیوم بدر)، مئی ۱۹۹۲ء محمد اشرف حسین عادل (ولد محمد اسرائیل، آسنسول) کی شادی پر ''گلہائے اشرف'' (مرتب: فیروز لبیب)، جون ۱۹۹۲ء میں خالد انور جیلانی (ولد: محمد ثوبان قادری، پوکھریرا، سیتامڑھی) کی شادی پر ''مہکتے پھول'' (مرتب: طارق عثمانی)، اپریل ۱۹۹۴ء میں محمد صدرالدین (گارولیا، شمالی چوبیس پرگنہ) کی شادی پر ''سہرے کے پھول'' (مرتب: افضال عاقل)، اکتوبر ۱۹۹۴ء میں محمد خورشید عالم (ولد محمد اسماعیل شاہ، آسنسول) کی شادی پر ''خوشبوؤں کا سفر'' (مرتب: محمد تاشفین شاہ)، اپریل ۱۹۹۵ء میں محمد ولی اللہ ولی (مہوا، ویشالی) کی شادی پر ''گلہائے رنگ رنگ'' (مرتب: احمد محفوظ)، مئی ۱۹۹۶ء میں عبدالحق امام (ولد جناب نظام الحق مرحوم، مرزاپور، گورکھپور) کی شادی پر ''گلہائے انبساط'' (مرتب: ڈاکٹر سلیم احمد)، اپریل ۱۹۹۷ء میں احمد کمال حشمی (ولد حشم الرمضان، کانکی نارہ، جنوبی چوبیس پرگنہ) کی شادی پر ''نوبہار'' (مرتب: انصاری)، اکتوبر ۱۹۹۷ء میں ڈاکٹر علی اسد وارثی (ولد ڈاکٹر ارمان نجمی، پٹنہ) کی شادی پر ''سعادت نامہ''، نومبر ۱۹۹۷ء میں محمد اطہر مسعود خاں (ولد محمد غوث خاں، مرحوم، رامپور، یوپی) کی شادی پر ''تنہائی چپ ہے'' (مرتب: انیس دہلوی)، مارچ ۱۹۹۹ء میں ارشد جمال حشمی (ولد حشم الرمضان، کانکی نارہ، جنوبی چوبیس پرگنہ) کی شادی پر ''آیاتِ گل'' (مرتب: احمد کمال حشمی)، فروری ۲۰۰۰ء میں سید عطا محی الدین (کٹک، اڑیسہ) کی صاحبزادی سیدہ رابعہ حبیب کی شادی پر ''برگِ حنا'' (پیشکش: آل اڑیسہ مدرسہ ٹیچرس ایسوسی ایشن، کٹک)،

مارچ ۲۰۰۰ء میں سید ظفرِ اسلام ہاشمی (ولد ایم زیڈ ایم زیڈ فاروقی، سابق پولیس آفیسر، گنگوارہ، دربھنگہ) کی شادی پر "نیا سفر (نخلِ نرگس)" (مرتب: ڈاکٹر امام اعظم)، اکتوبر ۲۰۰۰ء میں حسن مثنیٰ (ولد جناب منصور حسن، گنگوارہ، دربھنگہ) کی شادی پر "حیاتِ نو" (مرتب: حسن آرزو)، جنوری ۲۰۰۱ء میں سیّد حلیم آلِ احمد اعظم عرف شرفو (ولد ایم زیڈ ایم زیڈ فاروقی، سابق پولیس آفیسر، گنگوارہ، دربھنگہ) کی شادی پر "سہرا گل گیندا" (مرتب: ڈاکٹر امام اعظم)، مئی ۲۰۰۱ء میں ڈاکٹر اقبال جاوید (ولد ڈاکٹر جاوید نہال) کی شادی کے موقع پر "رنگِ حنا" (مرتب: مصطفیٰ اکبر)، مارچ ۲۰۰۲ء میں معصوم حسن انصاری (ادبی نام: افضال عاقل ولد محمد حدیث انصاری) کی شادی پر "رقصِ بہار" (مرتب: محمد صدر الدین)، اپریل ۲۰۰۲ء میں محمد شہاب الدین (ولد محمد محی الدین، دربھنگہ) کی شادی پر "وادیٔ شوق" (مرتب: ڈاکٹر امام اعظم)، مئی ۲۰۰۲ء میں انجینئر سرفراز اکرم (ولد عطاء الرحمٰن رضوی) کی شادی پر "حنازارِ شوق" (مرتب: ڈاکٹر امام اعظم)، جون ۲۰۰۳ء میں پروفیسر ضیاء الحق نظر کے صاحبزادہ ڈاکٹر حافظ رضوان الحق کی شادی پر "شاخسارِ حنا" (مرتب: عطاء الرحمٰن رضوی)، دسمبر ۲۰۰۳ء میں محمد ایوب راعین (ولد محمد مطیع الرحمان، دربھنگہ) کی شادی کے موقع پر "مجموعۂ تہنیات" (مرتب: ڈاکٹر عبدالودود قاسمی)، جنوری ۲۰۰۴ء میں عزیز احمد (ولد عین الہدیٰ مرحوم بتیا، مغربی چمپارن) کی شادی پر "گلہائے مسرت" (مرتب: نسیم احمد نسیم)، فروری ۲۰۰۴ء میں اعزاز اکبر (ولد اختر جاوید، ہوڑہ) کی شادی پر "ہم سفر" (مرتب: عنبر ریحان)، مارچ ۲۰۰۴ء میں سید محمد شہباز (ولد محمد نبیل الدین، پٹنہ) کی شادی پر "خوشبو پھولوں کی" (مرتب: راشد احمد)، اپریل ۲۰۰۴ء میں پٹنہ سے جناب ہاشم الموسیٰ و محترمہ نعیمہ (لندن) کے صاحبزادہ ڈاکٹر سیف الموسیٰ (ایم آر سی پی) کی شادی پر "خوشبو کا سفر" (مرتب: ڈاکٹر سید افروز اشرفی)، اپریل ۲۰۰۴ء میں محمد مظہر حسین کی شادی پر "پیراہنِ شگفتہ" (پیشکش: مختار احمد، دہلی و جاوید محمود، آسنسول)، مئی ۲۰۰۴ء میں حسنین علی (ولد فاروق اعظم انصاری، دربھنگہ) کی شادی پر "گل خنداں" (مرتب: عبدالودود قاسمی)، مئی ۲۰۰۴ء میں ڈاکٹر سجاد حیدر (ولد علاء الدین حیدر وارثی، دربھنگہ) کی شادی پر "برگِ حنا" (مرتب: عطاء الرحمٰن رضوی)، مئی ۲۰۰۴ء میں شہاب الدین احمد (ولد پروفیسر ناز قادری، مظفر پور)

کی شادی پر ''رنگِ حنا'' (مرتب: ارشد جمال)، جون ۲۰۰۴ء میں جاوید (ولد محمد اسرائیل، چھاتو بابو لین، کولکاتا) کی شادی پر ''جب جب پھول کھلے'' (مرتب: کلیم آذر، نسیم فائق)، نومبر ۲۰۰۴ء میں فیروز مرزا (ولد محمد معین الدین مرحوم، ہوڑہ) کی شادی پر ''شوخی رنگِ حنا'' (مرتبین: ڈاکٹر سلطان ساحر اور شوکت یزدانی)، اپریل ۲۰۰۵ء میں محمد عرفان شرف (ولد محمد غلام ربانی مرحوم، بہار شریف) کی شادی پر ''گلدستۂ شرف'' (مرتب: عمران راقم)، مئی ۲۰۰۵ء میں بلال عشرت (ولد ڈاکٹر عشرت بیتاب، آسنسول) کی شادی پر ''گلہائے محبت'' (مرتب: رب نواز عشرت و دیگر)، جون ۲۰۰۵ء میں محمد اقبال اعجازی (ولد محمد اعجاز احمد، دربھنگہ) کی شادی پر ''فصلِ حنا'' (مرتب: اظہر نیر)، جون ۲۰۰۶ء میں حسین اشرف اور حسن اشرف (ولد سلطان احمد، سابق ایم ایل اے، دربھنگہ) کی شادیوں پر ''حنا لالہ زار'' (مرتب: عبدالودود قاسمی)، جنوری ۲۰۰۷ء میں جناب خبیر الحسن کے صاحبزادہ مجاہد السلام کی شادی پر ''چمنِ خبیر'' (مرتب: حسن مثنیٰ)، اکتوبر ۲۰۰۷ء میں سید خرم شہاب الدین (ولد ایم زیڈ ایم زیڈ فاروقی، سابق پولیس آفیسر) کی شادی پر ''رنگِ گلہائے چمن'' (مرتب: امام اعظم)، اکتوبر ۲۰۰۷ء میں معراج اوگانوی کی شادی پر ''گلدستۂ دعائے تہنیت'' (مرتب: مسعود جامی، پٹنہ)، اپریل ۲۰۰۸ء میں محمد تعظیم (ولد محمد مطیع الرحمٰن) کی شادی پر ''رنگِ حنا'' اکتوبر ۲۰۰۸ء میں عمید معظم (ولد ڈاکٹر عبدالمنان طرزی، دربھنگہ) کی شادی پر ''کہکشاں'' (مرتب: ڈاکٹر امام اعظم)، نومبر ۲۰۰۸ء میں ڈاکٹر فراز فاطمی (ولد محمد علی اشرف فاطمی، مرکزی وزیر مملکت، حکومت ہند) کی شادی پر ''نغمات کی موجیں'' (مرتب: امام اعظم)، اپریل ۲۰۰۹ء میں ابوغضنفر دانش (ولد اظہر نیر، دربھنگہ) کی شادی پر ''عکسِ حنا'' (مرتبین: محمد راشد، سہیل پرویز)، مئی ۲۰۰۹ء میں تسلیم عارف ،کولکاتا (ولد محمد عارف مرحوم) کی شادی پر ''رشتوں کا تقدس'' (مرتبین: محمد اشرف و دیگر)، اپریل ۲۰۱۰ء میں وصی الرحمان (ولد شفیع الرحمان، دربھنگہ) کی شادی پر ''جشنِ مناکحت'' (فولڈر مرتب: نسیم احمد نسیم)، نومبر ۲۰۱۰ء میں محمد ناظم (ولد محمد مطیع الرحمان) کی شادی پر ''باغِ حنا'' (مرتب: ڈاکٹر محمد ایوب راعین)، اپریل ۲۰۱۱ء میں واجد قمر (ولد محمد قمر الدین، راجہ بازار، کولکاتا) کی شادی پر ''زمیں کا چاند'' (پیش کنندگان: محمد جاوید، ساجد قمر)، دسمبر ۲۰۱۱ء میں احمد امروز خاں (ولد ڈاکٹر

معظم علی خاں) کی شادی پر ''سہرا'' (مرتب :مشرف حسین محضر،علی گڑھ) ،مئی ۲۰۱۲ء میں احمد معراج (ولد عبداللہ خاں ، نارکل ڈانگہ،کولکاتا) کی شادی پر ''بوئے حنا''، اکتوبر۲۰۱۲ء میں قمر اعظم صدیقی (ولد شہاب الرحمٰن صدیقی ، بھیرو پور، ویشالی) کی شادی پر ''گلہائے تہنیت'' (مرتب: عارف حسن وسطوی)، اپریل ۲۰۱۴ء میں مظاہر حسن مظہر (ولد محمد انظار الحسن ، مہوا، حاجی پور) کی شادی پر ''سہروں کا گلدستہ'' (مرتب : عارف حسن وسطوی)، اگست ۲۰۱۴ء میں شاہنواز الرحمٰن (ولد تواب الرحمٰن ، مظفر پور) کی شادی پر ''سہروں کا گلدستہ'' (مرتب: قمر اعظم صدیقی)، مئی ۲۰۱۵ء میں فیصل کی شادی پر ''بہارِ شادمانی'' (مرتب: تسلیم عارف و دیگر) ، اکتوبر ۲۰۱۶ء میں ڈاکٹر محمد طٰہٰ ولد ڈاکٹر ایس زیڈ خان، کولکاتا کی شادی پر ''ترانۂ شادمانی'' (مرتب: مشتاق دربھنگوی)، فروری ۲۰۱۷ء میں منہاج القمر (ولد: احسان ثاقب ، آسنسول) کی شادی پر ''سہرے کی خوشبو'' (فولڈر، پیشکش: نواز پبلی کیشنز، آسنسول)، اپریل ۲۰۱۷ء میں محمد توحید احمد (ولد حافظ شمیم احمد، حاجی پور) کی شادی پر ''سہروں کا گلدستہ'' (مرتب: عارف حسن وسطوی)، دسمبر ۲۰۱۷ء میں شاہنواز (ولد ڈاکٹر سلمان راغب) کی شادی پر ''پیغامِ تہنیت'' (فولڈر مرتب: شاد عباسی)، مارچ ۲۰۱۸ء میں ڈاکٹر محمد ریحان رضا (ولد محمد اسحاق مرحوم، کولکاتا) کی شادی پر ''تحفۂ اظہارِ مسرت'' (پیش کنندگان: رضا برادران، دعوت ریسٹورینٹ، کولکاتا)، جون ۲۰۱۸ء میں ابوذر نازش (ولد: اظہر نیر) کی شادی پر ''رقصِ حنا'' (مرتبین: غضنفر دانش ،محمد ارشد، سہیل پرویز)، مارچ ۲۰۱۹ء میں محمد شکیب صائم (ولد فیض احمد شعلہ) کی شادی پر ''دعا کے پھول'' (پیشکش: محمد حسیب انصاری/محمد میزان) شائع ہوئے ہیں اور اہمیت کے حامل ہیں۔ان کے علاوہ سہرے اور تہنیتی نظمیں کتابچوں، رومالوں اور کیلنڈروں پر ہندو پاک کے علاوہ بھی دنیا کی مختلف اردو بستیوں میں تقریب نکاح کے موقع پر شائع ہوتے رہتے ہیں۔

مذکورہ بالا سہرے کے گلدستوں کے علاوہ چند شاعروں کے سہروں/نظم عروسی اور تہنیتی نظموں کے مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔محترمہ ثریا جمال مظہری نے اپنے والد جمیل مظہری کا مجموعہ بنام ''سہرے، نظم عروسی اور تہنیتی نظمیں'' صائمہ پبلی کیشنز، پٹنہ سے شائع کرایا۔ جناب امان

خاں دل کے سہروں کا مجموعہ ''سہرے کے پھول'' اکتوبر ۲۰۰۶ء میں شمالی امریکہ سے شائع ہوا۔ پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ کے سہروں اور رخصتیوں کا مجموعہ ''سہرے ہی سہرے'' ۲۰۰۸ء میں ڈاکٹر قدسیہ فاطمہ ضیاء نے ترتیب دیا۔ جناب ارشد مینانگری کا مجموعہ ''سہروں کے چہرے'' ۲۰۱۱ء میں مالیگاؤں، مہاراشٹر سے شائع ہوا۔ سرور نگینوی (دہلی) کے سہروں کا مجموعہ ''سہرے کے پھول'' ۲۰۱۳ء میں شائع ہوا۔

معروف شاعر اور سابق ڈائریکٹر، دوردرشن جمال الدین ساحلؔ (مقیم پھلواری شریف، پٹنہ) کے صاحبزادہ کی شادی پر ''گلدستہ'' شائع کرتے ہوئے ان کا یہ اعتراف کہ ''اگر وقت کی تنگی مانع نہ ہوتی تو اس سلسلہ کا ایک مجموعہ مرتب ہو جاتا'' سہرا نویسی کی معنویت کو اجاگر کرتا ہے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شعراء اپنے احباب، رشتہ داروں، رفیقوں اور متعلق لوگوں کی فرمائش پر سہرا لکھتے رہے ہیں جس سے ان کی قدر و منزلت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ جو جتنا بڑا فنکار ہوتا ہے اتنی خوبی سے وہ اپنی بات کہتا ہے، اپنے احساسات کو شعری پیکر عطا کرتا ہے، نئی لفظیات کو سامنے لاتا ہے اور ایک تازگی کا احساس دلاتا ہے۔ قارئین اور سامعین اس کے فن سے محظوظ ہوتے ہیں اور اس کی فنکارانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہیں اور اسے ادبی سرمائے میں اضافہ بھی تسلیم کرتے ہیں۔ بھرتی کے اشعار بھی سہروں میں ہوتے ہیں لیکن انہیں محض تک بندی اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ سلیقہ اظہار اس کو سنبھالے رکھتا ہے اور اہل فن یہ کہتے ہیں کہ مصرعوں کو باندھنا سلیقہ سے چاہیے وہ شاعری آمد کی ہو یا آورد کی۔ مظہر امام کی شادی کے موقع پر شائع تہنیتی نظموں کے مجموعہ ''شاخِ حنا'' کے حوالے سے **ارشد کاکوی** (کوملا، ڈھاکہ) نے ایک مکتوب مرقومہ یکم دسمبر ۱۹۵۸ء مظہر امام کے نام لکھا گیا تھا جس میں اس گلدستہ میں شامل بعض شعراء کے کلام کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ مکتوب راقم الحروف کی مرتبہ کتاب ''نصف ملاقات'' میں شامل ہے۔ اس سے چند جملے بطور اقتباس ملاحظہ ہوں:

''......اس لئے کہ 'شادی' وہ موضوع ہے جس پر مجھے قلم فرسائی کا حق نہیں، لیکن دوستوں کی مسرت کو چوں کہ اپنی مسرت سے کم نہیں سمجھتا، اس لئے آپ کے

سہرے میں دو چار پھول ٹانکنے کو برابر بے قرار رہا اور اس کی احتیاط رہی ہے کہ
ان برگ ہائے گل پر میرے آنسو نہ چھلک پڑیں۔......فلسفہ و شعر، دعا و تہنیت،
خلوص و محبت سبھی کچھ اس میں ہے اور سب کچھ اس قدر Controlled ہے کہ
بس۔......"

سہرے کی روایت سے اردو ادب مالا مال ہے۔ اس دعوے کی دلیل کے طور پر بلا خوف تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اگر سہروں اور تہنیتی نظموں کی ادبی حیثیت اور معنویت نہ ہوتی تو غالبؔ اور ذوقؔ نے اپنے دواوین میں سہرے شامل نہ کئے ہوتے اور اس کے بعد بھی علامہ رضا علی وحشت کے دیوان "ترانۂ وحشت"، بابو سنت لال عنبر کا "کلیاتِ عنبر" (۱۹۱۴ء)، دوبارہ اشاعت مشمولہ "نیا دور" فراق نمبر حصہ دوم (مئی- جولائی ۱۹۸۴ء)، جمیل مظہری کے مجموعہ "نقشِ جمیل" (۱۹۵۳ء)، اجتبیٰ رضوی کے مجموعہ "شعلۂ نَدا" (۱۹۵۴ء)، پرویز شاہدی کے مجموعہ "رقصِ حیات" (۱۹۵۷ء)، محسن دربھنگوی کے مجموعہ "تلخ و شیریں" (۱۹۵۹ء)، طاہر علی شاکر کلکتوی کے مجموعہ "پری خانۂ الفت" (۱۹۵۹ء)، مظہر امام کے مجموعہ "زخم تمنا" (۱۹۶۲ء)، مولانا اقبال احمد خاں سہیل کا "کلیاتِ سہیل" (مرتبہ: عارف رفیع، اشاعت: ۱۹۸۸ء)، منظر شہاب کے مجموعہ "پیراہن جاں" (۱۹۸۹ء)، پروفیسر خالد محمود کا مجموعہ "شعر چراغ" (۲۰۰۱ء)، بدیع الزماں سحر کے مجموعہ "عکسِ سحر" (۲۰۰۲ء)، افتخار اجمل شاہین (کراچی) کے شعری مجموعہ "رنگ و بو کا سفر" (۲۰۰۶ء)، ڈاکٹر وقار صدیقی کے مجموعہ "عکسِ ہستی" (۲۰۰۷ء)، قاری محمد داؤد طالب کے مجموعہ "کلیاتِ طالب دربھنگوی" (مرتب: ڈاکٹر منصور عمر ۲۰۰۷ء)، محمد مطہرین انجم فرخ آبادی کے مجموعہ کلام "وادیٔ احساس"، "منظومات آسی" (مولانا عبدالعلیم آسی کا تعارف اور نظموں و غزلوں کی کلیات مرتب: حسن امام درد، ۲۰۰۸ء)، ڈاکٹر منصور عمر کے مجموعہ قطعاتِ تاریخ "باغِ خوش اسلوب" (مرتب: ڈاکٹر عبدالمعبود ۲۰۰۸ء)، سیّد احمد شمیم کے شعری مجموعہ "ڈوبتی شام" (۲۰۰۹ء)، ڈاکٹر ولی اللہ ولیؔ کے شعری مجموعہ "آرزوئے صبح" (۲۰۱۳ء)، ڈاکٹر نتھنی لال وحشی مظہری کے شعری مجموعہ "بیاضِ وحشی مظہری" (۲۰۱۵ء مرتبین: جہانگیر رضا کاظمی، ڈاکٹر حسن شکیل مظہر، حسین

خورشید مظہری، پروفیسر افضل حسین جعفری)، فطین اشرف صدیقی (عمان) کا شعری مجموعہ ''نسخہ ہائے دردِ دل'' (اشاعت: ۲۰۱۵ء)، محمد افضل خان کی مرتبہ کتاب ''ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی: شاعروں کی دوربین نگاہ میں (۲۰۱۶ء)، ڈاکٹر عطا عابدی کے مجموعہ ''دریچے سے'' (۲۰۱۶ء) پروفیسر کلیم عاجز کا ''کلیاتِ عاجز'' (۲۰۱۷ء مرتب: فاروق ارگلی)، سلطان شمسی کے شعری مجموعہ ''ریت کا سفر'' (۲۰۱۷ء)'' محمد فاروق اعظم انصاری کے شعری مجموعہ ''صدائے اعظم'' (مرتب: ڈاکٹر عبدالودود قاسمی، ۲۰۱۸ء)، ڈاکٹر عشرت بیتاب کی مرتبہ کتاب ''محبّ الرحمان کوثر (تخلیقی سفر ایک جائزہ)''، شگوفہ تمنا کی مرتبہ کتاب ''کرنیں بیتاب کی'' وغیرہ میں ہمیں یہ سہرے نظر نہیں آتے نیز حسن امام درد کی مرتبہ کتاب ''منثوراتِ آسی'' (مولانا عبدالعلیم آسی کے نثری مضامین کا انتخاب ۲۰۰۷ء) میں بھی ''طلوعِ خورشید'' کے عنوان سے منثور سہرا شامل ہے۔ آج جب کہ مختلف نت نئی اصنافِ سخن پر طبع آزمائی ہو رہی ہے اور بحث بھی جاری ہے، سہرے جیسی قدیم صنفِ سخن پر بحث افادیت سے خالی نہ ہوگی۔

سہروں کے گلدستے عام طور پر شادیوں کے موقع پر لکھے جاتے ہیں اور مرتب کئے جاتے ہیں لیکن ان میں ادبی عناصر کی کمی نہیں ہوتی۔ جذبات کا بہاؤ مصرعوں کو مربوط کر دیتا ہے، دلکشی و ملاحت اور لفظوں کی جادوگری ایک سماں باندھ دیتی ہے اور اصل شاعر اس میں بھی نئی راہیں نکال لیتا ہے، نئے انداز بھی پیدا کرتا ہے۔ گرچہ یہ دشوار کام ہے لیکن فنکار بہر حال صناع ہوتا ہے۔ محض پرانے اور روایتی اثاثے سے کام نہیں لیتا بلکہ اس میں نیا پن پیدا کرتا ہے جس سے قاری یقیناً لطف اندوز ہوتا ہے۔

سہرے میں مسرت، خوشبو، پھول، دعائیں، جذبے، خوشیاں وغیرہ موضوعات ہوتے ہیں۔ اس میں بھی جذبات کے زیر و بم دیکھے جا سکتے ہیں۔ غنائیت کے ساتھ شعریت بھی بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے اور تازگی، توانائی، دلکشی اور شگفتگی کے گل بوٹے بھی ملتے ہیں۔ سہرا لکھنا کوئی نئی روایت نہیں ہے لیکن بڑی بات یہ ہے کہ خوشی کے اظہار کا مہذب سلیقہ سہرے کے ذریعہ ممکن ہے۔ یہ باادب طریقہ ہے اور تہذیب یافتہ قوم کی جاگیر ہے۔ اس لئے سہرے کی روایت کو نظر انداز کرنا

اور خوشی کے اظہار کا کوئی الگ طریقہ اختیار کرنا دونوں میں تہذیبی تضاد ہے۔ غالبِ ثانی رضا علی وحشت کلکتوی کے یہ اشعار دیکھیں جن میں اردو تہذیب کی دیرینہ روایات کا نمونہ ملتا ہے:

کیوں نہ دل خوش ہو کہ ہے مژدۂ راحت سہرا یہ مسلم ہے کہ ہے باعثِ عشرت سہرا
آج نوشاہ بنا ہے جو ذکاء الرحمٰن دلِ آصف کو ہے پیغامِ مسرت سہرا
وجہِ تحریک ہوا ہے دلِ آصف کا خلوص آج وحشتؔ نے لکھا ہے پسِ مدت سہرا

ہندوستان میں تہنیتی نظموں کی روایت بہت قدیم ہے۔ شادی کے موقع پر بھانڈ مجلس میں آ کر طویل نظم سنایا کرتے تھے جس میں طرفین کے خاندانی حالات، سماجی حیثیت اور افرادِ خاندان کے تذکرہ کے ساتھ ساتھ مبارک باد اور دعائیہ جملے بھی ہوتے تھے۔ اسی روایت کے پیشِ نظر شعرائے کرام صدیوں سے اس صنفِ سخن میں حسبِ ضرورت طبع آزمائی کرتے آ رہے ہیں۔

المختصر! سہرا شعبۂ زندگی کے ایک اہم موقع کی ترجمانی کا ذریعہ رہا ہے، اس لئے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور اگر اس پر کام نہیں ہوا ہے تو اس سلسلے میں باضابطہ کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ہر عہد میں سہرے کے انداز، ہیئت اور مواد میں تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک زندہ ذریعۂ اظہار ہے اور اس میں امکانات کی کمی نہیں۔ اس طرح یہ صنف سمندر کی لہروں کی طرح افتاں و خیزاں فرد کے ذہن کو آسودگی بخشتی رہی ہے اور ساتھ ہی شناخت اور پہچان کے لیے دیدۂ بینا بنتی رہی ہے۔

❖❖❖

پیش خدمت ہے کتب خانہ گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے 👇
https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
📱0307-2128068
@Stranger ❤️❤️❤️❤️❤️❤️❤️

فورٹ ولیم کالج کے اہم مصنّفین اور ان کی خدمات

اگر انصاف کو راہ دی جائے اور کسی طرح کے تعصب اور تنگ نظری کو شعار نہ بنائیں تو یہ کہنا ہوگا کہ جدید اردو نثر کی ابتداء اور اس کا فروغ فورٹ ولیم کالج کا رہینِ منت ہے۔ عہد مغلیہ میں سرکاری زبان کا درجہ فارسی کو حاصل تھا اور دفاتر میں وہی زبان رائج تھی۔ ریختہ نے فارسی کے متوازی اپنا اثر بڑھایا تھا لیکن بہر حال اس کی حیثیت ثانوی تھی اور اہل ادب فارسی میں دستگاہ پیدا کرنے کو قابل فخر بات سمجھتے تھے۔ عوام میں اردو بولی اور سمجھی جاتی تھی، مقبول بھی تھی لیکن خود اس کے اسالیب پر فارسی کا اثر تھا۔ عبارتیں مقفّٰی و مسجّع لکھی جاتی تھیں۔ طرز ادا میں غیر ضروری تکلّفات کی بھرمار رہتی تھی۔ اہل زبان وفن نثر سے زیادہ شاعری کو بنائے فخر مانتے تھے یہاں تک کہ خط، نوید اور عام ضرورتوں کی ترسیل میں بھی شعر کو نثر پر فوقیت دیتے تھے۔

انگریزوں نے جب کاروبار حکومت سنبھالا تو عوام سے رابطہ استوار کرنے کے لئے انہیں کسی وسیلے کی ضرورت تھی۔ وہ فارسی سے بھی یہ کام لے سکتے تھے لیکن سیاسی نفسیات مانع تھی اس لئے اُنھوں نے اردو کو فارسی پر ترجیح دی اور سادہ سلیس اور جدید و رواں اردو نثر کی ترویج و اشاعت کو حاکم اور رعایا کے درمیان رابطۂ ترسیل بنایا۔ اس کام کے لئے انہوں نے ۱۰ر جولائی ۱۸۰۰ء کو فورٹ ولیم کالج قائم کیا جہاں ترجمے اور سادہ و عام فہم اردو نثری ادب کے فروغ کا اہتمام کیا۔ یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل لارڈ ویلز لی کی دور بینی اور موقع شناسی کی بہترین مثال تھی۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سیّد عبداللطیف لکھتے ہیں :

> ”ایسٹ انڈیا کمپنی نے فورٹ ولیم کالج کو بالکل افادی بنیاد پر قائم کیا تھا۔ نظمائے کمپنی کا منشا کلکتہ میں چند اربابِ قلم کو یکجا کرکے ان سے اپنے انگریز اہل کاروں اور عہدہ داروں کیلئے ایسی سلیس درسی کتابیں لکھوانا تھا جن کا طرز بیان شاعرانہ

نزاکتوں اور لفظی موشگافیوں کی بجائے سیدھا سادہ اور عام فہم ہو۔ اس کالج کے
تقریباً تمام مصنفوں کو اس بات کا بہت کم موقع دیا گیا کہ وہ قلم کی سحر کاریوں سے
اپنے ذاتی جذبات و خیالات کی ترجمانی کرتے۔ کالج کے اربابِ اقتدار کو ضروری
نصابی کتب کی تیاری میں عجلت تھی۔ اس لئے ان مصنفوں سے بجائے مستقل
کتابیں تصنیف کرانے کے مشہور متبادل اور بالخصوص فارسی کی عام پسند کتابوں
کے ترجمے کرائے گئے۔" (پیش لفظ "اربابِ نثر اردو")

ڈاکٹر جان گل کرسٹ اوائل انیسویں صدی میں فورٹ ولیم کالج کے پرنسپل تھے۔ نہایت بیدار مغز آدمی تھے۔ ان کی انتھک کاوشوں سے ہی اردو نثر کو وہ فروغ ملا کہ سرکاری زبان بننے کا مرتبہ حاصل کر سکی۔ انہوں نے خود یہ زبان سیکھی اور ہندوستانی طرزِ معاشرت میں رچ بس گئے۔ خود انہوں نے اردو زبان میں کئی کتابیں لکھیں اور جب اپنے وطن ایڈمبرا (برطانیہ) واپس ہوئے تو وہاں ادارہ شرقیہ (Oriental Institute) میں اردو کے پروفیسر رہے۔ ان کی تصنیفات کی فہرست ڈاکٹر گریرسن نے اپنی کتاب "لنگوسٹک سروے آف انڈیا" میں دی ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

"جو احسان ولی نے اردو شاعری پر کیا تھا، وہی احسان گلکرسٹ نے اردو نثر پر کیا ہے۔"

(بحوالہ "مغربی بنگال کا شعری و نثری ادب" مرتبین: شاہد ساز/محمد امتیاز احمد ص: ۳۲۳)

گل کرسٹ ہی کے انتظام اور ماتحتی میں ایک جماعت ہندوستانیوں کے کالج میں قائم ہوئی پھر دلی لکھنؤ رام پور لاہور سے مشہور اہل ادب کھنچ کھنچ کر کلکتہ آنے لگے۔ سبب اس کا کچھ تو تلاش معاش تھا اور کچھ ان علاقوں کی سیاسی و اقتصادی تباہی تھی۔ بہر حال فورٹ ولیم کالج میں اردو دانوں کا ایک بڑا حلقہ قائم ہو گیا جس نے تصنیف، تالیف اور تراجم کے کام بڑے پیمانے پر کئے۔ ان میں سے چند اہم ناموں کے بارے میں بعض معلومات ہم دے رہے ہیں تا کہ ان کی خدمات کا مختصراً ہی سہی اندازہ ہو سکے:

میر امن دہلوی: آپ دہلی کی طوائف الملوکی کے دور میں پٹنہ ہوتے ہوئے کلکتہ آئے۔ میر بہادر علی حسینی کے توسط سے جان گل کرسٹ سے ملے اور ان کی فرمائش پر فارسی قصہ چہار درویش کو سلیس زبان میں ''باغ و بہار'' کے نام سے پیش کیا۔ یہ کتاب اپنی سادگی اور سلاست کی بناء پر انگریزوں اور ہندوستانیوں میں مقبول ہوئی۔ اس کتاب کی زبان سادہ لیکن پرتاثیر ہے۔اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ دنیا کی مختلف زبانوں بشمول انگریزی اور فرانسیسی میں اس کے ترجمے ہوئے اور اس کے کئی ایڈیشن کلکتہ، مدراس، لکھنؤ اور لندن سے شائع ہوئے۔اس کے علاوہ ''گنجِ خوبی'' کے نام سے بھی ایک کتاب ملتی ہے۔ان کے انتقال کے متعلق کوئی واضح دستاویز موجود نہیں۔ پروفیسر عبدالمنان (سابق صدر، شعبۂ اردو، کلکتہ یونیورسٹی) نے ''میر امن دہلوی کی نثری خدمات'' کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔ یہ مقالہ ۱۹۹۴ء میں کولکاتا سے شائع ہوا۔

میر بہادر علی حسینی: آپ کے والد کا نام سیّد عبداللہ کاظم تھا۔ بیشتر حالاتِ زندگی پردۂ خفا میں ہیں۔ ۴ر مئی ۱۸۰۱ء کو ان کا تقرر فورٹ ولیم کالج میں بحیثیت میر منشی ہوا۔آپ نے ''اخلاق ہندی'' کے نام سے سنسکرت کتاب ''ہتوا پدیش'' کا صاف اور سلیس اردو ترجمہ کیا۔اس کے علاوہ میر حسن کی مشہور مثنوی ''سحر البیان'' کو شستہ و رفتہ بے تکلف اردو میں ''نثر بے نظیر مثنوی: میر حسن کا قصہ'' کے نام سے لکھا نیز گل کرسٹ گرامر کا خلاصہ ''رسالہ گل کرسٹ'' کے نام سے لکھا جو مفید عام ترویج نثر اردو کا ایک اہم قدم مانا جاتا ہے۔صوبہ آسام کی تاریخ کے حوالے سے ایک ولی احمد شہاب الدین طالش کی فارسی کتاب کا ترجمہ آپ نے ''تاریخِ آسام'' کے نام سے کیا، مگر بعض وجوہ یہ کتاب شائع نہیں کی ہوئی۔

میر شیر علی افسوس: آپ ۱۷۳۵ء میں دلی میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد علی مظفر خاں کے ساتھ کچھ عرصہ لکھنؤ میں قیام کیا اور ایک نواب کے گھر بچوں کے اتالیق مقرر ہوئے۔لکھنؤ میں آپ کو بڑے شعراء کی صحبت حاصل ہوئی۔ لکھنؤ کے معاشی بحران کے بعد طویل عرصہ پٹنہ میں مقیم رہے جہاں آپ کے والد پہلے میر جعفر اور پھر میر قاسم کے توپ خانہ میں داروغہ کی ذمہ داری نبھا رہے تھے۔

افسوسؔ ۶۴ ربرس کی عمر میں کلکتہ آئے اور فورٹ ولیم کالج میں میر منشی کے ممتاز عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۸۰۹ء میں آپ کا انتقال ہوا۔ آپ کی اہم کتابوں میں اردو ترجمہ گلستانِ سعدی موسوم بہ ''باغِ اردو'' نہایت سلیس اور عام فہم اردو میں لکھی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ''آرائشِ محفل'' کے نام سے ہندوستان کے جغرافیائی حالات و مختصر تاریخ پر کتاب لکھی۔ آپ کے کلام کا مجموعہ ''دیوانِ افسوس'' غیر مطبوعہ صورت میں موجود ہے، لیکن ''کلیاتِ افسوس'' (مرتبہ: سیّد ظہیر احسن) ادارۂ تحقیقاتِ اردو، پٹنہ سے ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی۔

سید حیدر بخش حیدری: آپ سید ابوالحسن کے فرزند تھے اور دہلی میں آپ کی ولادت ۱۷۶۰ء میں ہوئی۔ یہاں سیاسی شورشوں کے سبب آپ کے والد بنارس چلے آئے اور نواب علی ابراہیم خاں خلیل کے ہاں ملازم ہو گئے۔ جب آپ کو علم ہوا کہ کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج میں ملازمت کے کئی مواقع دستیاب ہیں تو آپ کلکتہ تشریف لائے اور فورٹ ولیم کالج میں منشی کے عہدے پر مامور ہوئے۔ یہاں انھوں نے زیادہ تر ترجمے کا کام کیا اور تقریباً دس کتابیں لکھیں جن میں ''قصہ مہر و ماہ''، ''قصہ لیلیٰ مجنوں'' (فارسی سے ترجمہ)، ''طوطا کہانی'' (غالباً طوطی نامے کا فارسی سے سلیس اردو میں ترجمہ)، ''آرائشِ محفل'' (قصہ حاتم طائی کا نہایت سلیس اردو میں ترجمہ)، ''تاریخ نادری'' (ترجمہ نادر نامہ از منشی مرزا مہدی)، ''ہفت پیکر''، ''گلِ مغفرت'' (ترجمہ روضۃ الشہداء ملا واعظ کاشفی)، ''گلزارِ دانش'' (ترجمہ بہار دانش از شیخ عنایت اللہ)، ''گلشن ہند'' وغیرہ شامل ہیں۔

مرزا کاظم علی جوان: دلی کے باشندے تھے۔ دلّی کی تباہی کے بعد پہلے فیض آباد اور پھر لکھنؤ گئے اور جلد ہی اپنے فن کی بدولت وہاں کے اہم شعراء میں شمار کئے جانے لگے۔ وہاں کچھ عرصہ گزارنے کے بعد جنوری ۱۸۰۱ء میں کلکتہ چلے آئے۔ فورٹ ولیم کالج میں کافی عرصہ تک منشی کی خدمات انجام دیں۔ شیر علی افسوس کے انتقال ۱۸۰۹ء کے بعد جب تارنی چرن مترا میر منشی مقرر ہوئے تو آپ کو ان کا نائب یعنی سکنڈ منشی بنایا گیا۔ آپ اردو کے علاوہ عربی، فارسی اور برج بھاشا پر بھی عبور رکھتے تھے۔ آپ نے کالی داس کے ناٹک ''شکنتلا'' کا اردو ترجمہ، قرآن کریم کا ترجمہ (نامکمل)، فارسی ''تاریخ فرشتہ'' جو سلاطین بہمنی کی تاریخ سے متعلق ہے کا سلیس اردو ترجمہ ہے۔

علاوہ ازیں ''سنگھاسن بتیسی'' اور ''بارہ ماسہ'' کا للولال جی کوی کے ساتھ مل کر سنسکرت سے اردو ترجمہ کیا۔ آپ بھی شاعری سے شغف رکھتے تھے تاہم کوئی دیوان مرتب نہیں کیا۔

نہال چند لاہوری: آپ کے اجداد دہلی کے رہنے والے تھے، بعد میں لاہور چلے گئے تاہم فورٹ ولیم کالج میں منشیوں کی تقرری کے وقت نہال چند لاہور سے کلکتہ آ گئے۔ آپ کالج کے باقاعدہ منشیوں میں نہیں تھے لیکن کالج کے لیے تصنیف و تالیف کا کام آپ نے گل کرسٹ کی ایما پر کیا۔ یہاں انھوں نے ''مذہب عشق'' کے نام سے ''گل بکاؤلی'' (فارسی قصہ از شیخ عزت اللہ بنگالی) کا سلیس اردو نثر میں ترجمہ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی مقبولیت کو دیکھ کر دیا شنکر نسیم نے ''گلزارِ نسیم'' کے نام سے اس نظم کو جامہ پہنایا۔

مظہر علی خاں ولا: آپ نے ممنون، مرزا جان طپش اور غلام ہمدانی مصحفی سے مشورۂ سخن کیا۔ فورٹ ولیم کالج سے وابستگی کے بعد آپ نے فارسی کتاب ''پند نامہ'' (از: سعدی) کا اردو ترجمہ، ناصر علی خان بلگرامی کی 'ہفت گلشن'' کا اردو ترجمہ، ''قصہ مادھونل کام کنڈلا'' کا ترجمہ، موتی رام کشر کی تصنیف کا بھاشا سے اردو میں ترجمہ، صورت کشر کی بے تال پچیسی کا اردو ترجمہ للولال جی کوی کے ساتھ مل کر کیا۔ فارسی کتابوں ''تاریخ شیر شاہی'' اور ''تاریخ جہانگیر شاہی'' کا اردو میں ترجمہ کیا۔ ولا ایک کامیاب اور زود گو شاعر بھی تھے۔ آپ نے غزلوں، رباعیوں، قطعوں، مثنویوں اور قصیدوں سب پر طبع آزمائی کی۔ آپ کی غزلوں کا دیوان بھی ملتا ہے۔ عبدالستار شاہدی (سابق صدر، شعبۂ اردو، مولانا آزاد کالج، کلکتہ) نے پروفیسر حافظ طاہر علی کی نگرانی میں وشو بھارتی یونیورسٹی، شانتی نکیتن سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی جو ہنوز شرمندۂ اشاعت نہیں ہو سکی۔

مرزا علی لطف: آپ کالج کے باضابطہ منشیوں میں نہیں تھے۔ آپ کے اجداد ایران سے ہجرت کر کے دہلی تشریف لائے اور وہاں کی تباہی کے بعد براہِ عظیم آباد صوبہ بنگال کی راجدھانی مرشد آباد تشریف لائے۔ مرشد آباد کلکتہ سے قریب تھا۔ فورٹ ولیم کالج کا شہرہ سن کر لطف نے بھی کلکتہ کا رخ کیا۔ یہاں گل کرسٹ نے ان سے اردو کا مشہور تذکرہ ''گلشنِ ہند'' لکھوایا جس کی بنا پر آپ تاریخِ ادب اردو میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ واضح رہے کہ ''گلشنِ ہند'' اردو شاعروں کا اردو میں

لکھا ہوا پہلا تذکرہ ہے۔

للولال جی: آپ ہندی زبان کے مشہور عالم اور کوی تھے۔ ان کے والد کا نام چین سکھ تھا۔ فورٹ ولیم کالج میں آپ نے راست کسی کتاب کا اردو میں ترجمہ نہیں کیا بلکہ اردو مترجمین کو سنسکرت اور ہندی کی اہم کتابوں کے ترجمے میں بڑا تعاون کیا۔ آپ نے جن کتابوں کو سنسکرت سے ہندی میں ترجمہ کیا ان میں ''بیتال پچیسی''، ''قصہ مادھونل''، ''لطائف ہندی'' اور ''برج بھاشا کے قواعد'' وغیرہ اہم ہیں۔ آپ بڑے فعال اور باصلاحیت قلمکار تھے اور کالج کے پرنسپل ولیم ٹیلر نے ان کی بڑی تعریف کی ہے۔

ان منشیوں کے علاوہ خلیل علی خاں اشک نے ''قصہ امیر حمزہ''، ''قصہ رضوان شاہ''، ''انتخاب سلطانیہ اردو'' اور ''اکبر نامہ''، عبداللہ مسکین نے ''مرثیہ ہائے مسکین''، مرزا محمد فطرت نے ''عہد نامہ جدید''، محی الدین فیض نے ''چشمہ فیض''، سیّد حمید الدین بہاری نے ''خوان الوان''، شیخ حفیظ الدین نے ''خرد افروز''، ابوالفضل کی ''عیارِ دانش'' کا اردو ترجمہ، مولوی اکرام علی نے ''اخوان الصفا'' کا اردو ترجمہ، بنی نرائن جہاں نے ''دیوانِ جہاں مع تذکرۂ شعرائے ہندوستانی چار گلشن'' اور ''تنبیہ الغافلین'' از شاہ رفیع الدین کا اردو ترجمہ، اور مولوی امانت اللہ نے ''ہدایت الاسلام'' (عربی)، ''ہدایت اسلام'' (اردو)، ''اخلاقِ جلالی'' کا اردو میں ترجمہ کیا۔

فورٹ ولیم کالج کی بدولت تصنیف و تالیف کے ساتھ ساتھ ترجمے کی اہمیت بھی واضح ہوئی۔ منظم طور پر ترجموں کی مساعی سے اردو نثر میں ترجموں کی روایت کا آغاز ہوا اور انیسویں اور بیسویں صدی میں اردو نثر میں ترجمہ کرنے کی جتنی تحریکیں شروع ہوئیں ان کے پس پردہ فورٹ ولیم کالج کا اثر کارفرما رہا ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے منشیوں نے اردو نثر کے حوالے سے جو جلیل القدر کام انجام دیا ہے، اس کی اہمیت اردو زبان و ادب کی تاریخ میں ہمیشہ رہے گی۔ اس تعلق سے شانتی رنجن بھٹاچاریہ اپنے مقالہ ''بنگال میں اردو کا نثری ادب: ابتدا سے انیسویں صدی کے اختتام تک'' میں لکھتے ہیں:

''صحیح معنوں میں ادبی نثر کی باضابطہ تحریک فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے شروع

ہوئی اور بول چال کی زبان سے قریبی تعلق رکھتے ہوئے صفائی اور سلاست کے
لحاظ سے ادبی نثر کی پہلی اینٹ اسی کالج میں رکھی گئی لیکن یہ حقیقت دلچسپی سے
خالی نہیں کہ جان گلکرسٹ یا دیگر ''حاکمانِ عالیشان'' کی فرمائش پر جس نثری
ادب کی تخلیق فورٹ ولیم کالج میں کی گئی ان کے بیشتر فنکار بنگال کے باشندے
نہیں تھے بلکہ وہ دیگر صوبوں سے روزگار کے سلسلے میں کلکتہ آئے تھے اور حالانکہ
وہ سب ہی شاعر تھے لیکن پیٹ کی خاطر اُن لوگوں نے کلکتہ میں مجبوراً حاکموں کی
فرمائش کے مطابق عام فہم زبان میں نثری ادب کی تخلیق کی اور جن تخلیقات میں
سے تقریباً تمام ہی عربی، فارسی اور سنسکرت ادب سے ترجمہ یا اُن زبانوں کی
تصانیف کے نقشِ قدم پر لکھی گئی کتابیں رہی ہیں لیکن اس 'فرمائشی ادب' نے وہ
گل کھلائے کہ نثری ادب کی ترقی کے لئے راہیں کھل گئیں۔''

(بحوالہ ''مغربی بنگال کا شعری و نثری ادب'' مرتبین: شاہد ساز/محمد امتیاز احمد ص: ۳۲۴-۳۲۳)

اس ضمن میں پروفیسر عبدالمنان (سابق صدر، شعبۂ اردو، کلکتہ یونیورسٹی) کی رائے بھی
ملاحظہ فرمائیں جو نہایت اہم ہے:

''......اردو نثر کو ارتقا کی منزلوں تک پہنچانے میں فورٹ ولیم کالج کے منشیوں کا
اہم رول رہا ہے۔ یہ لوگ کالج میں درس و تدریس کا ہی کام نہیں کرتے تھے بلکہ
تصنیف و تالیف سے بھی گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں کالج میں صلہ و انعام
کی غرض سے اپنی کتابیں بھی داخل کی تھیں......فورٹ ولیم کالج نہ صرف ایک
تدریسی ادارہ تھا بلکہ جدید اردو نثر کی ایک اہم کڑی تھا۔ کوئی ادبی تحریک جیالے
مصنفوں اور جانباز فنکاروں کی وجہ سے آگے بڑھتی ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے
مصنفین کی خدمات اردو نثر کے ارتقا میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں اور ان
کے نثری کارنامے ایک تحریک کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ اگر جدید نثر مختلف
خیالات و معتقدات کے پیش کرنے کا اہم وسیلہ بن گئی اور اردو اس قابل ہو گئی

کہ دوسری ترقی یافتہ زبانوں سے آنکھیں ملا سکے تو اس کی کامیابی کا سہرا فورٹ
ولیم کالج کے منشیوں کے سر بھی بندھنا چاہیے۔"

(کتاب "میر امن دہلوی کی نثری خدمات" اشاعت: ۱۹۹۴ء ص:۶۲)

اردو نثر کے اس اہم مرکز کی بدولت تصنیف و تالیف کے کام میں موضوع کی افادیت کے علاوہ اسلوبِ بیان کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہوئی۔ قلم کاروں کو اس بات کا احساس ہوا کہ جس قدر موضوع اہمیت کا حامل ہے اسی قدر اسلوبِ بیان کی سادگی، سلاست اور زبان کا روزمرہ کے مطابق ہونا بھی ضروری ہے تاکہ قاری بات کو صحیح طور پر سمجھ سکے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ مطالب کو سادہ، آسان اور عام فہم انداز سے بیان کیا جائے۔

فورٹ ولیم کالج ۲۴/جنوری ۱۸۵۴ء کو بند کر دیا گیا لیکن ان ۵۴/برسوں کے دوران یہاں کے منشیوں، ترجمہ نگاروں اور قلمکاروں کی مساعی جمیلہ کی بدولت اردو نثر بلند مرتبہ کی حامل ہوئی۔ اس سے قبل اردو زبان یا تو پرتکلف داستان سرائی تک محدود تھی یا پھر اسے مذہبی اور اخلاقی تبلیغ کی زبان تصور کیا جاتا تھا لیکن فورٹ ولیم کالج میں لکھی جانے والی کتابوں نے یہ ثابت کر دیا کہ اردو زبان میں اتنی وسعت اور صلاحیت ہے کہ اس میں تاریخ، جغرافیہ، سائنس، داستان، تذکرہ، غرضیکہ ہر موضوع اور مضمون کو آسانی سے بیان کیا جا سکتا ہے۔

❖❖❖

پیش خدمت ہے **کتب خانہ** گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے
https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
0307-2128068
@Stranger

لسانی جامعات اور فاصلاتی تعلیم: اردو زبان کے حوالے سے

انسانی زندگی کو خوب سے خوب تر بنانے کا واحد وسیلہ تعلیم ہے۔ ایک بچہ چوں کہ اپنی بات کی ترسیل اور افہام و تفہیم مادری زبان میں ہی بہتر طور پر کر سکتا ہے اس لئے فطری طور پر یہ نظام رائج رہا کہ بچے کو ابتدائی تعلیم مادری زبان میں دی جائے۔ پھر اسکول کے بعد اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے دوسری زبانوں کو وسیلہ بنایا جائے۔ ہمارا ہندوستان ایک وسیع ملک ہے۔ یہاں کثرت میں وحدت کا جلوہ نمایاں رہا ہے۔ اس ملک کے مختلف حصوں میں مختلف زبانیں بولی اور لکھی پڑھی جاتی ہیں۔ دستور ہند نے ہندوستانی شہریوں کو ابتدائی تعلیم مادری زبان میں حاصل کرنے کا حق عطا کیا ہے۔ اس طرح اسکول کی سطح پر تو بچوں کی تعلیم کا ذریعہ مادری زبان ہی ہوا کرتی ہے۔ لیکن اعلیٰ تعلیم کے حصول کا ذریعہ انگریزی زبان رہی ہے۔ تاہم دور حاضر میں مادری زبان کے توسط سے اعلیٰ اور پیشہ ورانہ تعلیم کا حصول بھی ممکن ہو گیا ہے۔ فاصلاتی نظام تعلیم کے فروغ نے پوری دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا ہے۔ ایسی یونیورسٹیاں یا جامعات قائم ہو چکی ہیں جو مادری زبان میں اعلیٰ تعلیم دیتی ہیں۔ نہ کالج اور یونیورسٹی کی چہار دیواریوں تک پہنچنے کی ضرورت، نہ مخصوص وقت کا تعین۔ بس گھر بیٹھے اپنی سہولت، مرضی اور وقت کے مطابق تعلیم حاصل کیجئے۔ ہر موضوع کے لئے مخصوص اساتذہ کی جماعت فاصلاتی نظامِ تعلیم کے ذریعہ طلبہ کی مدد کے لئے ہمہ وقت تیار ہے۔ ہندوستان میں اب ایسی یونیورسٹیاں بھی قائم ہیں جو مادری زبان میں ہی فاصلاتی کورس کے ذریعہ اعلیٰ تعلیم دیتی ہیں۔ ایسی لسانی جامعات نے گھر گھر پہنچ کر علم کا چراغ روشن کر دیا ہے بلکہ پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم کو بھی فروغ دیا ہے۔

لسانی جامعات میں اعلیٰ تعلیم کے پھیلے ہوئے کینوس پر بات کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم زبان کی اہمیت اور لسانی تقاضوں کو سمجھیں۔ عام طور پر اعلیٰ تعلیم کے جامعات جو فاصلاتی

تعلیم دیتے ہیں ان کی تکنیک اور حکمت عملی دونوں کے لئے معیار اور پیمانہ طے کرنا ضروری ہے۔ اس ضمن میں ۱۹۶۲ء سے دہلی یونیورسٹی میں کام شروع ہوا جو بہت ہی ابتدائی قسم کا تھا اور بڑی آبادی تک اعلیٰ تعلیم کو پہنچانے کے لئے ناکافی تھا۔ یہ بات ذہن نشیں کر لینی چاہئے کہ زبان کا دائرہ بہت ہی وسیع ہے اور لسانی اعتبار سے جن کورسیز کو پڑھایا جاتا ہے ان کے لئے جو تکنیک درکار تھی وہ دھیرے دھیرے سامنے آئی۔ ہندوستان جیسے کثیر آبادی والے ملک میں جہاں دور دراز علاقہ سے لوگ بغیر کسی روایتی درسگاہ سے گذرے ہوئے اعلیٰ تعلیم کے حصول کی کوشش کرتے ہیں ان کے سامنے بڑے چیلنجز رہتے ہیں۔ اگرچہ مغربی ممالک مثلاً برطانیہ وغیرہ میں بھی کورسپونڈنس (مراسلاتی) کے ذرائع استعمال کیا جانا عام بات تھی، لیکن وہاں بھی نئی تکنیک خصوصاً جرمنی، آسٹریلیا سے درآمد کی گئی اور الیکٹرونک میڈیا سے اس کا دائرہ بڑھتے بڑھتے انٹرنیٹ کی آن لائن تعلیم کے مدارج طے کرنے کی کامیاب کوشش ہونے لگی۔

آئزک پٹ مین کے زمانہ کا مراسلاتی تانہ بانہ بہت ہی محدود تھا۔ کیونکہ اس کے ذریعہ صرف شارٹ ہینڈ کی تعلیم دی جاتی تھی، لیکن سیٹلائٹس کالجوں کا تصور سامنے آنے کے بعد ۱۸۹۲ء میں مراسلاتی تعلیم کا سلسلہ پھیلا اور مراسلاتی تعلیم میں اضافہ اور ترقی ہونے لگی۔ کولمبیا یونیورسٹی اور آسٹریلیا کی کوئنس لینڈ یونیورسٹی نے مراسلاتی شعبۂ تعلیم قائم کئے۔ لیکن چارلس ویڈمیئر جو وسکانسن یونیورسٹی سے تعلق رکھتے تھے، انہوں نے فاصلاتی تعلیم کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ یہ سارے کام امریکہ میں ۱۹۶۴ء سے ۱۹۶۸ء تک ہوئے اور ترسیل و ابلاغ کے ذرائع کو اور مستحکم بنانے کی کوشش کی گئی تاکہ دور دراز علاقوں تک تعلیم کا فروغ ہو سکے۔ اس نظریہ کو ۱۹۶۹ء میں یو کے میں درآمد کیا گیا اور اوپن جامعات ریڈیو اور ٹیلی ویژن نشریات کے ذریعہ پہنچانے کی کوشش کی گئی۔ ۱۹۷۴ء میں فرن یونیورسٹی جرمنی نے اس کی تقلید کی اور دنیا بھر میں پھر اوپن یونیورسٹی کا سلسلہ شروع ہو گیا اور اس کے ذریعہ مقامی زبان کی تعلیم کو اپنایا گیا۔ اس ٹکنالوجی کو اپنانے کے بعد بڑے تعلیمی ادارے سامنے آئے جن میں لاکھوں طلباء اپنی تعلیمی تشنگی دور کرنے لگے۔

کمپیوٹر اور انٹرنیٹ نے فاصلاتی تعلیم کو دور دراز علاقوں تک پہنچانے میں مزید مدد کی اور

اس کے بعد آن لائن کا سلسلہ شروع ہوا۔ ۱۹۹۶ء میں جونس انٹرنیشنل یونیورسٹی نے اس طرح کی تعلیم کو پہلی بار جاری کیا جسے امریکہ کے اکریڈیٹنگ ایسوسی ایشن نے تسلیم کرلیا۔

۲۰۰۶ء میں سلون کونزرشیم نے متضاد مفادات کے معاملات اٹھائے۔ تقریباً ۹۶ فیصد بڑے اداروں میں پندرہ ہزار طلباء کی فہرست سازی ہوئی اور چھوٹے اداروں میں اس کی تعداد بہت کم دکھائی دی۔ ۲۰۰۵ء میں امریکی طالب علموں کی مجموعی تعداد ۳ اشاریہ ۲ ملین بتائی جاتی ہے۔

جہاں سرکاری سطح پر ادارے بغیر کسی نفع ونقصان کے جاری تھے وہاں نجی اداروں نے بھی منافع کی غرض سے فاصلاتی تعلیم کا سلسلہ شروع کیا۔ یہاں تک کہ ڈاکٹریٹ پروگرام تک ڈگریاں دی جانے لگیں۔ معیار کے اعتبار سے الگ الگ ادارے الگ الگ معیار پر جانچے جاسکتے ہیں۔ (بعض نام نہاد ادارے بھی وجود میں آئے ہیں لیکن انہیں جانچنے اور پرکھنے کے لئے غالباً کوئی باقاعدہ ڈائرکٹوریٹ آف ایجوکیشنل کاؤنسلنگ، جیسا ادارہ نہیں ہے)۔ پھر بھی مختلف زبانوں میں مختلف پیرائے اور پیمانے آج بھی ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

فاصلاتی یا مراسلاتی نظام تعلیم/ODL سسٹم ان لوگوں کے لئے معرضِ وجود میں آیا جو کسی نہ کسی وجہ سے اعلیٰ تعلیم کیمپس میں جا کر حاصل کرنے کے متحمل نہیں ہیں۔ لہٰذا Just to reach the unreach کے موقف کے تحت مادری زبان کے وسیلہ سے اعلیٰ تعلیم کے حصول کا مؤثر ترین نظام بنانے کی مسلسل سعی اس نظامِ تعلیم میں جاری وساری کی گئی۔ نتیجتاً تعلیمی افادیت کے اعتبار سے ہی یہ نظام مقبول عام نہیں ہوا بلکہ لسانیاتی فروغ کے رول میں بھی اس کی افادیت ہمہ گیر ہوتی جارہی ہے۔ اس ضمن میں اردو ذریعہ تعلیم کے حوالہ سے جامعہ اردو علی گڑھ کو اولیت حاصل ہے۔ اسی کے پیش نظر کیمپس ایجوکیشن کے حامل جامعات نے بھی اس نظام کو اپنالیا ہے۔ یہاں مرکزی، ریاستی، ڈیمڈ بشمول نجی انسٹی ٹیوشن تقریباً 249 جامعات وادارے ODL سسٹم چلارہے ہیں، جن کا میڈیم انگریزی اور علاقائی زبانیں ہیں۔ ان میں 20% جامعات وادارے میں ہی کسی نہ کسی سطح پر اس نظام تعلیم میں اُردو کو جگہ دے رکھی ہے۔ اس ضمن میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، جے این یو، یونیورسٹی آف کشمیر، جموں یونیورسٹی، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد،

ڈاکٹر بی آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی حیدرآباد، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی حیدرآباد، یونیورسٹی آف مدراس، مراٹھواڑہ یونیورسٹی اورنگ آباد، نالندہ اوپن یونیورسٹی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ جدید تعلیم کے ذرائع میں اردو کو منفرد مقام حاصل ہے۔ اردو زبان میں جدید اور اعلیٰ تعلیم کی فراہمی ہندوستان کے تناظر میں نئی بات نہیں ہے۔ انیسویں صدی کے ابتدائی عرصہ میں دلی میں اردو میڈیم کالج اور یونیورسٹی کی موجودگی کا ثبوت ملتا ہے جہاں سماجی سائنس، ادب اور فلسفہ کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا جاتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اردو میں میڈیکل اور انجینئرنگ کی تعلیم کا ذریعہ بھی بنی۔ جب کہ ۱۸۳۵ء میں کلکتہ اور آگرہ میڈیکل کالج تھامسن روڑکی انجینئرنگ کالج میں میڈیکل اور انجینئرنگ کی تعلیم اردو میں دی جانے لگی۔ ۱۹۱۷ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام نے اردو ذریعہ تعلیم کی روایت کو مزید مستحکم کیا اور اس کے گریجویٹس نے پورے ہندوستان میں اپنی اہمیت تسلیم کرائی۔

لسانی جامعات میں مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کو اختصاص حاصل ہے کہ کیمپس اور ODL دونوں سسٹم کا ذریعہ تعلیم صرف اُردو ہے اور اگنو کے بعد اس کا نٹ ورک بین الاقوامی سطح تک پھیلا ہوا ہے۔ OUTLOOK گروپ کے میگزین Careers 360، نئی دہلی اگست ۲۰۱۰ء نے اپنے تجزیاتی مضمون میں اس نظام کو چلانے والی ۳۰/جامعات و ادارے کی معیار بندی ان کی کارکردگی کی بنیاد پر کی ہے۔ اسکے مطابق List of Honour میں سرفہرست اگنو ہے اور چھٹے مقام پر مانو ہے، Reach and Resources کے اعتبار سے اگنو اوپر ہے تو آٹھواں مقام مانو کا ہے اور Results and Efficiency میں مانو کو پانچواں جبکہ اگنو کو پندرہواں رینک ملا ہے۔

مانو نے سائنس اور ٹکنالوجی کے دورِ عروج میں اردو زبان کو انگریزی زبان کے قریب لا کھڑا کیا ہے۔ محض بارہ تیرہ سال کی قلیل مدت میں بنیادی تعلیم سے لے کر اعلیٰ ادبی، فنی، پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیمی نظام کو اہل اردو تک پہنچا دینا مانو کا ایک قابل ستائش کارنامہ ہے۔ فی الوقت مانو 9 ریجنل، 7 سب ریجنل سنٹرس کے تحت تقریباً 174 اسٹڈی سنٹرس میں بی اے، بی کام، بی ایس سی، ایم اے اردو، انگریزی اور تواریخ کے علاوہ بی ایڈ دو سالہ کورس، پی جی ڈپلوما کورسیز برائے Museology and Tourism Management، ڈپلومہ ان جرنلزم اینڈ ماس کمیونی کیشن، ٹیچ انگلش،

سرٹیفکیٹ کورسیز برائے فنکشنل انگلش، غذا اور تغذیہ اور Proficiency in Urdu through Hindi/English کا کورس اس نظام کے تحت چلا رہا ہے۔ مانو کا یہ نظام اہل اردو کے سب سے زیادہ ناخواندہ طبقہ خواتین کو مردوں کے تناسب میں زیادہ متوجہ اور مستفید کر رہا ہے۔ اس کی حسن کارکردگی نے غیر ملکوں کی اردو آبادی کو بھی متوجہ کیا ہے جس کے نتیجہ میں جدہ (سعودی عرب) میں اس کا ایک امتحان مرکز قائم ہوا اور برطانیہ، کناڈا اور امریکہ میں بھی مرکز کا قیام متوقع ہے۔ اس طرح ODL نظام کے فروغ میں ایسی ہندوستانی لسانی جامعات جو اعلیٰ اور پیشہ ورانہ تعلیم میں اپنی خدمات انجام دینے میں سرگرم ہیں ان میں مانو کی پیش رفت تیز گام ہے، اطمینان بخش اور امتیازی بھی ہے۔

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی اپنے محدود وسائل کے باوجود روایتی کلاس روم اور انفرااسٹرکچر کے ساتھ ساتھ فاصلاتی تعلیم پر خصوصی توجہ دیتی ہے۔ ہندوستان گیر پیمانہ پر اردو میں اتنا بڑا کام کسی لسانی جامعہ نے نہیں کیا ہے۔ زبان کے ذریعہ متنوع نصابیات (Syllabi) اور کورسیز کو پیش کیا ہے۔ دور دراز علاقوں میں ریجنل سنٹرس بنائے گئے جس نے اور بھی دور دراز علاقوں تک اعلیٰ تعلیم کے مختلف ڈسپلن میں کام کرنے کی اہلیت پیدا کی۔ طالبان علم اپنی معاشی اور اقتصادی مجبوریوں کے باوجود آج اس نظام سے فیضیاب ہو رہے ہیں اور آنے والے وقتوں میں اردو ذریعہ تعلیم کو اپنا کر اعلیٰ تعلیم سے فیضیاب ہوتے رہیں گے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کثیر آبادی والے ملک میں جہاں ہر جگہ انٹرنیٹ اور کمپیوٹر کی سہولتیں دستیاب نہیں ہیں وہاں اس تعلیمی مشن کو تیز رفتاری کے ساتھ آگے لے جانے میں کچھ کمیاں باقی ہیں۔ تاہم نئی پیش رفت کے نتیجے میں نئے مسائل سامنے آتے رہیں گے اور ان کے حل بھی دریافت ہوتے رہیں گے۔ یہی ایک زندہ ادارہ کی شناخت بھی ہوتی ہے اور اس کی زندگی کا استحکام بھی۔ آنے والے وقتوں میں سامنے آنے والے مسائل کو حل کرنے اور کمیوں کو دور کرنے کی منصوبہ بند پیش رفت جاری ہے۔ توقع ہے کہ عنقریب گاؤں گاؤں تک اردو آبادی کے لئے اعلیٰ تعلیم کی حصولیابی آسان ہو جائے گی۔ اس طرح کے اداروں کو سرکاری سطح پر مزید حوصلہ افزائی اور فنڈنگ کی ضرورت ہے اور جب

تک فاصلاتی نظام تعلیم کے لئے خصوصی پلان نہیں تیار کیا جاتا اس وقت تک اس کے مشن کو تیز تر بنانے میں دشواریاں رہیں گی۔ یوں تو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی روایتی طرز تعلیم کو بھی جاری رکھے ہوئے ہے لیکن فاصلاتی تعلیم کو اردو کے حوالے سے فروغ دینا اس کا بنیادی مقصد ہے۔

اصل میں اعلیٰ تعلیم کے ساتھ مساواتی رویہ اور انصاف پر مبنی دستاویزی کریکولم تیار کرنا لسانی جامعات کے لئے بڑا چیلنج ہے۔ ہندوستان گیر پیمانہ پر زبان کے لحاظ سے لسانی جامعات کی کمی نہیں اور تمام جامعات اپنا دائرہ وسیع کرنے کے لئے سمت اور نئی جہت تلاش کر رہی ہیں اور یہی وقت کا تقاضہ بھی ہے اور اردو جامعات بالخصوص مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا فاصلاتی نظام اس طریقہ سے قائم کیا گیا ہے کہ وہ بنیادی طور پر اردو بولنے والے ہر شہری کو یکساں سہولت بہم پہنچائیں۔ تعلیم کے اس نظام تک رسائی کو آسان بنانے کے لئے مانو ممکن تجربوں سے گذر رہا ہے۔ قومی اور بین الاقوامی سطح پر لسانی جامعات جس طرح کے تجربے کر رہی ہیں اس کے فیڈ بیک سے بھی یہ یونیورسٹی استفادہ کر رہی ہے۔ اسلئے نئے وژن کے ساتھ تعلیم کے نشیب و فراز کو سمجھنے اور سمجھانے کا بہتر اور موثر طریقہ اپنانے کی مثبت پیش رفت بھی جاری ہے۔ اس ضمن میں ماہر تعلیم پروفیسر محمد میاں (اس وقت کے شیخ الجامعہ، مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی، حیدرآباد) کا یہ نظریہ نہایت اہم ہے کہ ”مانو کا فاصلاتی نظام تعلیم ان افراد کو تقویت دینے کی خاطر بھی ہے جو تعلیم کی مین اسٹریم میں نہیں ہیں۔“ (بحوالہ: کیریرس ۳۶۰، اگست ۲۰۱۰ء)

میں اپنی باتوں کو اس قطعہ پر ختم کرتا ہوں:

حاشیے پر کھڑا تھا جو انساں — پا گیا وہ بھی درجۂ کامل
فاصلاتی نظامِ علم سے اب — طے ہوئی راہ جو تھی کچھ مشکل

پیش خدمت ہے کتب خانہ گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے
https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
0307-2128068
@Stranger

ہندوستانی فلموں میں تفریح کے پہلو

عام طور پر تفریح کو بہت ہی سستی چیز کی حیثیت سے دیکھا اور سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ زندگی میں جتنے مسائل ہوتے ہیں کبھی کبھی ان سے الگ ہوکر زندگی کا لطف اٹھانا ایک اہم تقاضہ ہوتا ہے۔ اس لئے کہ غم و مسائل کی اس دنیا میں کمی نہیں ہے اور انسان الجھنوں اور پریشانیوں میں گھر کر کبھی تو مہاتما بدھ ہوجاتا ہے اور سکون کی تلاش میں جگہ بہ جگہ پھرتا رہتا ہے یا ذوق کی تسکین اور قلبی سکون کے لئے تفریحی مشاغل ڈھونڈتا ہے۔ جیسے کھیل کود اور اپنی ہابیوں سے وہ تفریح کے لمحات کو سمیٹ لیتا ہے۔ کرکٹ کے شوقین کی دیوانگی ایک عام سی بات ہے اور وہ کسی ٹیم کے لئے اس قدر دیوانہ ہوجاتا ہے کہ دیوانگی میں میچ کا ہر لمحہ اسے تفریح کی دنیا کی سیر کراتا ہے۔ ایک انجانی لذت سے وہ ہمکنار ہوتا ہے، جسے ہم تفریح کہتے ہیں۔

پہلے جب فلمیں نہیں تھیں تو ڈرامے اسٹیج کیے جاتے تھے اور اس سے لوگ محظوظ ہوا کرتے تھے۔ لیکن جب پردہ پر فلمیں آنے لگیں تو ان سے ہر خاص و عام کی زندگی میں تفریح کا ایک نیا باب کھل گیا، الکٹرانک میڈیا میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے بھی تفریح حاصل کرنے کا سلسلہ جاری و ساری ہے۔ لیکن فلموں کی بات ہی الگ ہے۔ فلموں میں وہ اپنے آپ کو محسوس کرتا ہے اور کبھی کبھی وہ پورے معاشرے کی جیتی جاگتی تصویروں کو دیکھ کر ہنستا ہے، مسکراتا ہے اور کبھی اتنا Involved ہوتا ہے کہ روتا بھی ہے۔ لیکن اس کا Involvment اسے دکھ نہیں دیتا بلکہ وہ ایک انجانا سکون محسوس کرتا ہے۔ جب ویلن کے ہاتھوں ہیرو کی سرزنش ہوتی ہے تو وہ بوکھلا جاتا ہے اور جب ہیرو ویلن پر حاوی ہوجاتا ہے تو اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا اس نے اس ظالم پر فتح حاصل کرلی ہے اور وہ اتنا محظوظ ہوتا ہے کہ اس کے ذہن و دل کے غبار جس کے بوجھ تلے وہ دبا رہتا ہے اخراج پذیر ہوجاتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ مخصوص سین کو یا مخصوص حصہ کو وہ بار بار دیکھتا ہے اور تفریحی لذت سے ہمکنار ہوتا ہے۔

فلموں میں تصویریں اوران کے بیک گراؤنڈ میں مناظر قدرت، جھیل، پہاڑ، خوبصورت پھول، وادیاں جن ملکوں کو نہیں دیکھا ان کا چشم دید نظارہ، بولتی تصویریں آنکھوں کے سامنے ہوتی ہیں۔ان کی آنکھ اور کیمرے کی آنکھ میں بنیادی فرق یہ ہوتا ہے کہ وہ کئی فلیشیز مختلف زاویوں سے پیش کردیتا ہے اوران کی آنکھیں ہرزاویے سے مناظر کی دلکشی کو اتنی باریکی سے نہیں دیکھ پاتیں جتنی باریکی سے کیمروں میں سامنے لاتا ہے۔ مناظر قدرت، دلکش ماحول، چمچماتی ہوئی گاڑیاں، فلک بوس عمارتیں، دریچے، جھونپڑیاں اور ہزاروں مناظر بیک وقت کیمروں کے فلیشیز سے اس تیز رفتاری سے سامنے آتے ہیں کہ اس ماحول میں ناظرین گم ہو جاتے ہیں اور ایک انجانے تفریحی ماحول کے احساس سے گزرتے ہیں۔

کہانی کا تجسس بھی تفریح کا ایک اہم ذریعہ ہوتا ہے تجسس سے یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ اگلا سین دیکھ لوں، کیوں کہ کہانی مختلف ادوار اور پہلوؤں سے گزرنے لگتی ہے اور یہ تجسس بھی تفریح کا بہت بڑا ذریعہ ہوتا ہے اور جب کلائمکس اور انٹی کلائمکس تک فلمی کہانیاں پہنچ جاتی ہیں تو وہ تفریح کا نقطۂ عروج ہوتا ہے۔ناظر اس کی آغوش میں کھو جاتا ہے اور بہت دیر تک لطف اندوز ہوتا رہتا ہے۔

ہیروئن کا کردار بھی دیدہ زیب ہوتا ہے اور محبت کا جذبہ جو ہر انسان کے اندر موجود ہوتا ہے اور ہر کسی کے دلوں کی دھڑکنیں بڑھ جاتی ہیں اس بات پر خوش ہو جاتی ہے کہ اسے کوئی چاہنے والا تو ہے۔ یہ محبت کے احساسات جو فلموں میں پیش کئے جاتے ہیں جو انسانی نفسیات پر گہرا اثر چھوڑتے ہیں اور اس سے بہت زیادہ انبساط حاصل کیا جاتا ہے اور تفریح کے احساس سے دوچار ہونے کا موقع ملتا ہے۔

فلموں کے گیت نغمہ نگاروں کے قلم سے لکھے گئے الفاظ، اس کی سجاوٹ و بناوٹ اس کی تراش خراش دلوں کو چھونے لگتے ہیں۔ جس سے دیکھنے والے کو، سننے والوں کو بھرپور کیف و مسرت اور تفریح کا احساس ہوتا ہے۔ موسیقی کار حضرات موسیقی کی ایسی دھن بناتے ہیں کہ عام انسان جھومنے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ بچے بھی جو موسیقی اور شاعری کو نہیں جانتے وہ بھی رقص کرنے لگتے ہیں۔ اس لئے فلموں کی موسیقی بھی اتنا پاور اپنے اندر رکھتی ہے کہ اس سے کافی تفریح ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ دھنوں پر لوگ گنگنانے لگتے ہیں، گلی کوچوں میں اور حمام میں بھی۔ فلم ایک بہت بڑا ذریعہ تفریح ہے۔

ممکن ہے اس میں میسج بھی ہو لیکن اس پر تفریح کا لیپ اتنا گہرا ہوتا ہے کہ ہر فرد و بشر اس سے اپنے اندر ایک ترنگ محسوس کرتا ہے۔ ہندوستان میں جہاں بیشتر لوگوں کے پاس وسائل اور ذرائع کی کمی ہے، ان کیلئے ہندوستانی فلمیں تفریح کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں۔ فلم کی گہری چھاپ سماج پر پڑتی ہے کیونکہ وہ سماج کے مختلف پہلوؤں کو مختلف انداز میں پیش کرتی ہے جس سے کم و بیش سماج کا ہر طبقہ آشنا ہوتا ہے۔

ہندوستانی فلموں پر یہ اعتراض ہے کہ وہ مسالہ فلمیں ہوتی ہیں، کامیڈی، ٹریجڈی، رنگینی، عوام کے جذبات کی ترجمانی، احساس کی گہرائی و گیرائی کا عکس ہوتی ہیں لیکن ان کا نقش بھی اتنا گہرا ہوتا ہے کہ زاہد خشک بھی محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ہندوستانی فلمیں دیگر ممالک کی فلموں کے مقابلہ میں تکنیک کے اعتبار سے کسی صورت کم نہیں اور جدید ٹکنالوجی کا استعمال کر کے فلموں کو مزید رنگا رنگ بنایا جاتا ہے۔ اتنی حسین اور دلکش پیش کش ہوتی ہے کہ اس کے مکالمے تک زبان زد عام ہو جاتے ہیں اور فنون لطیفہ کا بھرم پیدا کر دیتے ہیں۔ اسلئے ہندوستانی فلم تفریح کا زبردست میڈیم ہے اور اس سے بہتر تفریح کا کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا جو عام آدمی کی پہنچ تک آسانی سے دستیاب ہو۔

کسی بھی تفریح کے لئے جہاں ایکشن اور فوٹو گرافی کا اہم رول ہے وہیں زبان کا بھی بہت اہم کردار ہے۔ اردو جیسی پیاری زبان جو کانوں میں رس گھولتی ہے جس کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے، جس کے نغمے ہر کوچہ و بازار میں گونجتے رہتے ہیں، اس کی بنیاد وہی پیاری زبان ہے جس کے یہاں سلیقۂ اظہار سے لے کر Sense of humour تک بدرجہ اتم موجود ہے جو دیگر زبانوں میں نہیں ہے۔ یہ آسانی سے ترسیل ہو جاتی ہے، دلوں کو چھوتی ہے، دلوں پر راج کرتی ہے اور دیرپا تفریح فراہم کرنے میں اس زبان کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ اسی لئے ہندوستان میں مختلف زبانوں میں فلمیں تو بنتی ہیں لیکن اردو فلموں کی بالادستی آج بھی قائم ہے اور اس کی کلاسیکی حیثیت فلموں سے ثابت ہے۔ اور ہر کامیاب فلم کے پیچھے اردو زبان و ادب کا بہت بڑا رول رہا ہے اور یہ زبان معیاری تفریح کا میڈیم رہی ہے۔ امید ہے کہ فلمیں مستقبل بعید میں بھی اپنی معیاری تفریح کی روایت کو برقرار رکھنے کے لئے اردو کی پناہ گاہ میں پرورش پاتی رہیں گی۔ ❖❖❖

پیش خدمت ہے کتب خانہ گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے
https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
0307-2128068
@Stranger

عبدالغفور شہباز کے خطوط کی اہمیت

نجی مکتوب و مراسلہ نگاری اظہار کا ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے مراسلہ نگار کی زندگی کے مخفی گوشے اجاگر ہوتے ہیں اور واضح صورت سامنے آجاتی ہے، مخاطب سے قربت اور لگاؤ کے لحاظ سے کئی لاشعوری احساسات خوابوں کی دنیا میں اٹکھیلیاں کرنے کی بجائے جیتی جاگتی دنیا میں اپنے حجاب اتار دیتے ہیں۔ مراسلہ نگار کی زندگی آئینہ ہو جاتی ہے اور وہ اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ بے حجاب ہو جاتا ہے۔ اس سے اس کی شخصیت کی گہرائی و گیرائی کا مکمل اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ چونکہ ایسے مراسلوں میں نجی اور داخلی زندگی کا اظہار ہوتا ہے اس لئے مراسلہ نگار کی شخصیت میں دوئی کا احساس بھی ختم ہو جاتا ہے۔ ''اردو خطوط نگاری'' میں ڈاکٹر سیّد محمد عبداللہ نے لکھا ہے کہ :

> ''خط بڑا نازک فن ہے۔ یہ کاریگری بھی ہے اور آئینہ سازی بھی۔ یہ مختصر اور محدود بھی اور وسیع و بے کراں بھی ہے۔ یہ حد سے زیادہ شخصی بھی ہے مگر اس کے باوجود آفاقی اور اجتماعی بھی۔ اس میں دانش بھی ہے اور بینش بھی۔ یہ بظاہر کچھ بھی نہیں مگر اس کا ہر ورق پھر بھی دفتر ہے۔ معرفتِ کردگار اور معرفتِ انسان دونوں کا۔ یہ لکھنے والے کے لئے محض عرضِ سخن ہے مگر پڑھنے والے کے لئے گنجینۂ فن بھی ہوسکتا ہے۔ غرض خط ایک جہانِ راز ہے جس کے راز اگر سربستہ رہیں تو سینوں کو گہر ہائے معنیٰ کے دفینے بنا دیں اور آشکار ہو جائیں تو جذبے کی ساری دنیا مشک زار بن جائے۔''

دنیا کی بیشتر زبانوں میں خطوط کے مجموعے شائع ہوتے رہے ہیں لیکن اکثر مشاہیر نے خطوط کو بھی اپنے فلسفیانہ ادبی خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ چونکہ ایسے خطوط میں اشاعت کا ارادۂ احساس پوشیدہ رہتا ہے اس لئے ان میں وہ بے ساختگی اور داخلیت کا بے تکلف اظہار

نہیں ہو پاتا جو نجی خطوط کا لازمہ ہے۔ یہاں بھی انسان خود کو باہر کی دنیا سے مامون نہیں سمجھتا نیز اپنے اور مخاطب کے درمیان کے فاصلہ کو نہیں مٹا پاتا ہے اس لئے بہت سے ایسے احساسات دبے رہ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مشاہیر کے خطوط میں کئی مقام پر آمد کا احساس ہوتا ہے۔

اردو میں مکتوب نگاری کی روایت نے غالبؔ سے ادبی رچاؤ کی صورت اختیار کی۔ ان کے بعد سر سیّد، شبلی اور مولانا آزاد جیسے بہت سے اہم ادیبوں اور مشاہیر نے مکتوب میں اپنی شخصیت کے جلوے دکھائے ہیں لیکن ان خطوط میں شخصیتوں کے درمیان کا فاصلہ کھٹکتا ہے اور مکتوب نگار کی شخصیت اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ جلوہ گر نہیں ہو سکی ہے۔ نجی مکاتیب میں مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے درمیان قربت اور بے تکلفی کے عمدہ نمونے ہمیں پروفیسر عبدالغفور شہباز کے مجموعہ ہائے مکاتیب ''نامۂ شوق'' اور ''مکتوباتِ شہباز'' میں ملتے ہیں۔

مغربی بنگال کے حوالے سے عبدالغفور شہباز کا نام بے حد اہم ہے۔ وہ ۱۸۵۸ء میں ضلع پٹنہ کے 'سرمیرا' (موجودہ ضلع نالندہ) میں پیدا ہوئے۔ نامساعد حالات کے باوجود بی اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد انھوں نے مشاہیر علم وادب کے چشمۂ فضل سے عربی، فارسی، اردو اور انگریزی زبان میں مہارت حاصل کی۔ وہ ہمیشہ سرگرم رہے۔ کبھی صحافت سے جڑے، کبھی تراجم کا کام کیا تو کبھی کوئی دوسری ملازمت کی۔ بعد میں وہ پروفیسر کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ پھر ریاست بھوپال کے سررشتۂ تعلیم کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ انھوں نے شاعری بھی کی اور نثر نگاری بھی۔ ان میں تخلیقی صلاحیت فطری تھی۔ وہ مشرقیت شعار مگر مغربیت نواز تھے۔ اردو ادب کے اساطین اربع نذیر احمد، محمد حسین آزاد، حالی، شبلی کے علاوہ اکبرالہ آبادی کے ساتھ معمارانِ اردو ادب میں شہباز کا شمار ہوتا ہے، جنھوں نے ایوانِ اردو کو اپنی جاں فشانی سے آراستہ وپیراستہ کیا۔ انکی تصانیف اور تالیفات میں ''خیالاتِ شہباز''، ''تفریح القلوب''، ''رباعیاتِ شہباز''، ''باقیاتِ شہباز''، ''کلیاتِ نظیر''، ''زندگانیِ بے نظیر''، ''موعظِ حسنہ''، ''مقالاتِ جمالیہ''، ''ردِ نیچری''، ''سوانح عمری مولانا آزاد (سیّد محمد آزاد)''، ''نوابی دربار''، ''نامۂ شوق''، ''مکتوباتِ شہباز'' وغیرہ یادگار ہیں۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ (تقریباً ۳۰ رسال) کلکتہ میں گزرا۔ یہیں ان کا انتقال ۳۰ رنومبر ۱۹۰۸ء

کو ہوا اور یہاں کے ایک سرکاری قبرستان میں مدفون ہیں۔ معروف ڈراما نگار پروفیسر نیاز احمد خاں (لیکچرار، شعبۂ فارسی و اردو، مولانا آزاد کالج، کولکاتا) کی اہلیہ بازغہ بیگم (لیکچرار، شعبۂ اردو، لیڈی برابورن کالج، کولکاتا) عبدالغفور شہباز کی نواسی تھیں۔ مارچ ۱۹۸۴ء میں ان کا انتقال ہوا۔
وفا راشدی شہباز کا تعارف اس طرح کراتے ہیں :

> ''پروفیسر سیّد محمد عبدالغفور شہباز بنگال کے ان چند اہم علم و فضل نفوس میں سے تھے جن کی قابلیت اور خدمات کا اعتراف زمانے کی بے قدری کے باوجود ان کی زندگی میں ہی کیا جا چکا تھا۔ بیک وقت کئی زبانوں انگریزی، اردو، بنگلہ، فارسی اور عربی پر کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ انگریزی ادب سے خاص دلچسپی تھی۔ بنگال کے قابل ترین انگریزی دانوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ مشرقی ادب سے جس قدر متاثر تھے وہ تو ظاہر ہے لیکن مغربی ادب سے استفادہ کیا تھا اور اس ادب کی بعض مفید چیزیں اردو ادب میں شامل کیں۔''
>
> (''بنگال میں اردو'' ص:۱۶۴)

''نامۂ شوق'' شہباز کے خطوط کا پہلا مجموعہ ہے۔ اپنی پہلی رفیقِ حیات شمس النساء یا شمسہ خاتون کے نام لکھے گئے ان کے مکتوبات کو ان کے نبیرہ ڈاکٹر سید صابر حسن (سابق پروفیسر پی جی شعبۂ اردو، بی آر امبیڈکر بہار یونیورسٹی، مظفر پور) نے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ مہدی افادی اور جاں نثار اختر کے خطوط کی طرح یہ مکاتیب بھی ان اوصاف کے حامل ہو سکتے تھے مگر جب ان کی اشاعت کا وقت آیا تو ان کی شریکِ حیات نے اپنی داخلی، ذاتی اور اور گھریلو زندگی کے واقعات کو حذف کر دیا۔ اس طرح ان خطوط کی داخلیت متاثر ہوئی اور ان میں ادبی و سیاسی رنگ غالب ہو گیا۔ نجی خطوط میں جو گھریلو پن اور ذاتی عناصر ہوتے ہیں وہ عبدالغفور شہباز کے ان خطوط میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ان میں ادبی اور شاعرانہ رعنائی بھی بڑی بے تکلفانہ ہے۔ بے ساختگی اور نجی پن جو خطوط کا لازمی جز ہیں، ان خطوط میں جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ یہ بے ساختہ پن کہیں اور نظر نہیں آتا۔ بعض اقتباسات ہمارے اس دعوی کی بین دلیل ہیں۔ پیش کردہ اقتباس اسی سے ماخوذ ہیں:

"یہاں گرمی اچھی طرح پڑنے لگی اور کیوں نہ پڑے پھاگن کا مہینہ بھی تو شروع ہو گیا۔ پھاگن گرمیوں کا پھاٹک ہے۔ لیکن میں نے ابھی تک کشمیرے کی اچکن نہیں اتاری اور رات کو وہی زر تمیس والا لحاف جس کو تم بالا پوش کہتی تھیں اوڑھتا ہوں۔ لحاف ہے جس کو تم نے بھی بہت دنوں تک اوڑھا ہے اور اسی واسطے میرا دل قبول نہیں کرتا کہ جلدی سے اس کو علاحدہ کر دوں لیکن افسوس کہ قریب ہے وہ مصیبت کا زمانہ جب کہ وہ لحاف مجھ سے چھوٹ جائے گا۔"

(۲۷ر فروری ۱۸۸۰ء)

"......دل لگی کی باتیں ہو چکیں اب کام کی باتیں سنو۔ تم کو آج تک میں جتنے خط بھیج رہا ہوں۔ ان کی نسبت کچھ کہا نہیں، سو سنو خطوں کو حفاظت سے اپنے بکس میں پڑھ پڑھ کر رکھتی جاؤ میں آ کر سب خطوط تم سے سمجھ لوں گا۔ اگر ایک بھی گم ہوا ہے تو میں ناراض ہوں گا۔ چلتے چلتے چند لفظوں کی فارسی بتاتا جاتا ہوں۔ تم یاد کر لو۔ ہندی داہنے طرف ہے اور فارسی بائیں طرف۔"

(۲۸ر فروری ۱۸۸۰ء)

"......اسی خیال سے کبھی کبھی مجھے دوسری شادی کی دھن ہو جاتی ہے کہ وہ لطف پھر ملتا۔ اس سے تم یہ نہ سمجھو کہ میں بیاہ کرنے کو مستعد ہوں میں کبھی دوسری شادی نہ کروں گا اور اگر کروں گا بھی تو تمہاری مرضی سے اور تمہاری اجازت لے کر۔ اور میں دوسری شادی کیوں کروں تمہاری سی صفتیں دوسرے میں کہاں ملیں گی۔ یہ حسن و جمال، یہ قد و قامت، یہ قیافہ، یہ صورت، یہ رنگت، یہ روغن بھلا دوسرے میں کہاں پاؤں گا......اگر تم چاہو کہ میں دوسرا بیاہ نہ کروں تو تم اپنی زبان صاف کرو نہیں تو میں ضرور دوسرا بیاہ کر لوں گا۔ ہاں زبان درست کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ روز چار ورق کتاب کے پڑھا کرو۔"

(۲۹ر فروری ۱۸۸۰ء)

”......بڑی فکر تو مجھ کو تمہاری لگ رہی ہے۔تمہارے میکے میں جو دولت ہے وہ معلوم ہے۔خود تمہارے ماں باپ تکلیف میں ہیں تم کو کون پوچھتا ہے۔تمہاری سسرال میں جو دولت ہے وہ واجبی ہی واجبی.....کبھی کبھی تم کو خیال ہوتا ہوگا کہ کسی اچھے خاندان میں شادی ہو جاتی تو اس وقت آرام و چین سے بسر ہوتی۔ بیشک یہ خیال تمہارا نہایت صحیح ہے اور میں شرمندہ ہوں کہ کیوں نہیں ہاتھ پاؤں ہلا کر تمہیں آرام پہنچاتا ہوں۔ بیوی صاحب معاف کرو۔اب میں بہت جلد کوشش کر کے کوئی نوکری کر لیتا ہوں۔تم سے زیادہ حقوق میرے ماں باپ کے مجھ پر ہیں......“ (۱۰/مارچ ۱۸۸۰ء)

”نہا دھو پاک صاف ہو کر کپڑے بدل آئینہ کنگھی سے فارغ ہو کر میں خط لکھنے بیٹھا ہوں۔میں نے تم کو پہلے اطلاع دی ہے کہ میں نے بال رکھے ہیں۔اب ماشاء اللہ پچھلے بال کان تک برابر ہو گئے ہیں۔ذرا سامنے کے بال چھوٹے ہیں مگر ایسے بھی نہیں کہ مانگ نہ نکلے۔مانگ خاصی طرح نکل آتی ہے۔اس کے نکالنے میں محنت نہیں کرنا پڑتی۔شام کو مانگ نکالتا ہوں صبح تک ہی رہتی ہے۔ اگر تیل ڈالا کروں تو شاید پٹی بھی جوں کی توں جمی رہے مگر تیل ڈالنے کا اتفاق ہی نہیں ہوتا کہ اب ان بالوں کیلئے کون دردسر کرے۔کوئی آدمی بھی میرے پاس نہیں کہ جس کے ہاتھ بازار سے تیل منگاؤں۔آدمی کے نہ ہونے سے آج تک کھلی یا مٹی سے بال دھونے کا بھی اتفاق نہ ہوا۔جب نہایا صرف پانی بدن پر انڈیل لیا یا جہاں جہاں ہاتھ پہنچا تھوڑا بہت صاف کر لیا۔......بار بار جی میں آتا ہے کہ بال تراش ڈالوں مگر پھر تمہاری فرمائش کی وجہ سے رک رہتا ہوں۔ نیت یہ ہے کہ ایک بار تمہیں اپنے پھر سر کے بال دکھالوں تو پھر انھیں ہوا بتاؤں۔“

(”نامہ شوق“ ص:۷۷ مرقومہ ۱۳/جولائی ۱۸۸۱ء کلکتہ)

”......تم کہتی ہو کہ ”میں نے تین قطع خط آپ کے یہاں لکھا ہے“ میرے یہاں

تو صرف دو ہی پہنچے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک خط تمہارا گم ہوا اور قسم لے لو جو مجھ کو ملا ہو ورنہ میں ضرور اس کا جواب بھی لکھتا.... تم کہتی ہو کہ میں سائیں کے ہاتھ حلوہ بھیج دوں گی۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ سائیں کلکتے آ بھی گیا اب کوئی اور طریقہ سوچو۔"　　　　(۲۲ر دسمبر ۱۸۸۲ء)

"......لحاف کی ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ جب اوڑھ کر سونے لگتا ہوں اور لحاف کی اندھیری کوٹھری میں اپنے کو تنہا پاتا ہوں تو اس فکر میں ہوتا ہوں کہ کاش اس وقت تم یہاں ہوتیں کہ یہ تنہائی رفع ہوتی اور اس اندھیری کوٹھری میں تمہارے چہرے کی روشنی سے اجالا ہوتا۔ سید محمد خاں نے جب اس لحاف کا ذکر سنا فرمایا جو لوگ بھلے مانسوں کی طرح اپنی بیویوں کا خیال کرتے ہیں ان کی یونہی خاطر ہوتی ہے۔ میں نے کہا خاطر کیا ہوئی۔ خاطر تو جب ہوتی کہ بیوی صاحب بھی اس لحاف میں لپٹی ہوئی چلی آتیں۔"

(۲۴ نومبر ۱۸۹۰ء)

غرض تمام خطوط اسی طرح کی بے تکلفی، بے ساختگی، سادگی اور عام زندگی کی سچائیوں کے بے جھجک اظہار کا نمونہ ہیں۔ ان میں ان کی داخلی اور نجی زندگی کے سارے واقعات بے محابہ نظر آتے ہیں اور ان کے دل کی دھڑکن صاف سنائی دیتی ہے نیز ان کی داخلی زندگی اور نجی دنیا میں جو کچھ ہو رہا تھا اس کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جذبات کی رنگینیوں کے ساتھ انہوں نے جس والہانہ انداز میں اپنی بیگم کو مخاطب کیا ہے کوئی شاعر ہی اس باریک بینی سے اپنے دل کے واردات اور قلبی احساسات کو اپنے خطوط میں ڈھال سکتا ہے۔ "نامہ شوق" کے مکتوبات پر جمیل مظہری نے یوں اظہار خیال کیا ہے:

"میاں بیوی کے خطوط میں گھریلو پن ہونا چاہئے۔ ایسے خطوط کا کوئی مجموعہ اب تک زیر نظر مجموعہ کے سوا مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ شہباز مرحوم کے وہ خطوط جو انہوں نے اپنی بیگم صاحبہ کو لکھے ہیں سراپا گھریلو ہیں۔ ان میں ان کی ادبی اور

شاعرانہ رعنائی تو موجود ہے مگر بڑے بے تکلف انداز میں۔ بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے خطوط میں کھل کھیلے ہیں۔ ان کی رومان پسندی ان کے ہر جملے سے ٹپکی پڑتی ہے۔ انہیں جو محبت بلکہ عشق اپنی بیگم سے تھا اس کا اظہار بڑی بے ساختگی اور والہانہ انداز سے ہوا ہے۔"

(مقدمہ "نامۂ شوق" مجموعۂ مکتوبات)

"مکتوباتِ شہباز" ان کے خطوط کا دوسرا مجموعہ ہے جس میں ۸؍فروری ۱۸۸۰ء سے ۸؍مئی ۱۹۰۶ء تک کے خطوط ہیں، ان میں نواب سیّد محمد آزاد کے نام خطوط کا غالب حصہ ہے۔ بقیہ صاحب زادۂ آزاد، ایک عزیز محمد یعقوب، عارف باللہ سیّد مظفر بلخی، مولوی سیّد افتخار عالم مارہروری اور حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کو لکھے گئے ۱۰۹؍خطوط شامل ہیں۔ اس بارے میں مرتبِ کتاب ڈاکٹر سیّد صابر حسن اپنے پیش لفظ میں لکھتے ہیں :

"افسوس اس بات کا ہے کہ شہباز کے خطوط کا معتد بہ حصہ ضائع ہو چکا ہے۔ ان کے تحریر کردہ تمام خطوط موجود ہوتے تو مکتوبات کی کئی ضخیم جلدیں تیار ہو جاتیں۔ انھیں خطوط نگاری کا ملکہ بھی تھا اور شوقِ بے پایاں بھی۔ ...... بہر حال جتنے خطوط موجود ہیں ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مکتوب نگاری کے فن کو انھوں نے نہایت سلیقے اور اہتمام سے برتا ہے۔"

جواں عمری میں ہی مظفر پور (بہار) میں دورانِ تعلیم عبدالغفور شہباز کا تعلق رئیس ڈھاکہ خان بہادر سیّد مہدی علی کے پوتوں نواب سیّد محمود آزاد اور نواب سیّد محمد آزاد سے ہو گیا اور یہ رشتہ ان کی وفات تک قائم رہا۔ شہباز اگر اپنے سے بڑے آزاد برادران کی صحبت سے مستفیض ہوئے تو شہباز کی غیر معمولی ذہانت و فطانت سے آزاد برادران بھی فیضیاب ہوئے۔ ڈاکٹر محمد اختر الحسن لکھتے ہیں :

"سیّد محمد آزاد کو ادبی شہرت و مقبولیت بخشنے میں شہباز کا بہت بڑا ہاتھ تھا ورنہ آزاد کا نام بھی بیشتر نامہ نگاروں، مضمون نگاروں اور شاعروں کی طرح "اودھ پنچ"

کے گورستان میں مدفون ہوتا اور آج ان کو جاننے والا شاید کوئی نہ ہوتا۔"

("عبدالغفور شہباز: حیات اور ادبی خدمات" ص:۵۴)

اس قول کی تائید شہباؔز کے ستمبر ۱۸۸۶ء کے خط بنام سیّد محمد آزاد سے بھی ہوتی ہے۔ خط ملاحظہ فرمائیں :

"احمد اور شاہد کا گرویدہ ہونا میری سحر بیانی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس عام شہرت کا جو آپ کو علی العموم اور ادبی دنیا میں حاصل ہے، علاقہ بہار میں کوئی انصاف پسند ایسا بھی ہے جس کو فقط آپ کے ادبی کمالات کا مسلسل طور پر تصور نہ ہو؟ ممکن ہے کہ کسی قدر مختصر احاطے میں اس شہرت کے پھیلنے میں میں نے بھی کسی قدر مدد دی ہو لیکن وہ اس قسم کی ہے جیسی کسی شہسوار کے آگے سے کوئی روڑے پتھر الگ کر دے۔" (مکتوباتِ شہباز ص:۸۳)

اس کے برعکس ان ہی کو ۲۱/اپریل ۱۸۹۲ء کو لکھے خط میں درج ہے:

"اگر میرے مضامین سے آپ کو مضامین لکھنے کی گدگدی پیدا ہو تو اس سے زیادہ کامیابی کوئی ہو نہیں سکتی۔ خصوصاً ظرافت انگیز مضامین کی۔ میں تو ظرافت سے اسی طرح نا آشنا ہوں جس طرح رحیم بخش درزی حسن و نزاکت سے۔ حق پوچھیے تو یہاں بھی جو کچھ ہے وہ آپ ہی کا ہے : جمالِ ہم نشیں در من اثر کرد وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم" (مکتوباتِ شہباز ص:۱۳۴)

لہٰذا ایک دوسرے کے لیے دونوں کی حیثیت تکملہ کی رہی۔ "مکتوباتِ شہباز" کے بعض خطوط سے شہباؔز کی پہلی شادی، بچوں کی ولادت اور یکے بعد دیگرے وفات نیز عقدِ ثانی کا ذکر بھی ملتا ہے۔ پہلی زوجہ شمس النساء کے ۱۸۹۱ء میں انتقال کے بعد ۱۱/برس شہباز نے تنہا گزارے اور ۱۹۰۲ء میں دوسرے عقد کی صورت دہلی میں پیدا ہوئی۔ ان دس گیارہ برسوں کے دوران وہ اورنگ آباد (دکن) میں پروفیسری کرتے رہے اور فاضل اوقات کو تصنیف و تالیف کو مشغلہ بنائے رکھا۔ ۱۵/مارچ ۱۹۰۲ء کو اپنے سمدھی اور دیرینہ رفیق سیّد محمد آزاد کے نام خط میں لکھتے ہیں :

''آپ کا دوسری مارچ کا مکرمت نامہ شرفِ ورود لایا۔ جواب عین وقت پر نہ جانے کا سبب یہ ہوا کہ یکا یک مولوی بشیر الدین احمد صاحب کا تار دہلی سے پہنچا کہ فوراً چلے آؤ۔ بہتر ہے کہ شادی میرے رہتے رہتے ہو جائے۔ غرض انھیں کے تار نے دہلی کھینچ بلایا ہے۔ تین چار روز سے دہلی میں ہوں۔ تمام مراتب طے ہو چکے ہیں۔ آج شام کو نکاح ہو جائے گا۔ دعا فرمایئے کہ خدا انجام اس کا بخیر کرے۔'' (مکتوباتِ شہباز ص:۱۷)

شہباز کی سب سے بڑی عظمت یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کا کوئی گوشہ بے نور نہیں رہنے دینا چاہتے۔ جو فنکارانہ دیانت داری ان کے یہاں ہے وہ شاذو نادر ہی کہیں اور نظر آتی ہے۔ انہوں نے کوئی شاعرانہ آہنگ نہیں اپنایا لیکن جمالیاتی حسیت کو جس سلیقہ سے پرویا ہے اس سے بسا اوقات شاعری بھی بے نیاز رہ جاتی ہے۔ ان کے مکتوب سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے زندگی نہ صرف گذاری بلکہ اسے خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش کی۔ اس کی عکاسی ان کے تمام مکتوبات سے ہوتی ہے۔

مجموعی طور پر مکاتیبِ شہباز رقعاتی انشاء کے عمدہ نمونے ہیں۔ رقعاتی انشاء کے بنیادی اوصاف یہ بتائے گئے ہیں کہ اس میں حفظ مراتب وفرق مراتب یعنی چھوٹے بڑے اور برابر والوں کا امتیاز ملحوظ رکھتے ہوئے معقول جملے، فقرے اور الفاظ کے استعمال پر عمل کئے جائیں جو اتنا دلچسپ ہو کہ توجہ مائل کر سکے اور معلومات میں بھی اضافہ کرے۔ شہباز نے ہر مرتبے اور سطح کے افراد کو خطوط لکھے اور رقعاتی انشاء کے گل بھی خوب کھلائے۔ اسلوب میں کہیں رجب علی بیگ سرور تو کہیں محمد حسین آزاد کے اسلوب کی چاشنی ملتی ہے تو کہیں سرسیّد، حالی وشبلی کی جھلک تو کہیں ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مکتوبات میں داخلیت اور ذاتی زندگی کا اظہار جیسا عبدالغفور شہباز کے یہاں ملتا ہے وہ دوسری جگہ خال خال ہی نظر آتا ہے جس سے مراسلہ نگار کی شخصیت اور اس کا باطن اپنے جملہ گوناگوں اوصاف کے ساتھ قاری کے سامنے آتا ہے۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے مکتوب نگاری کے ذریعہ بھی دامنِ اردو کو مالا مال کیا ہے۔

❖❖❖

پیش خدمت ہے کتب خانہ گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے 👇
https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
📱 0307-2128068
@Stranger ❤️❤️❤️❤️❤️❤️❤️

پروفیسر گوپی چند نارنگ: مابعد جدیدیت کے سالار

پروفیسر گوپی چند نارنگ اردو ادب کی ایک ایسی شخصیت ہیں جن کو لسانیات اور تنقید دونوں پر قدرت حاصل ہے۔اردو تنقید نگاری میں اتنی بڑی ہمہ جہت شخصیت بہت کم نظر آتی ہے۔نارنگ صاحب نے اسی تہذیب کو اپنا ذریعۂ اظہار بنایا۔ان کی شخصیت میں جتنے بھی رنگ ہیں ان میں اسی کا انعکاس ہے۔باوجودیکہ اردو ان کی مادری نہیں بلکہ اکتسابی زبان ہے مگر اردو سے والہانہ عشق نے انہیں اردو تہذیب و تاریخ کا جزو لاینفک بنادیا۔انہوں نے کبھی اردو میں کوئی اجنبیت محسوس نہیں کی اور نہ ہی ہندی اردو میں کسی غیریت کا احساس کیا۔اردو میں خصوصی طور پر تنقید کا دائرہ محدود تھا اور تاریخی پس منظر میں اسے دیکھنے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔میں یہاں پر ذکر کرتا چلوں کہ بہت ساری غلط فہمیوں اور متعصبانہ رویوں سے اردو زبان کو نہ صرف پیچھے کرنے کی سازش رچی گئی بلکہ اس کی اصل نوعیت اور اس کی توانائی کو کسی محدود دائرے میں قید کر کے دیکھنے کی وجہ سے نقصان ہوا۔یہ سچ ہے کہ اردو زبان دربار کی زبان نہیں رہی لیکن اس کے اندر ایسی خوبیاں تھیں کہ اسے اپنانے میں لوگ عافیت سمجھتے تھے۔ہر آدمی یہ جانتا ہے کہ یہ ہندوستان اور برصغیر کی سب سے پیاری زبان ہے اور اسے اپنانے میں لوگوں کو کوئی دشواری محسوس نہیں ہوتی۔یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو ہندوستان میں پلی بڑھی اور وقت اور حالات کے ساتھ اس نے ضرورتوں کے ساتھ اور حالات کے تقاضوں کے مطابق خود میں بے پناہ کشادگی پیدا کی اور اپنا رشتہ عربی اور فارسی کے ساتھ دیگر ہندوستانی زبانوں سے بھی استوار کیا۔ایک ایسا مستحکم رشتہ کہ اس کے عناصرِ ترکیبی سے ہندوستانی عناصر کو الگ کیا ہی نہیں جاسکتا۔اس لئے پروفیسر نارنگ نے فارسی رسم الخط کی بنیاد پر اردو کے بدیسی ہونے کے الزام کو سختی سے مسترد کیا اور ثابت کیا کہ ہندی اور اردو میں اٹوٹ رشتہ ہے:

”............جتنا اشتراک اردو اور ہندی کی لفظیات Lexicon، صرفیات Morphology اور نحویات Syntax میں پایا جاتا ہے، شاید ہی دنیا کی کسی دو زبانوں میں پایا جاتا ہو۔ اردو کی تقریباً چالیس آوازوں میں صرف چھ ایسی ہیں جو فارسی و عربی سے لی گئی ہیں باقی سب کی سب ہندی اور اردو میں مشترک ہیں خاص طور سے ہکار Aspirated آوازیں، پھ، بھ، چھ، جھ، تھ، دھ، کھ، گھ اپنے سادہ روپ کے ساتھ پورے سٹ کے حیثیت سے ہندی اور اردو میں موجود ہیں۔ اسی طرح معکوسی Retroflex آوازیں یعنی ٹ، ڈ، ڑ، اور ان کے ہکار روپ ٹھ، ڈھ، ڑھ بھی ہندی اور اردو میں مشترک ہیں۔ یہ چودہ آوازیں اردو کا رشتہ پراکرتوں سے جوڑتی ہیں اور یہ نہ عربی میں ہیں نہ فارسی میں، گویا گنتی کی چند آوازوں کو چھوڑ کر اردو اور ہندی کے مصمتوں کا ڈھانچہ تقریباً ایک جیسا ہے۔ مصوتوں Vowels میں تو اشتراک اس سے بھی زیادہ ہے۔ یعنی صوتی ہم آہنگی سو فیصد ہے۔“

(بحوالہ: دیدہ ور نقاد: گوپی چند نارنگ، مرتب: ڈاکٹر شہزاد انجم، ص: ۲۶۳)

اس طرح صدیوں پر محیط ہندو مسلم کے اختلاط سے جو نئی ہندوستانی تہذیب ابھری اس نے اردو کو جنم دیا جس نے عربی فارسی عناصر کی تہنید کی، انہیں ہندوستانی مزاج کی خراد پر اتارا جس کے نتیجہ میں رسم الخط کی اردوانے کے عمل کے دوران اتنی کایا پلٹ ہو چکی ہے کہ نہ صرف یہ اپنے اصل سے کوسوں دور ہو چکی ہے بلکہ اس میں ایسی علامتوں کا اضافہ بھی ہو چکا ہے جو نہ عربی میں ہیں نہ فارسی میں اور یوں رسم الخط کے اعتبار سے بھی اردو خالص ہندوستانی تہذیب کی عکاس ہے۔ یہ رسم الخط اردو کا اپنا ہے جو ہندوستانی زبانوں کے اپنے اپنے رسم الخط کی طرح ہے۔ اسی بنیاد پر پروفیسر نارنگ اردو رسم الخط کی تبدیلی کے بھی سخت مخالف ہیں کہ اس کی تبدیلی سے اردو کا حسن، اس کی دلکشی، اس کی مقناطیسی قوت ضائع ہو جائے گی۔

اسی طرح انہوں نے ”ادبی تنقید اور اسلوبیات، اسلوبیات میرؔ، سانحۂ کربلا، شعری استعارہ،

قاری اساس تنقید، ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات'' جیسی تصنیفات کے ذریعہ فلسفہ ہائے ادب کی جس جامع آگہی اور تنقید کا جو نیا زاویہ نظر ترتیب دیا وہ حالی کے ''مقدمہ شعرو شاعری'' کے ایک صدی بعد اردو میں ادبی تھیوری کا Turning point ہے۔ جس کی وجہ سے اردو ادب کو ایک نئی توانائی ملی ہے۔ ترقی پسندی اور جدیدیت کے مقابلے میں تخلیق کار کے سامنے مناظر اور روایتوں سے بھرپور ایسی تخلیقی فضا آ گئی ہے جس میں تخلیقات کو ندرت و تنوع اور نئے اسالیب کو زندگی مل رہی ہے۔ تفہیم کی نئی دنیائیں سامنے آ رہی ہیں۔

یوں تو وقت کے ساتھ سماج کا بدلنا یا سماج کے ساتھ حالات کا بدلنا ایک ایسا عمل ہے جس کے بارے میں سائنس بھی شفافیت سے کچھ بیان کرنے سے قاصر ہے۔ ادب میں بھی وقت کا اہم رول ہوتا ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل کچھ اس طرح ایک دوسرے سے مدغم ہونے لگتے ہیں کہ اس کے اثر سے انسانی فکر کی رَو کچھ ایسے کارنامے انجام دینے لگتی ہے جسے کبھی تحریک، کبھی انقلاب ،کبھی تبدیلی، کبھی رجحان کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ فطری عمل ہے۔ یہ الگ سی بات ہے کہ فطری عمل شعوری عمل اس وقت ہو جاتا ہے جب اسی رجحان کی بساط پر کچھ مہرے شہ کو مات دینے لگتے ہیں۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ دنیا میں جتنے بھی ازم آئے اس میں شعوری کوشش تو بعد میں کی گئی لیکن فطری عمل پہلے ہوا اور یہ تغیر پذیر لمحوں کا Stretch اپنے اندر حال، ماضی اور مستقبل کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔

اردو ادب میں بھی تین ایسے تغیرات تخلیقی سطح پر دیکھے گئے جنہیں مختلف ناموں سے نوازا گیا چوں کہ ہر زمانہ میں رجحانات، تغیرات کے سبب اپنی شکل اختیار کرنے لگتے ہیں اس لئے وہ شخص جو تغیر کو گرفت میں لے کر نئے رجحان کو آگے بڑھاتا ہے اسے اس کا بانی مان لیا جاتا ہے۔

جدیدیت کے امام شمس الرحمٰن فاروقی نے ایک Established اصول کو جو کل تک تحریک کی شکل میں سکہ جمائے ہوئے تھے اسے یک لخت خارج کر دیا اور نئی راہ متعین کرنے کے لئے کچھ ایسی سمتیں متعین کیں جس سے وقت کے تقاضے پورے ہو رہے تھے۔ یہ الگ سی بات ہے کہ جب کوئی نیا رجحان سامنے آتا ہے، جب کوئی تبدیلی کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تو سیلاب میں

خس وخاشاک بھی آجاتے ہیں، محض اس بناء پراس رجحان کورد نہیں کیا جاسکتا۔ وقت کا تقاضہ پرانی قدروں کو دھیرے دھیرے مسمار کر کے نئی قدروں کو Establish کر دیتا ہے۔ جدیدیت کے دور میں یہ بات سامنے آئی اور جب یہ اپنے نقطۂ عروج تک پہنچنے کے قریب ہوئی تو اس میں شدت پسندوں کا عنصر غالب ہونے لگا اور یہی اس کے زوال کا سبب بھی بن گیا۔

اس کے بعد ایک نئے رجحان کے آمد کی دھمک محسوس ہونے لگی اور اس میں ماقبل رجحان کی طرح پیچیدگیاں، گنجلک خیالات اور ابہام کی کیفیت شروع ہوئی، حالانکہ وہ تار جو ماضی، حال اور مستقبل کو جوڑتا رہتا ہے وہ سمٹنے لگا اور سمٹ کر ایک نئے رجحان میں تبدیل ہوا، جسے بعد میں مابعد جدیدیت کا نام دیا گیا اور جس کے سالار پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اس کو فروغ دینا شروع کیا۔ مابعد جدیدیت کے خدوخال، عکس در عکس، رنگ، نور، جمال، ماورائیت کا کہر سب کچھ سمٹنے لگا اور ایک نئی دنیا کی سیر کے لئے ادب میں تجربے ہونے لگے۔ کامیاب تجربے ہوئے اور آج مابعد جدیدیت اپنی شناخت قائم کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہے۔

اردو میں مابعد جدیدیت رجحان اور پس ساختیات کی تھیوری پروفیسر گوپی چند نارنگ کی خودساختہ نہیں ہے بلکہ بین الاقوامی سطح پر پیدا ہونے والے حالات خصوصی طور پر دوسری عالمی جنگ کے بعد کی روشن خیالی اور سائنسی آگہی نے جو نئے راستے ہموار کئے تھے اس سے نئی سوچ نے جنم لیا۔ یہ الگ سی بات ہے کہ اس آگہی نے سہولیات کے دروازے کھول دیئے، دقیانوسیت کا پردہ فاش کردیا اور روایتی طرز زندگی کو یکسر بدل دیا۔ اس کی بنیاد پر ایک نیا معاشرہ نئی سوچ کے ساتھ ابھرا لیکن مسائل کی گتھیاں جتنی سلجھیں اس سے زیادہ الجھیں۔ نارنگ صاحب نے اس بات کی وضاحت پورے تاریخی پس منظر میں بہت ہی وسیع النظری سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ پس ساختیات کو بھی انہوں نے تھیوری کا نام دیا ہے اور اس کی فلسفیانہ اساس پر رائے دیتے ہوئے یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ اس کی فلسفیانہ اساس کی موجودگی کے باوجود اس کی تشریحات اور وسعت میں کچھ نہ کچھ کمی کا احساس ہوتا ہے۔ اردو میں مابعد جدیدیت یورپ کی طرح روشن خیالی کی بنیاد پر نہیں ابھرا بلکہ یہ جدیدیت کے ردعمل میں ابھرا کیونکہ روشن خیالی اور ردعمل میں جو فاصلے

ہوتے ہیں اس کی موجودگی کے سبب اسے اتنی وسعت نہیں ملی جتنی ملنی چاہیے تھی۔ لہٰذا وہ مابعد جدیدیت کے علمبردار بن کر ابھرے۔ یقیناً مابعد جدیدیت نے جدیدیت کی اس آلودگی کو روک دیا اور ادب میں ایک متوازن فکری اور اظہاری سمت کو جنم دیا۔ اس سے اردو ادب کو بے پناہ فائدہ ہوا۔ قاری سے رشتہ جڑا اور لغویات سے بچنے کی صورت نکلی اور اس کی پہچان اور شناخت کرنے کا عمل اور رویہ جو گوپی چند نارنگ نے اپنایا اسے اردو تاریخ میں اور تنقیدی رویے میں میل کا پتھر تسلیم کیا گیا۔ اس لئے گوپی چند نارنگ ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جس نے بین الاقوامی سطح پر لسانی اور ادبی تغیرات کو اردو میں پیش کر کے اردو کا دامن نہ صرف کشادہ کیا بلکہ اس کے خزانے کو مالا مال کر دیا۔ اسی لئے ان کو اس دور کا معمارِ ادب مانا جاتا ہے۔ انھوں نے اردو ادب کو نئی صورت میں پھلنے پھولنے کا موقع دیا اور خود ادبی حلقہ میں اگر بیشتر ادیبوں اور شاعروں سے پوچھا جائے تو وہ بتائیں گے کہ ردعمل سے جو جدیدیت نے نئی آلودگی پیدا کی تھی اس سے حبس کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی اور تازہ کار ادبی تخلیق میں بے پناہ رکاوٹیں پیدا ہو رہی تھیں۔ جدیدیت کی جکڑ بندیوں کے بعد موصوف نے ایک Relaxation کا پہلو عطا کر دیا جہاں آزادئ اظہار اور روشن خیالی کی گوناگوں خوبیوں سے استفادہ کے لئے فنکار متحرک ہوگئے۔ اس طرح ادب میں تازہ دم ہو کر تازگی اور شگفتگی پھر سے پیدا ہوگئی۔ میں اپنی بات اس قطعہ پر سمیٹتا ہوں:

نارنگ عہد ساز ہیں، رجحان ساز ہیں
اردو ادب میں لائے ہیں 'بعدِ جدیدیت'
جو آپ عہدِ نو کے تغیر نواز ہیں
ان سے نیا زمانہ، زمانے سے یہ نہیں

❖❖❖

پیش خدمت ہے کتب خانہ گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے
https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
0307-2128068
@Stranger

''شاہ مقبول احمد: حیات وخدمات'': جائزہ

پروفیسر شاہ مقبول احمد کی نجابت، شرافت اور متانت موروثی تھی کہ بہار کے خانوادۂ حضرت مخدوم شاہ یحییٰ منیریؒ سے نسبت رکھتے تھے۔ بہار کے آب و گل میں ابتدائی ساڑھے سترہ سال گذارے، پروان چڑھے۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے کلکتہ گئے تو بقیہ ساڑھے چھیاسٹھ سالہ زندگی کو کلکتہ کے آب و گل میں ہی رچا بسا کر گل گلزار بنایا اور یہیں سپردِ خاک ہوئے۔ مولانا آزاد کالج اور کلکتہ یونیورسٹی میں ۳۷ سال تدریسی خدمات انجام دیں، کئی نسلوں کی علمی پیاس بجھائی اور ایسی ذہنی آبیاری کی کہ بعضے صاحبِ علم و کمال ہوئے۔ اپنے فکر و قلم کا جوہر دکھایا تو اردو ادب مالا مال ہوا اور اردو لسانیات کے کچھ ایسے گوشے منور کئے، جو عام نظروں سے اوجھل تھے۔ یوں اپنی تدریسی خدمات سے درجۂ احترام اور فکر و قلم سے علمی دنیا میں اپنا اعتبار قائم کیا۔ اس کے باوجود ان کی خدمات کی قدردانی اتنی نہ ہو سکی جس کے یہ مستحق تھے۔ اس کی ایک وجہ بقول سالک لکھنوی یہ تھی کہ:

''ان کی خاموش و قانع طبیعت اپنا ڈھنڈورا نہ پٹوا سکی۔ شاید خاندانی روایات، فطری شرافت اور وقار نے اس کی اجازت نہیں دی۔''

دوسری وجہ قیصر شمیم صاحب نے یہ بتائی ہے:

''پروفیسر موصوف کے زمانے میں علاقائی یا حلقہ داری حد بندیوں سے نکل کر کام کرنے والے انصاف پسند ناقدین کا (کلکتہ میں) فقدان تھا۔'' (دیباچہ کتاب ہٰذا)

اس حد بندی کو ڈاکٹر شفیع الرحمٰن نے توڑا اور شاہ مقبول احمد مرحوم کی حیات و خدمات کو موضوع بنا کر تحقیقی مقالہ رقم کیا۔ اس پر انہیں کلکتہ یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملی۔ یہ کتاب اسی مقالہ کی تلخیص ہے۔

شاہ صاحب کو جو علمی گہرائی و گیرائی، تحقیقی و تنقیدی بصیرت اور تخلیقی جودت ودیعت تھی،

مقام افسوس ہے کہ ان کا خاطر خواہ وہ اظہار نہ کر سکے۔ انہوں نے خود اپنی نگارشات کے تین مجموعے (۱) چند ادبی مسائل (۱۹۶۴ء)، (۲) پانچ افسانے اور انشائیے (۱۹۸۰ء)، (۳) تشریحات و اشارات (۱۹۸۶ء) کے نام سے شائع کیے۔ ان کی وفات کے بعد جس نوع کی بھی ان کی نگارشات دستیاب ہو سکیں انہیں اشرف احمد جعفری نے مرتب کیا، یوں (۴) مجموعہ ''شخصیات و تاثرات'' کے نام سے ۲۰۰۲ء میں منظر عام پر آیا لیکن یہ جو کچھ بھی ہے بلحاظِ کیفیت شاہ صاحب کی قد آوری پر دال ہے۔ ان کے جو شعری نمونے منظر عام پر آئے وہ بھی موصوف کے ستھرے شعری مذاق کی غمازی کرتے ہیں مگر شاعری ہو یا افسانہ نگاری، پتہ نہیں کیوں؟ انہوں نے اپنے تخلیقی جوہر کو کھل کھیلنے نہیں دیا۔ پھر بھی جو نقش ہائے جمیل سامنے آئے ہیں ان کے حوالے سے ڈاکٹر شفیع الرحمٰن نے شاہ صاحب کی گراں مائیگی اور قد آوری کو اجاگر کرنے کی سعی کی ہے۔

پیش نظر تصنیف میں ڈاکٹر موصوف نے خاندانی پس منظر میں پیدائش و جائے پیدائش، مرحلۂ تعلیم، ملازمت، ازدواج و اولاد، شکل و شباہت، وضع قطع، اخلاق و کردار، تلمذ و تلامذہ، اندازِ تدریس، خویش و اقارب و معاصرین سے روابط کے حوالے سے شاہ صاحب کی شخصیت کو جس طرح پہلے باب میں نمایاں کیا ہے وہ باور کراتا ہے کہ مصنف نے مرحلۂ تحقیق میں اپنا پتہ پانی کیا ہے۔ لہٰذا بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ اس سے جو شخصیت ابھرتی ہے وہ ایسی دلآویز ہے کہ ان جیسی صالح اقدار کی پاسدار شخصیت اب نایاب ہے۔

دوسرے باب میں، شاہ صاحب کی جملہ نگارشات کا بعنوانات: افسانے، انشائیے، تنقید، مضامین، خطوط اور پیش لفظ، دیباچے، تقاریظ، باعتبارِ فن، صنف اور موضوع، جائزہ لیا ہے اور ہر نوع تحریر کی معنویت و افادیت روشن کر کے صاحب تحریر کی اہمیت واضح کی ہے۔ افسانہ نگاری کی بابت بتایا ہے کہ شاہ صاحب کے چند ہی افسانے منظر عام پر آئے مگر جو ہیں، باعتبار فکر و فن اور وقت و مقام ان کی اساسی اہمیت ہے۔ انہوں نے ۱۹۴۰ء سے افسانہ نگاری شروع کی۔ یوں مغربی بنگال کے دورِ اوّل کے افسانہ نگار ہیں۔ مستند حوالوں سے واضح کیا ہے کہ جب بنگال میں اردو افسانہ نگاری رومانوی فکر کی اساس پر پروان چڑھ رہی تھی اس وقت شاہ صاحب نے اپنے افسانوں

میں ترقی پسند فکر کو راہ دی اور مغربی بنگال میں ترقی پسند اردو افسانہ نگاری کی نیو ڈالی۔ پہلے مجموعہ کے افسانے ۱۹۴۰ء تا ۱۹۴۵ء کے نوشتہ ہیں۔ اس مجموعہ میں شامل افسانہ ''زیور'' کی اہم خصوصیت یہ بتائی ہے کہ اس میں بہار کے مگہی علاقے کے شرفاء و عام لوگوں کے گھروں میں بولی جانے والی زبان کو برت کر صرف زبان ہی نہیں ان کی تہذیب کو بھی محفوظ کر دیا ہے تاکہ آنے والی نسلیں اس علاقے کی لسانی، تہذیبی اور ثقافتی وراثت سے آگاہ ہوسکیں۔ تمام افسانوں کا فنی، فکری اور اسلوبیاتی جائزہ لیا ہے۔ ان کے موضوعات کی اہمیت افسانوں کے زمانی و مکانی تناظر میں نمایاں کی ہے۔ ان کے شستہ، شگفتہ و برجستہ اسلوب کو مقبولیت کی وجہ بتائی ہے اور انہیں پریم چند، رتن ناتھ سرشار اور علی عباس حسینی سے متاثر بتایا ہے۔ انشائیہ کے اسلوب کو رشید احمد صدیقی سے متاثر ٹھہرایا ہے جس کا وصف یہ ہے کہ ''طنز، شوخی اور نکتہ آفرینی مل کر ان کی متوازن ظرافت کو ایک رچی ہوئی شگفتگی عطا کرتی ہے۔'' اس باب کا اہم وصف یہ ہے کہ اس میں شاہ صاحب کی تنقیدی بصیرت سے زیادہ تحقیقی بصیرت جلوہ گر ہوئی ہے، لسانیات سے گہری وابستگی نمایاں ہوئی ہے، بہار کی بولی ٹھولی کو اردو لسانیات کا درجہ دینے کی کوشش کو وقعت ملی ہے اور شاہ صاحب کی شخصیت شناسی کا ملکہ سامنے آیا ہے۔ اس طرح بقول قیصر شمیم:

> ''ان کی (شاہ صاحب) چاروں کتابوں کی نگارشات میں سے ایک ایک کا بھرپور جائزہ لیتے ہوئے ہر تحریر کی اہمیت اجاگر کرنے کی اچھی کوشش کی گئی ہے۔ جس سے یہ باب پروفیسر شاہ مقبول احمد کی ادبی شناس نامے کا دیباچہ بن گیا ہے۔''
>
> (چند سطور ص: ۷)

شاہ صاحب کا قول ہے کہ سخن سنجی کا سوتا ثانوی تعلیم کے دوران عنفوانِ شباب میں ہی پھوٹا کہ طبع موزوں پایا تھا۔ پھر تخلیقی اظہار کو جلا بخشنے کیلئے علامہ وحشت کلکتوی سے شرفِ تلمذ حاصل کیا اس کے باوجود ان کی شعری کائنات بھی افسانوی کائنات کی ہی مثل ہے جبکہ شاہ صاحب کا تقریباً پورا دور جو کلکتہ میں گذرا، اس میں شعری بزم آرائیوں کی بہار تھی اور کلکتہ میں زمزمہ سنجوں کی ایسی گہما گہمی تھی کہ اس کی نظیر اردو شاعری کی تاریخ میں کہیں اور نہیں ملتی۔ ایسے سخن پرور اور دلکش ماحول

میں شاہ صاحب کی طبع موزوں خوابیدہ رہی، حیرت ہوتی ہے کہ ان کی کل پندرہ غزلیں، چار نظمیں اور ایک قطعہ ہی دستیاب ہوئے۔ پھر بھی جو کچھ ہے اس نے شاہ صاحب کی شاعرانہ حیثیت ضرور قائم کردی ہے۔ اس کا اعتراف ان کے ہمعصروں نے بھی کیا ہے۔ بزرگ شاعر و ادیب علقمہ شبلی رقمطراز ہیں:

''اپنی اہلیہ کی وفات پر انہوں نے جو نظمیں لکھیں، وہ ان کی دلی جذبات واحساسات کی آئینہ دار تو ہیں ہی، ساتھ ہی ساتھ ان کی ادبی اہمیت سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا۔''

لہٰذا آخری باب میں مصنف نے غزلوں اور نظموں کے حوالے سے شاہ صاحب کی قادرالکلامی ثابت کی ہے۔

اس طور، اس تصنیف میں شاہ صاحب کی شخصیت اور کارنامے بخوبی اجاگر ہوئے ہیں مگر شاعری اور افسانے کے حوالے سے تخلیق کار، دیگر نگارشات کے حوالے سے صاحب اسلوب انشاپرداز، محقق اور ماہرِ لسانیات، وہ جتنا ابھر کر سامنے آئے ہیں اتنا ان کا تنقیدی اسلوب کھل کر سامنے نہیں آیا، جبکہ شاہ صاحب کی تخلیقات کے مقابلے میں تنقیدی نگارشات کا پلڑا بھاری ہے۔ یہ پہلو اس میں تشنہ لگتا ہے۔ اس لئے کہ مصنف نے ان کے نوشتہ دیباچے، پیش لفظ، تقاریظ اور تنقیدی مضامین کے جائزے میں تعارفی انداز اختیار کیا ہے اور یہ تعارفی پہلو کہیں کہیں تکرار بیانی کو بھی راہ دے گیا ہے۔ جس دور میں شاہ صاحب نے تنقیدی مضامین سپردِ قلم کئے وہ بنگال میں اردو تنقید نگاری کا دورِ اولیں تھا۔ اگر شاہ صاحب کے جملہ تنقیدی نگارشات کا کماحقہٗ تجزیہ کیا جاتا تو ان کے تنقیدی اسلوب کے ساتھ بنگال میں اردو تنقید نگاری کا پس منظر بھی واضح ہو جاتا اور اس تصنیف کی افادیت دوچند ہو جاتی۔ پھر بھی اس تصنیف میں ڈاکٹر شفیع الرحمٰن کی تحقیقی بصیرت جس طرح بروئے کار آئی ہے وہ داد کی مستحق ہے۔ اِن کی یہ کاوش ''مقبول شناسی'' کی راہ استوار کرنے میں کامیاب ہے اور اس ضمن میں حوالہ جاتی اہمیت کی حامل ہے۔ اس لئے یہ پذیرائی کی مستحق ہے۔

❖❖❖

پیش خدمت ہے کتب خانہ گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے 👇
https://www.facebook.com/groups
/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
0307-2128068 📱
@Stranger ❣️❣️❣️❣️❣️❣️❣️

ڈاکٹر محمد اسلم پرویز: اردو اور سائنس کے نکتہ شناس

ڈاکٹر محمد اسلم پرویز تخلیقی عمل کے اعجاز سے مختلف الجہات معانی کے باترسیل امکانات سے سرفراز کرنے والے قلم کار کا نام ہے۔ان کی تحریریں نامیاتی وحدت اور تجسیم کاری کے معیار پر پوری اترتی ہیں۔اردو میں عام طور پر جمالیاتی سرشاری کا تجربہ فراہم کیا جاتا ہے لیکن جناب اسلم پرویز نے نباتاتی لب ولہجہ کا انوکھا بانکپن عطا کیا ہے۔متنوع اور مصور تلاذات کا ایک سرچشمہ ہے جوان کی تحریریں میں بہتا نظر آتا ہے۔سائنسی اور قرآنی طرحِ نو کی دریافت کی کوشش ان کی اہم خصوصیت ہے۔جہاں تک ان کی تقریر کی بات ہے،وہ بلند آہنگ لہجہ اختیار نہیں کرتے بلکہ زیر لبی سے کام لیتے ہیں جو فطرت کی آواز سے ہم آہنگ ہے۔

اردو میں سائنسی موضوعات پر جن قلم کاروں کی تخلیقات معتبر مانی جاتی ہیں،ان میں ڈاکٹر محمد اسلم پرویز کا نام نمایاں ہے۔موصوف کی شناخت ایک ماہرِ نباتات کے طور پر بھی ہے جس نے تسلسل سے عام فہم زبان میں سائنس کی گتھیوں کو سلجھا کر روشن باب کھولے ہیں،جن میں شناخت کے عوامل ہیں اور تخلیقی،تحقیقی اور فکری رویے ہیں۔ان کے موضوعات متنوع ہوتے ہیں۔فضائی کثافت،آبی کثافت،خوراک کا مسئلہ،بڑھتی ہوئی آبادی پر روک،پٹرول اور جنگلات جیسے اہم موضوعات کے ساتھ سورج،توانائی،چاند،ستارے اور ان جیسے آشناو ناآشنا موضوعات پر انھوں نے مضامین اور کتابیں لکھی ہیں جن سے عام انسانوں کو روزانہ واسطہ پڑتا ہے۔وہ بوٹانی (نباتات) کے استاد رہے ہیں لیکن اردو میں لکھ کر سرمایۂ علم وادب میں اضافہ بھی کرتے رہے ہیں۔ڈاکٹر شفیع ایوب (جواہر لعل نہرو یونیورسٹی،نئی دہلی) اپنے مضمون ”معیاری تعلیم کے لئے ڈاکٹر اسلم پرویز کی کاوشوں کو سلام“ میں موصوف کے علمی نظریے کا احاطہ کچھ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

”......ڈاکٹر اسلم پرویز نہ صرف تعلیم کی ضرورت پر زور دیتے ہیں بلکہ معیاری

تعلیم کی وکالت کرتے ہیں۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے، وہ دنیا کے مختلف ممالک کا تعلیمی دورہ کر چکے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ آدھی ادھوری جانکاری کے ساتھ حاصل کی گئی ڈگری کی آج کے زمانے میں کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ ڈگری کے ساتھ آپ کی علمی قابلیت بھی اعلیٰ درجے کی ہونی چاہیے۔ پھر آپ تعصب کا رونا نہیں روتے پھریں گے۔''

(مطبوعہ روزنامہ ''اخبارِ مشرق'' کولکاتا مورخہ ۱۷رجون ۲۰۱۹ء)

ڈاکٹر محمد اسلم پرویز نومبر ۱۹۸۲ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ نباتات سے وابستہ ہوئے جہاں انھوں نے تدریسی خدمات انجام دیں۔ پھر ذاکر حسین کالج، دہلی سے وابستہ ہوئے جہاں ۲۲رسال شعبے میں وہ استاد رہے۔ اپریل ۲۰۰۵ء میں اسی کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے اور اپنی تدریسی و انتظامی زندگی کا بڑا حصہ یہاں گزارتے ہوئے اکتوبر ۲۰۱۵ء میں اس وقت یہاں سے علیحدگی اختیار کی جب انھیں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (حیدر آباد) کے شیخ الجامعہ کے عہدۂ جلیلہ پر فائز کیا گیا۔ ۲۰راکتوبر ۲۰۱۵ء کو انھوں نے اس عہدے کا چارج لیا۔ واضح ہو کہ موصوف مارچ ۱۹۹۸ء تا جون ۱۹۹۹ء مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے دہلی ریجنل سینٹر میں تاسیسی ریجنل ڈائریکٹر بھی رہ چکے تھے۔ اس دوران دیگر علمی و سماجی خدمات سے بھی ان کی وابستگی رہی۔ ۱۹۹۴ء میں وہ 'اسلامک فاؤنڈیشن فار سائنس اینڈ انوائرنمنٹ' سے تعلیمی/ ماحولیاتی رضاکار کے طور پر وابستہ ہوئے۔ جون ۲۰۱۳ء میں انھوں نے 'بیسنا قرآنک ایجوکیشن ٹرسٹ' کی بنیاد ڈالی اور اب بھی بحیثیت ڈائریکٹر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ قرآن، سائنس اور ماحولیات کے تعلق سے وہ ہمیشہ سے سرگرمِ عمل رہے ہیں اور دنیا کے بہت سے ممالک میں اس موضوع پر خطاب بھی کر چکے ہیں۔

سائنسی مضامین پر مشتمل ان کی تین کتابیں ''سائنس کی باتیں''، ''سائنس نامہ'' اور ''سائنس پارے'' شائع ہو کر ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل کر چکی ہیں۔ قرآن اور علم کے رشتے کو اجاگر کرنے والی ان کی کتاب ''قرآن، مسلمان اور سائنس'' کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں نیز اس کا ترجمہ کئی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر محمد اسلم پرویز کی سائنسی مضامین میں دلچسپی کے حوالے

سے معروف صحافی سہیل انجم نے لکھا ہے :

"......انھوں نے پرانی کتابوں کے مارکیٹ سے اردو میں ترجمہ شدہ روسی کتابیں جو کہ میر پبلی کیشن سے شائع ہوتی تھیں، خرید کر پڑھنا شروع کیا۔ لیکن ان کو ترجمہ شدہ کتابوں میں کوئی لطف نہیں آتا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اوریجنل چیزیں پڑھنے کو ملیں۔ اسی درمیان انھوں نے سائنس پر مضمون نگاری شروع کی اور ان کا پہلا اردو مضمون ۱۹۸۲ء میں "قومی آواز" میں شائع ہوا۔"

("ماہنامہ سائنس کی سلور جبلی" مطبوعہ "تمثیل نو" شمارہ جولائی ۲۰۱۷ء- جون ۲۰۱۸ء ص: ۲۵۸)

۱۹۹۲ء میں موصوف نے "انجمن فروغِ سائنس" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا اور اسی کے تحت ان کی ادارت میں اردو ماہنامہ "سائنس" (اجراء: فروری ۱۹۹۴ء) شائع ہو رہا ہے۔ اس ماہنامہ کے ۲۳ رسال (۱۹۹۴ء-۲۰۱۷ء) کے تمام شماروں کے مشمولات کا اشاریہ ڈاکٹر محمد کاظم (شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی) نے ۲۰۱۷ء میں ترتیب دیا ہے۔

ان کی کتاب "سائنس پارے" پر نوبل انعام یافتہ سائنس داں پروفیسر عبدالسلام نے اپنی رائے اس طرح دی ہے :

"اردو میں سائنسی لٹریچر کی فراہمی اس برصغیر کا ایک اہم مسئلہ ہے۔...... مجھے بے حد خوشی ہے کہ ڈاکٹر محمد اسلم پرویز اردو میں عام فہم سائنسی مضامین نہ صرف یہ کہ پابندی سے لکھ رہے ہیں، بلکہ ان کی تحریروں نے سائنس کے تقریباً سبھی جدید موضوعات کا احاطہ کیا ہے۔ بلا تامل یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں سائنسی صحافت کو از سرِ نو زندہ کرنے میں اس نوجوان نے اہم کردار ادا کیا ہے۔......"

ڈاکٹر خلیق انجم (سابق جنرل سکریٹری، انجمن ترقی اردو ہند) ڈاکٹر محمد اسلم پرویز کی کتاب "سائنس کی باتیں" پر رائے دیتے ہوئے رقم طراز ہیں :

"......اردو والوں میں سائنس کے مختلف شعبوں میں ماہرین کی تعداد بہت کم ہے اور جو ہیں وہ اپنی مادری زبان، اردو کی طرف سے احساسِ کم تری میں کچھ ایسے

مبتلا ہیں کہ اردو میں نہیں بلکہ انگریزی میں لکھنا پسند کرتے ہیں۔......اردو زبان میں اسلم صاحب جیسے ذہین، محنتی اور باصلاحیت نوجوان کی آمد پر ہمیں لال قالین بچھا کر ان کا استقبال کرنا چاہئے۔''

ڈاکٹر محمد اسلم پرویز کے وائس چانسلر بننے پر جناب شاہد صدیقی (ایڈیٹر ''نئی دنیا'' دہلی) لکھتے ہیں :

''......حیدرآباد میں قائم اردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدہ پر ایک قابلِ اردو اور ملت کی ہمدرد شخصیت کا تقرر عمل میں لایا گیا ہے جو یونیورسٹی کے لئے بہت کچھ کر سکتے ہیں کیونکہ اردو ذریعۂ تعلیم کے مقاصد کے ساتھ قائم کی گئی یونیورسٹی کو ایک ایسی شخصیت دی گئی جو اردو داں بھی ہے اور اردو کی ترویج و اشاعت کے لئے ان کا شاندار ریکارڈ موجود ہے۔......''

(''گواہ'' اردو ویکلی حیدرآباد ۳۰/اکتوبر-۵/نومبر ۲۰۱۵ء)

معروف طنز و مزاح نگار ڈاکٹر عابد معز (حیدرآباد) نے ان کی تقرری پر اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے :

''......ڈاکٹر اسلم پرویز اعلیٰ ظرف انسان ہیں۔ ایسے اردو والے نہیں جو اردو کی روٹی کھا کر اسے نقصان پہنچا رہے ہیں بلکہ اردو کی خدمت کر کے خود نقصان اٹھا لیتے ہیں۔'' (ایضاً)

ڈاکٹر سیّد فاضل حسین پرویز مدیر ''گواہ'' حیدرآباد کا ماننا ہے :

''......چوں کہ سائنس کے اہم ترین شعبہ سے ان (ڈاکٹر محمد اسلم پرویز) کا تعلق ہے، اس لئے حقیقت پسندی ایسے افراد کی پہچان ہوتی ہے۔ حیات بخش 'سنجیونی' کہاں چھپی ہوتی ہے، اور اس کا استعمال کیسے کیا جانا چاہیے، وہ جانتے ہیں۔''

(ایضاً)

ڈاکٹر موصوف کی سائنسی موضوعات سے دلچسپی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ

اب تک وہ ۴۰۰ر سے زائد سائنسی نگارشات قلم بند کر چکے ہیں نیز چار ریاستوں کے نصابی کتب میں ان کے ابواب شامل ہیں۔ اپنے ایک مضمون "Scientific Innovation and al-Mizan" میں وہ قرآن میں موجود ماحولیاتی توازن کا تذکرہ یوں کرتے ہیں :

''ماحولیاتی توازن: یہ وہ توازن ہے جو ماحولیات کے مختلف عناصر کے درمیان ہوتا ہے۔ یہ نسبتاً نیا تصور ہے جو پچھلے پچاس برسوں میں سامنے آیا ہے جب کہ چودہ سو سال قبل قرآن کریم میں بہت صاف طور پر اس مظہر کو بیان کیا گیا ہے:

''ہم نے تمام چیزیں تناسب اور توازن میں پیدا کی ہیں۔'' (۴۹-۵۴)

ہمارے ماحولیات کے مختلف عناصر کے درمیان پیمائش کا تصور یا توازن (المیزان) ہم پر اس وقت ظاہر ہوا جب ہم نے کائنات میں کچھ پریشان کن مظاہر کا نوٹس لیا۔ گرین ہاؤس کے مضر اثرات ان میں سے ایک مظہر ہیں۔

جینیٹک انجینئرنگ کی مختلف تکنیکوں کے ذریعہ لوگ کچھ ایسے مفید جینس کو ان جانداروں میں شامل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جن میں مذکورہ جینس فطری طور پر موجود نہیں ہیں۔ یہ کوشش سراسر اس قدرتی توازن کے مخالف ہے جو ایک جاندار کی تمام جینس میں موجود ہوتا ہے۔''

(Book: Islam and Ecology: A Bestowed Trust, edited by: Richard C. Foltz, Frederick M. Denny and Azizan Baharuddin, Harvard Univ. Press P. 393-395 Year: 2003)

ڈاکٹر محمد اسلم پرویز کے سائنسی نکات ذکر و فکر کے لحاظ سے شعور و آگہی سے بھرپور ہوتے ہیں۔ وہ معلومات بہم پہنچا کر نئی قدروں اور موشگافی کے متحرک کردار کے امین بنتے ہیں اور اطلاقی طریق کو عصر سے روشناس کرتے ہیں۔ انھوں نے جدید اضافی سیاق میں صحت مند اشکال کو نئی کثیر الوضع سائنسی ادبیت بخشی ہے۔ اسی لیے ان کی تحریر معتبر اور قابلِ قدر قرار پاتی ہے۔ حیاتیاتی تسلسل کو انھوں نے مثبت ردِ عمل سے واضح کیا ہے۔ شاہد و ناظر منظر بن کر اپنے چاروں طرف کے منظر نامے کو خود کے اندر جذب کیا ہے اور ظاہری و باطنی ردِ عمل کو روئیدگی، نوازشِ فطرت اور

پُرتحرک انسانی رشتوں سے عبارت کیا ہے۔اسی لیے ان کے یہاں وضاحت اور قطعیت ملتی ہے۔
میں اس مختصر سی تحریر کا اختتام اپنی اس نظم ''بصارتِ فکری'' پر کرتا ہوں :

ادب میں پھر نگارِ ساختیت — معانی ساز لفظوں کی صداقت
سرِ لوح و قلم فکری بصارت — پسِ موضوع نباتاتی حقیقت
جنونِ عشق ہر عنواں میں پنہاں — گلوں کی وادیاں ہوں یا بیاباں
ہر اک شئے ہے بہ مثلِ حسنِ تاباں — شرار و سنگ بھی تخلیقی عنواں
بڑے مبہم ہیں اجمالی اشارے — چھپے ہیں خاک میں بھی چاندتارے
تھے آب و گل بھی رخشندہ کنارے — دھنک آوردہ تحقیقی نظارے
خرد سازی کے سائنسی حوالے — وقارِ عزم کے روشن ستارے
کہاں ملتے ہیں اب ایسے جیالے — جو فن میں ڈال دے فکری اجالے
نیا گوشہ ، نئی تاریخ سازی — 'قرآنی' آیتوں کی سرفرازی
زباں کو بخش دی وہ دل نوازی — سخن کو مل گئی جدّت طرازی
مبارک آپ کو 'پرویز اسلم' — سدا قائم رہے یہ عزمِ پیہم

دعا مقبول ہوجائے یہ اعظمؔ
طلسمِ عزم ہو کچھ اور محکم

❖❖❖

پیش خدمت ہے کتب خانہ گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے
https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
0307-2128068
@Stranger

ظہیر انور کا ''چراغِ رہ گذر'': اردو سفرنامے کا سنگ میل

اردو کی نئی بستیوں میں ہندو پاک کے ادباء و شعراء کا سفر، چراغِ اردو کی لو تیز کرنے کیلئے ہوتا ہی آیا ہے اور بیشتر اہل قلم نے دیارِ غیر کے سفر کے اپنے مشاہدات، تجربات اور محسوسات کو سفر نامہ بنایا ہے۔ یوسف خاں کمبل پوش سے اب تک اردو میں سینکڑوں کی تعداد میں سفرنامے لکھے گئے ہیں؛ جن میں سے کئی ایک ایسے بھی ہیں جو اس غیر افسانوی صنفِ ادب کو انفرادی رنگ و آہنگ عطا کرتے ہیں اور سفرنامہ نگار اپنے کمالِ فن سے قاری کو بھی اپنا ہم سفر بنالیتا ہے۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ سفرنامہ نگاری دیگر اصنافِ ادب کی طرح پابندی سے طبع آزمائی کی جانے والی صنف نہیں ہے؛ اس لیے سفرنامہ نگار بنیادی طور پر جس صنفِ ادب سے تعلق رکھتا ہے؛ اس کے سفرناموں میں اس مخصوص صنفِ ادب کی خوبیاں در آتی ہیں۔ یہ باتیں اردو کے معروف ڈراما نگار ظہیر انور کے سفرنامہ شہر لندن بنام ''چراغِ رہ گذر'' پر بھی صادق آتی ہیں۔ موصوف کے سفرنامے میں ڈرامائی کیفیت جابجا نظر آتی ہے۔ لندن کے مختلف مقامات کی تفصیلات انھوں نے اس انداز سے پیش کی ہے کہ گویا یہ مقامات اسٹیج پر قاری کے سامنے موجود ہوں۔ اس بابت ممتاز افسانہ نگار جوگیندر پال لکھتے ہیں:

> ''لندن میرا دیکھا ہوا ہے تاہم ظہیر انور کی ذات میں گھلے ملے اس لندن میں چل پھر کر مجھے یہ اجنبی شہر اپنا کوئی شناسا معلوم ہونے لگا ہے۔ یقین نہ آئے تو آپ بھی پڑھ کر دیکھ لیں۔''

لہٰذا پڑھا، تو جوگیندر پال کی اپیل اور دلیل کا قائل ہوئے بغیر نہ رہ سکا، اس اعتبار سے کہ :

> ''ظہیر کا قاری اس کی یہ کتاب پڑھ کر لندنی زندگی کی ان کہی اوجھل پرتوں سے بھی روشناس ہو لیتا ہے جن سے عام سیاح وہاں اپنی موجودگی کے باوصف

انجان رہتا ہے۔ یہ سارا کھیل دراصل اس آنکھ کا ہے جو بڑے وثوق سے قاری
کو سونپ کر مصنف خود آپ اپنی تحریر میں کھویا ہوتا ہے''۔ (جوگیندر پال)

جی ہاں! یہ آنکھ کا معاملہ ہے، آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہ محسوسات میں اتر کر ہلچل پیدا نہ کردے تو قلم کو تحرک کہاں ملتا ہے۔ ظہیر انور پہلے بھی لندن جا چکے تھے، پیرس، نیویارک اور ڈسلڈ وزف بھی دیکھ آئے تھے لیکن ''جب تک شدید تحریک سے باطن کی دنیا متحرک نہ ہو جائے لکھنا تو بس صفحے سیاہ کرنا ہے'' (ص ۳۶)، کے قائل مصنف کا یہ سفر، بصیرت و بصارت کا استعارہ بنا تو دوبئ ایئرپورٹ اور ہیتھرو ایئرپورٹ سے لے کر لندن کے معروف وغیر معروف مقامات وعلاقات کی سیر ''دیارِ فرنگ میں'' برطانوی سماج اور مٹی سے جدائی کا احساس، ایک بھیگا دن اور انگلش پب، لندن یونیورسٹی میں کانفرنس، مجسٹریٹ کورٹ، رتیج ماؤنڈ پارک اور آدھی رات کاٹی وی چینل، آباد ایک گھر ہے جہان خراب میں، فنِ تمثیل کا ایک جوہر شناس، آکسفورڈ کی سیر، برطانوی پارلیمنٹ، سپر بازار اور ٹیٹ گیلری، ''کھول آنکھ، زمین دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ'' لیک ڈسٹرکٹ: پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے، ڈوکاٹج: نقش پائے رفتگاں، برنٹ وڈ: جان رسکن کی جائے اماں اور دستک بیتے دنوں کی، سفر آشنا مسافروں کے ہمراہ، بلائے جاں کی طرح یہ ہنر...... ایک ادبی تقریب، طلسماتی شہر، تجدید ملاقات: بدلتے مناظر، ایک مختصر نشست، ٹیٹ ماڈرن گیلری گلوب تھیٹر، کے عنوانات کے تحت اس انداز سے کرایا ہے کہ مصنف اپنی دیدنی کو نہایت خوش اسلوبی سے قاری کا دیدہ بنا دیتا ہے اور خود منظر کے پس منظر سے دور کی کوڑی کھنگالتے ہوئے مغربی ومشرقی، قدیم و جدید زندگی کی تہہ در تہہ پرتوں کو کھولتا اور ہر ہر رہگذر پر علم وبصیرت کے چراغ جلاتا چلا گیا ہے۔

عنوانات سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ ظہیر انور کے حیطۂ قلم میں مناظرِ قدرت وفطرت سے لے کر مناظر عشرت وعسرت، تاریخ وکوائف تہذیب وتمدن، اخلاق وطرزِ معاشرت، سیاست و معیشت، ادب وثقافت اور برطانوی فکر وعمل کے رویے اور تضادات سب کچھ بڑی خوبی سے سمٹ آئے ہیں اور ان کے تجزیے آفاقی اقدار کے تناظر میں بڑے بے ساختہ پن کے ساتھ دلچسپ وفکر انگیز بن گئے۔ مثلاً عنوان ''دیارِ فرنگ میں'' سے ایک اقتباس دیکھیں: جب ایک

میزبان صابر ارشاد عثمانی نے بوقت رخصت پوچھا:

''بھائی! آپ کو اس بار لندن کیسا لگ رہا ہے؟''

میں نے جواباً عرض کیا کہ ''حضور! آزاد ہندوستان میں ہم برطانوی رکھ رکھاؤ سے آج بھی متاثر ہیں، ان کی دی ہوئی نظر سے دیکھتے ہیں اور ان ہی کے دیئے ہوئے کانوں سے سنتے ہیں اور جہاں تک لندن کا سوال ہے...... یہاں کے مکان اور مکینوں کے حوالے سے کئی خیال مجھے بے چین رکھتے ہیں۔ اکثر علاقوں میں خاموشی ہے یا ایک دوسرے سے دوری اور لاتعلقی، یوں لگتا ہے کہ خاموش اور مخصوص برطانوی طرز میں تعمیر مکانوں میں مکیں محو خواب ہیں یا پھر ان میں آسیبوں کا بسیرا ہے۔ اس دلکش، خاموش اور آباد ویرانے میں اکثر دل نے چاہا کہ کسی دروازے پر رک کر دستک دوں اور پوچھوں: "Is there anybody there?" صابر صاحب زیر لب مسکرائے اور کہا:

''سب اپنی اپنی دنیا میں مگن ہیں۔''

یہ مشاہدہ و تجربہ تھا ہیتھرو کے علاقہ Surrey جاتے ہوئے لندنی زندگی کا۔ اس کے بعد انھوں نے مشرقی لندن کی سیر کرائی ہے جہاں ایشیائی تارکین وطن کی کثیر آبادی ہے۔ بعنوان ''برطانوی سماج اور مٹی سے جدائی کا احساس'' کے تحت اس کی بڑی دلگداز تصویر اتاری ہے اور بالآخر یہ کہتے ہوئے کہ:

''اس انگریزی سماج میں جدیدیت، آزادی اور تحفظ کی تمام سہولیات کے باوجود سارے راستے جنت کی رہ گذر کی طرف کہاں کھلتے ہیں۔ ذرا سی چوک ہوئی تو جہنم زار کا لمحہ سامنے ہوتا ہے۔ برطانوی سماج میں تلاشِ معاش میں نکلے ہوئے تارکین وطن کی قسمت پر کف افسوس ملتا ہوا میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ نیند دیر تک مجھ سے خفا رہی۔'' (ص ۲۸)

قاری کے لئے بھی لمحہ فکریہ فراہم کر گئے ہیں۔ لندن کے سپر بازاروں کی سیر یوں کراتے ہیں:

''ان سپر بازاروں میں کیا نہیں ہے۔ پورے مغربی سماج کی تصویر ہے، لہٰذا یہاں اگر آپ کچھ وقت گزاریں تو کتنے ہی سماجی تصورات کی قلعی اترتے دیکھ سکتے ہیں۔ سب سے بڑا تصور تو انہی ملٹی نیشنل کا ہے، پچھلی صدی کی آخری دہائیوں سے یہ لفظ عالمی طور پر گردش میں ہے۔ بڑی بڑی کمپنیاں، خواہ گھڑیوں کی ہوں، گاڑیوں کی ہوں، خوشبوؤں کی ہوں، لباس، الیکٹرونکس کی ہوں، پوری دنیا کو اپنے حصار میں کھینچ لاتی ہیں۔ یہاں خوشبوؤں کا معیار روح میں بسی تازگی نہیں ہے بلکہ جذبات واحساسات کے کچے رنگ ہیں، ان وقتی خوشبوؤں اور پیچیدہ تکثیریت کے خلاف ہپیوں نے ۷۰ء کی دہائی میں احتجاج کیا تھا اور ان سپر بازاروں سے دور بدھ ازم یا ہندو ازم وغیرہ کی چھاؤں میں بیٹھ کر تھوڑی دیر ستانے نکل گئے تھے۔''

پھر لندن کے سپر بازاروں کی ایک ایک دکان اور شوروم کی دلچسپ منظر کشی اپنے یہاں کے سپر بازاروں کے تقابل کے ساتھ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''کسی سپر بازاروں کی دیدار کے بعد آکسفورڈ اسٹریٹ کی بے پناہ خوبصورت بھیڑ میں دور تک چلتا ہوں تو دکانوں اور بس اسٹاپ کے سامنے کچھ نادار لوگ موسیقی کی بے جوڑ دھنوں کو بجا کر بھیک بھی مانگتے ہوئے ملے۔ پورا سماج پیسہ اور مشین کے حوالے سے انفرادی لوگوں، کمپنیوں اور سیاسی جماعتوں کے کارناموں کی معراج نظر آتا ہے۔ جگر کی زبان میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ :

یہی دنیا ہے بستی آنسوؤں کی
یہی دنیا، تبسم زار بھی ہے''

تو ایسا نظریۂ کائنات ابھرتا ہے۔ اس نظریۂ کائنات میں سیکس شاپ، شوہو کے Homo Sexual اڈے اور گلیوں میں بکتے ہوئے چرس، براؤن شوگر کے بڑے بیوپاریوں کے چھوٹے چھوٹے ایجنٹوں سے بھی آپ کی ملاقات ہو سکتی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ یہی سب سچ ہے کہ یہ

ایک بھیانک جھوٹ ہے۔ کیا واقعی آج کی نئی اصطلاح گلوبلائزیشن انسانی خوشی کو تادیر برقرار رکھ سکتی ہے؟ کیا یہاں کی Plurality ہی معراجِ زندگی ہے یا پھر ہر آدمی خوشی کے حوالے سے ہی ایک جزیرہ بن سکتا ہے اور جان ڈان کے مشہور مقولے کی ضد بن کر ابھر سکتا ہے؟

''مجھے آج اس سوال کا جواب نہیں مل رہا ہے، میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں لندن کے ان خوبصورت بازاروں میں سیر کرنے کے بعد معاملہ کچھ صاف اور پاک نہیں ہے۔ کہیں صاحبانِ مذاہب ہیں کہیں تاجرانِ معاشیت، ان ہی دنوں کے درمیان ہی انسان کے جینے کی روش پروان چڑھ رہی ہے جس میں محبت تو ہے لیکن شاید نفرتوں کا پل بھی مضبوطی سے بن چکا ہے! یہی نیا نظریۂ کائنات ہے جہاں تہذیبیں ایک دوسرے کے مقابل ہیں، انسان کے درمیان ہم آہنگی کم ہے۔ ان سڑکوں، بازاروں اور محبت و نفرت کی بساط پر پھیلتے ہوئے سپر بازاروں میں بھانت بھانت کے انسانوں کو دیکھتا دیر تک گزرتا رہا اور سوچتا رہا کہ انسان کی ازلی اور آفاقی خوشیاں کیا ہیں اور کیا ان ازلی خوشیوں کی بازیافت کے لئے مارکیٹ ویلیو کے سوا کوئی اور یکساں اصول بھی ہیں؟''

بالخصوص آکسفورڈ، ورڈزورتھ، شیکسپیئر اور رسکن کی جائے اماں کی منظر نگاری اور جزئیات نگاری حد درجہ دلکش، فکر انگیز اور دردمندی سے لبریز ہے۔

اس طرح ہم پاتے ہیں کہ محبت، علم فن اور دردمندی کے لئے ترستی ہوئی نگاہوں نے لندن کے خطۂ ارض و سماوات کے درمیان پائی جانے والی ایک ایک چیز کا ایک نکتہ داں کی مثل مشاہدہ و ملاحظہ کیا اور جزئیات نگاری، منظر نگاری، تجزیہ نگاری کے پورے محاسن کے ساتھ اتنی شستگی اور برجستگی سے انھیں ایسے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیا ہے کہ ہر منظر چشم دیدہ اور ہر باب فکر انگیز و بصیرت افروز بن گیا ہے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ ایک دردمند فنکار کی یہ تصنیف اردو سفرنامے کی ارتقا میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

❖❖❖

پیش خدمت ہے **کتب خانہ** گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے 👇
https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
0307-2128068 📱
@Stranger ❤️❤️❤️❤️❤️❤️❤️

ریحانہ محمد علی اور مشاہیر کے ازدواجی خطوط کا تجزیہ

مکتوب نگاری خود کوئی صنف ادب نہیں ہے اس لئے اصناف ادب کی طرح اسے کوئی نہیں برتتا، یہ تو صرف نجی و ذاتی اظہار وابلاغ کے طور پر معرض وجود میں آیا کرتے ہیں۔ لیکن جب کسی مکتوب میں مکتوب نگار اپنے تفنّنِ طبع اور اخلاق و کردار کی بلندیوں سے اپنی تحریروں میں اترتا ہے اور وہ تحریریں ادب لطیف کے نمونے بن جاتے ہیں جن سے ذہن کے دریچے کھلنے لگتے ہیں اور ادب کی جلوہ سامانی ہوتی ہے تو اس کی ادبی اہمیت وحیثیت مسلم ہو جاتی ہے۔ بسا اوقات ایسے مکتوبات ادب کی کسوٹی پر چڑھ کر اپنے مکتوب نگار کی شخصیت کو لافانی بنا دیتے ہیں۔ جیسے ''خطوطِ غالب'' اسی لئے ہر زبان وادب میں مشاہیر علم وادب کے خطوط منظر عام پر لائے جاتے رہے ہیں۔ ان کے ذریعہ ان شخصیات کے نہاں خانوں کی سیر کرا کے ان کی ارفع شخصیت کی تکمیل کا منشا بھی کار فرما ہوتا ہے۔ بجا کہا ہے ڈاکٹر ریحانہ محمد علی نے کہ:

> ''نجی خطوط اگر لکھنے والے کی شخصیت کا آئینہ ہوتے ہیں تو مکتوب الیہ کے یقین و اعتماد کے ضامن بھی۔ وہ تمام باتیں جسے کوئی شخص سمجھتا اور محسوس کرتا ہے اور کسی سماجی بندھن یا مصلحت کے تحت اظہار نہیں کر پاتا، وہ سب کچھ ان خطوط کا حصہ ہو جاتے ہیں۔ اس میں کسی شخص کو گالیاں بھی ہو سکتی ہیں، دل کی کسی خطا کا اعتراف بھی ہو سکتا ہے، ادب وآداب سے الگ نہایت بے تکلفی سے کسی پر نکتہ چینی یا چھینٹا کشی بھی ہو سکتی ہے، یہ کسی کی اپنی پرکھ اور احتساب کا عمل بھی ہو سکتا ہے تو کسی کی انکساری و پاسداری کا ثبوت بھی۔ اس میں لکھنے والے کی سماجی، اقتصادی، معاشی اور جذباتی لہروں کا احساس بجا طور پر موجود ہوتا ہے۔ یہ ایک پیمانہ ہے جس سے ادیب کی شخصیت کو بنایا جاتا ہے۔'' (ص:۱۵)

ساختیاتی اعتبار سے۔ جس طرح انسان اپنے ظاہری اعضاء و اعصاب کے برعکس بدن کے اندر الگ کائنات رکھتا ہے جسے محشرستان بھی کہا جاتا ہے اسی طرح عموماً ظاہری شخصیت کچھ ہوتی ہے اور باطنی کچھ اور، اخلاق کا عمل کچھ اور ہوتا ہے کردار کا کچھ اور، دماغ کی کارستانی کچھ ہوتی اور دل کی ترنگ کچھ اور، گویا شور دریا کچھ کہے ہے تہہ نشیں کچھ اور ہے، کی مصداق فطری و جبلی تضادات کا حسین امتزاج ہے۔ حضرت انسان جن کی کسوٹی بنتا ہے وہ تحریرات و نجی خطوط ہیں۔ عالمانہ و فنکارانہ تحریرات ظاہری شخصیت کے عکاس ہوتے ہیں تو نجی خطوط باطن کے غماز کیونکہ ضبط تحریر کے وقت راقم کے من کی موج کسی خاص سے مخاطب ہوتی ہے جو بے تکلف ہوتا ہے اور اگر مکتوب نگاری زن و شو کے درمیان ہو رہی ہو تو احتیاط و حجابات کی چلمنیں بھی ہٹ جاتی ہیں پھر تو بقول مصنفہ:

''اس میں مکتوب نگار اپنی جنسیات، جبلیات اور رومانیت کا اظہار بھی بہت کھل کر کرتا ہے اور وہ ان تمام امور پر لکھ کر بھی اتنا ہی محظوظ ہوتا ہے جتنا کہ پڑھنے والا۔ اس طرح کے خطوط کا دائرہ بہت مختصر ہوتا ہے ان معنوں میں کہ اس کے مخاطب صرف اور صرف زن و شو ہی ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان میں مخاطبت کا انداز، واقعہ نگاری، جذبات کی لہروں کی کارفرمائیاں بھی کچھ مہکتے جملوں میں ہوتا ہے۔ زندگی کے خفیف جذبات سے لے کر اس کے سہانے خوابوں اور جسم و جان کے تذکروں سے لے کر تخلیق انسانی تک کی باتیں اس میں راہ پاتی ہیں اور کم و بیش جانبین ایک ہی طرح کی کیفیات سے متاثر رہتے ہیں۔'' (ص:۱۵-۱۶)

بقول مومن: آہ کیش محبت میں کہ سب کچھ ہے روا

حسرتِ حرمتِ صہبا و مزامیر نہ کھینچ

اب نکتۂ فکر یہ ہے کہ ڈاکٹر ریحانہ محمد علی کو ازدواجی خطوط کی تحلیل و تجزیے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ کیا مشاہیر ادب کے منظر عام پر آئے رشحات قلم کی تابانیوں میں ان شخصیات کا پورٹریٹ کہیں پر انہیں Shaded نظر آیا؟ انہیں کے خیال سے رجوع کرتا ہوں، لکھتی ہیں:

''آدمی فرشتہ نہیں ہے۔ وہ منفی اور مثبت دونوں پہلوؤں سے گھرا ہوا ہوتا ہے۔

جو منفی عوامل ہیں انہیں شر نہیں کہہ سکتے۔ اس کی ضرورت بھی اسے گا ہے گا ہے
ایسا سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ ضرورت سے میری مراد جبلت ہے جو ودیعت الٰہی
ہے۔ اپنی جبلت تبدیل کرنے والے فرائڈ کے نقطۂ نظر سے ابنارمل ہو جاتے ہیں
اور وہ دوسرے طریقے پر سماج کو نقصان پہنچاتے ہیں، تو ادیب جب خط لکھتا ہے
اور تنہائی میں لکھتا ہے اور اپنے دوست یا ہمراز کو لکھتا ہے تب وہ اپنی جبلت آشکارا
کر دیتا ہے اور اس وقت وہی سچائی سب سے بڑی سچائی ہوتی ہے.... اس بڑی
سچائی کے باوجود بعض ادیب ایسے بھی ہیں جو اس موقع پر اپنی جبلت کے تمام تر
زور کا منہ پھیر دیتے ہیں اور فرشتہ خصال بن کر بڑی بلندی سے کچھ لکھنے پر مجبور
ہوتے ہیں۔ یہ بھی جھوٹ ہے اور بہت بڑا جھوٹ۔ اس سے شخصیت کے چہرے
کی بے رنگی کا پتہ چلتا ہے۔ بے رنگی نہ کہئے تو دو رنگی تو کہہ ہی سکتے ہیں۔ اپنے
آپ کو فرشتہ بنا کر پیش کرنا بھی ادیبوں کی عادت رہی ہے۔" (ص: ۲۸)

بنابریں مشاہیر ادب کے ازدواجی خطوط کے ذریعہ ان کی سائیکی میں اترنے کا یہ حوصلہ ریحانہ محمد علی کر گئیں۔ ظاہر ہے: "چونکہ آدمی ادبی طور پر تجسّس کا پیکر ہوتا ہے، دوسرے کی کھڑکیوں میں جھانکنا چاہتا ہے۔ اپنی تمام تر محرومیوں کا اسی طرح ازالہ کرنا چاہتا ہے اسلئے بھی ان کا مطالعہ کچھ زیادہ ہی اہم بن جاتا ہے۔" (ص: ۳۰) اور یوں ڈاکٹر ریحانہ کے تحقیقی مقالہ کا یہ موضوع بن گیا۔

ضابطۂ مقالہ کی پاسداری کرتے ہوئے تمہیداً خطوط اور ادبی خطوط کی اہمیت و افادیت پر سیر حاصل گفتگو کی ہے پھر اصل موضوع سے رجوع کیا ہے اور عمر کے ہر ادوار کے ازدواجی خطوط کا مختلف نوعیت سے جائزہ لیا ہے۔ بڑی باریک بینی سے شاعری کے ابتدائی دور کے شبابی موجوں کو ایک ایک کر کے گنا، بعد کے ادوار کے خانگی، سماجی، اقتصادی مسائل اور اقرباء کے رشتوں کی پاسداری کے تناظر میں لمحے لمحے کے جذبات، خیالات، باہمی برتاؤ، بکھراؤ، تضادات، عمر کے آخری پڑاؤ کے تجربات، مشاہدات اور باہمی تعلقات کی ایک ایک لہروں کو پرکھا، تولا اور بڑی بے باکی سے تجزیے کئے اور بے لاگ تحلیل نفسی کی ہے۔ مصنفہ کا یہ اعتراف بجا ہے کہ:

''میں نے اس امر کی وضاحت کے لئے خاندان کے دیگر افراد کی نفسیات کو سمجھنے اور ماہر نفسیات کے تجربوں کے حوالے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ بیحد خوشگوار زندگی چاہنے اور گذارنے والے لوگ خود اپنے گھر کیلئے راہ کا کانٹا کیوں ہو جاتے ہیں؟ بہو کی اٹھکیلیاں کیوں ناگوار گذرنے لگتی ہیں اور اس تمام رنجش بے جا کو عام طور پر سسر کیوں نظر انداز کر دیتا ہے؟ کیوں بہو کا طرف دار ہو جاتا ہے؟ کیا واقعتاً بہو بیٹوں میں اسے اپنی گذری زندگی کے واقعات و حالات نظر آتے ہیں؟ میں نے نہایت تندہی سے اس باریک مسئلے کا حل ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے اور مطمئن ہوں کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوں۔'' (ص: ۱۷۰-۱۶۹)

خصوصاً ''زن وشو کے خطوط میں رومانی و جنسی پہلو'' کے عنوان سے ضبط تحریر باب تو انتہائی دلچسپ اور بصیرت افروز ہے۔ یہاں مصنفہ نے جنسیات EROTICISM کی تفہیم یونانی و آریائی دیو مالائی اساطیر کے علاوہ قدیم و جدید ادبیات عالیہ کے اکابرین کے حوالوں سے بڑی جامعیت کے ساتھ کیا ہے اور اسی تناظر میں ازدواجی خطوط میں جلوہ گر رومانی و جنسی پہلوؤں کی تطبیق وتنقید دلنشیں اسلوب میں کی ہے۔ مثلاً ایک اقتباس دیکھیں:

''دل کے پیغام دل تک بغیر جملوں کے بھی پہنچ جاتے ہیں۔ ہاں فاصلوں کی صورت میں ترجمانی کے لئے الفاظ کا سہارا ضروری ہوتا ہے۔ جہاں تک میر ذاتی خیال ہے کوئی بھی فریق تحریروں میں زیادہ بے باک اور شوخ ہوتا ہے۔ خصوصاً عورتوں کے ساتھ یہ معاملہ ضرور ہے۔ وہ تمام باتیں جو وہ سوچتی ہیں، محسوس کرتی ہیں اور جن کی خواہش مند ہوتی ہیں اس کا بعینہٖ اظہار عام حالات میں تو ممکن نہیں ہوتا اور اس کی واحد وجہ فطری شرم وحیا ہوتی ہے لیکن اگر تنہائی میں اس اظہار کا موقع مل جائے تو پھر شوخی طبع کی کارفرمائیاں نہ پوچھئے۔

میں نے اب تک جو خطوط دیکھے ان سے یہ بات کھل کر سامنے آ گئی کہ جملوں اور تحریروں کی زبانی وہ سارے مراحل بڑے آسانی سے طے پا جاتے ہیں جو عام حالات

میں مشکل ہوں۔ غرض یہ کہ ان خطوط کے حوالے سے عورت و مرد کے جنسی کیف وکم کے علاوہ ان کی پوری نفسیات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔'' (ص:۱۵۱-۱۵۰)

انہوں نے ماقبل کے مطالعات خطوط میں ایک نئے اور دلچسپ باب کا بھی اضافہ کیا ہے، وہ ہے القاب، آداب کی فہرست۔ اس میں زیر تجزیہ خطوط کے القاب و آداب کے علاوہ بھی نوابین و بیگمات اور مشاہرین علم و ادب کے زن و شو کے مستعملہ القاب و آداب چن دیئے گئے ہیں جن سے باہمی تعلقات کی جلوہ ریزی ہوتی ہے۔

اس طور مطالعات خطوط کے ذخیرہ میں ڈاکٹر ریحانہ محمد علی کی یہ تصنیف ایک نادر اضافہ ہے۔ صنف نازک ہونے کے باوجود ناقدانہ دیانت داری کا ثبوت انہوں نے دیا ہے۔ کوئی بھی تصنیف، مصنف کی شخصیت کے اثر سے مبرا نہیں ہوتی سو انہوں نے صنف نازک کے تئیں ہمدردانہ رویے کو متوازن کرنے کی بڑی کامیاب کوشش کی ہے۔ لہٰذا اس نادر تصنیف کے بارے میں اپنی آخری بات کہنے کے لئے خرمنِ آزاد سے خوشہ چینی کرتا ہوں وہ، یہ کہ:

''ایک آدمی جب اپنی تصویر اتروانا چاہتا ہے تو سو میں نناوے آدمیوں کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ نشست اور ڈھنگ سجا کے تصویر اتروائیں، لیکن فرض کرو، ایک آدمی بغیر کسی تیاری اور وضعی انداز کے آلۂ انعکاس کے سامنے آگیا اور اسی عالم میں اس کی تصویر اتر آئی تو ایسی تصویر کس نگاہ سے دیکھی جائے گی؟ ایسی تصویر محض اسلئے کہ بے ساختگی اور واقعیت کی ٹھیک ٹھیک تعبیر پیش کرتی ہے۔ یقیناً ایک خاص قدر و قیمت پیدا کرلے گی اور جس صاحب نظر کے سامنے جائے گی اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لے گی۔ وہ نہیں دیکھے گا کہ جس کی تصویر ہے وہ خود کیسا ہے، وہ اس میں محو ہو جائے گا کہ خود تصویر کتنی بے ساختہ ہے۔'' (خط:۱۷، غبار خاطر)

یہی کیفیت اس نادر کاوش کی بھی ہے کہ: 'تک دیکھ لیا، دل شاد کیا، خوش کام ہوئے اور چل نکلے' ممکن نہیں بلکہ قاری قدم قدم پر ٹھہرنے پر مجبور ہوتا ہے کیونکہ ڈاکٹر ریحانہ محمد علی کی بے ساختگی اور تحلیل نفسی فکر کو مہمیز کرتی ہے۔

❖❖❖

پیش خدمت ہے کتب خانہ گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے
https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
0307-2128068
@Stranger

شکیل افروز کی ''عملی صحافت'': ایک بصیرت افروز کتاب

مدھوکر اپادھیائے کی رائے ہے کہ :

''عام طور سے صحافت کے لئے معروضیت کو ضروری خیال کیا جاتا ہے لیکن صحافی کے لئے معروضیت سے زیادہ ضروری حق اور صداقت کا ساتھ دینا اور اپنا ایک واضح نقطۂ نظر اختیار کرنا ہے لیکن اس ضمن میں تعصب سے بچنا ازحد ضروری ہے۔ ایک صحافی کے لئے وقت کی پابندی، کثرتِ مطالعہ، باریک مشاہدہ اور بہترین قوتِ اظہار کا ہونا لازمی ہے۔ اس کی تحریروں میں تخلیقیت اسی وقت آتی ہے جب وہ زیادہ سے زیادہ کتابوں اور رسائل کا مطالعہ کرتا ہے۔ تاریخ میں بہت سی باتیں درج ہونے سے رہ جاتی ہیں لیکن ایک صحافی مختلف مقامات کے سفر اور وہاں کے لوگوں سے مل کر ایسے بہت سے واقعات عوام تک پہنچا سکتا ہے۔''

(مانو، حیدرآباد میں ورکشاپ بعنوان ''صحافت میں تخلیقی تحریر کا فن اور طریقۂ کار'' اشاعت: روزنامہ ''آگ'' لکھنؤ ۱۷/اپریل ۲۰۱۸ء)

ممتاز صحافی اور ادیب مدھوکر اپادھیائے (سابق صدر، پریس ٹرسٹ آف انڈیا) کے مذکورہ خیالات صحافت کی تعلیم وتربیت کا اشاریہ ہیں، جنھیں عملی طور پر اختیار کر کے صحافت کی صالح روایتوں کو مزید استحکام بخشا جا سکتا ہے۔ اس ورثے کو نئی نسل تک منتقل کرنے والے جن صحافیوں نے جدید اور سائنسی طریقۂ کار اپنانے کی جانب قدم اٹھایا ہے، ان میں شکیل افروز بھی ہیں۔

شکیل افروز کی حیثیت افسانہ نگار، محقق اور صحافی کی ہے۔ ان کا تعلق شہر کولکاتا سے ہے جسے ہندوستان میں انگریزی، بنگلہ، فارسی، ہندی اور اردو زبانوں کے پہلے اخبارات کی اشاعت کا شرف حاصل ہے۔ فی الحال وہ روزنامہ ''اخبارِ مشرق'' کولکاتا سے وابستہ ہیں نیز بنگال اردو

جرنلسٹ ویلفیئر ایسوسی ایشن کے سکریٹری بھی ہیں۔ان کی کئی کتابیں ''اللہ کا گھر'' (تذکرۂ مساجد)، ''انکھیوں کے جھروکوں سے'' (ڈائری سے انتخاب)، ''کلکتہ کا کمال: حصہ اول اور دوم'' (تاریخی اسناد)، ''کلکتہ کوزہ'' (معلوماتی سوال و جواب)، ''عکس افطار و سحر'' مع گوشۂ عبدالجبار، ''شہر کلکتہ و نواح کے قبرستانوں کی دلچسپ روداد''، ''غالب کلکتہ میں''، ''گرم تلی'' (افسانوں کا مجموعہ)، ''کلکتہ کے نئے پرانے بازار''، ''مسلم قبرستان کا تاریخی پس منظر'' شائع ہو چکی ہیں۔موصوف اپنی تازہ کتاب ''عملی صحافت'' کے ''انداز بیان'' میں لکھتے ہیں :

> ''عملی صحافت اور نظریاتی صحافت میں بڑا فرق ہے۔بازار صحافت میں جو بھی پیشہ ورانہ کورسز کرائے جاتے ہیں، ان کا تعلق صحافت کے رموز و نکات ہی سے ہوتا ہے۔میدانِ صحافت میں قدم رکھنے سے پہلے عملی صحافت کا واضح تصور ذہن میں ہونا چاہئے جس کے لئے مطالعہ میں گہرائی، زبان پر گرفت اور اندازِ بیان پر کشش ہونا چاہئے۔''

اس کتاب میں ''ایک کالمی خبر''، ''دو کالمی خبر''، ''تین کالمی خبر''، ''چار کالمی خبر''، ''پریس کانفرنس''، ''اسٹوری''، ''سائڈ اسٹوری''، ''اسپیشل اسٹوری''، ''تفتیشی اسٹوری''، ''فیچر اسٹوری''، ''فولواپ''، ''ادبی رپورٹنگ''، ''ایونٹ رپورٹنگ''، ''پیشگی رپورٹنگ''، ''ترجمہ رپورٹنگ''، ''انٹرویو'' اور ''کالم نگاری'' کو الگ الگ عنوانات کے تحت گفتگو کا موضوع بنایا گیا ہے اور وافر مثالیں دی گئی ہیں۔اس کتاب کے محتویات نئے صحافیوں کے لئے معلومات افزا ہیں۔اس میں سیکھنے اور سکھانے کا جذبہ واضح دکھائی دیتا ہے۔معروف صحافی پرویز حفیظ (سابق مدیر ''دی ایشین ایج'' کولکاتا) نے اس کتاب کی افادیت کا ذکر کرتے ہوئے بجا طور پر لکھا ہے کہ :

> ''یہ کتاب نوخیز صحافیوں کو اردو صحافت کے فن اور تکنیک سے روشناس کراتی ہے اور انھیں گھر بیٹھے رپورٹنگ کے رموز و نکات بھی سمجھاتی ہے۔یہ کتاب فیلڈ میں جا کر خبر کیسے حاصل کی جاتی ہے، دفتر میں بیٹھ کر اس کو کیسے لکھا جاتا ہے، کیسے اس کی سرخی لگائی جاتی ہے، اس طرح کی دیگر ضروری معلومات انھیں فراہم کرتی

ہے۔ شکیل افروز اس بات کے لئے مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایک مشکل موضوع کو قاری کے لئے نہایت آسان اور دلچسپ بنا کر پیش کر دیا ہے۔"

(فلیپ کتاب "عملی صحافت")

شکیل افروز کی محنت اور تجربے نے اس منفرد کتاب کو ایک مثال بنا کر پیش کیا ہے۔ اس میں جدت ہے اور صحافت کے مختلف ابعاد کا احاطہ ہے۔ معروف صحافی، شاعر اور ادیب ف س اعجاز (مدیر "انشاء" کولکاتا) اپنی رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

"خوشی کی بات ہے کہ کلکتہ کے ایک جواں سال فعال اردو رپورٹر شکیل افروز نے ایک ایسی کتاب تیار کی ہے جو دشتِ صحافت میں ان کی برسوں طویل سیاحی کا عملی ثبوت ہے۔ اس کتاب میں خبر نگاری کے فن اور تکنیک پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ خبر کیا ہے، کیسے بنتی ہے یا بنائی جانی چاہئے، کس خبر کو کتنے کالموں کی بحر میں پیش کیا جانا چاہئے نیز جلی اور نیم جلی سرخیوں میں کس بات کو لکھ کر اخبار کو دیدہ زیب اور قاری کے لئے دلچسپ بنایا جائے، ان چیزوں کو شکیل افروز نے اپنے شوق اور تجربوں سے سیکھا ہے۔ پریس کانفرنس، اصل ماجرا (اسٹوری)، "ذیلی ماجرا"، "کہانی یا سائڈ اسٹوری"، "خصوصی اور تفتیشی یا متعاقب خبروں" (Follow Up News) وغیرہ کی مصلحتوں اور فیچر نگاری کے مطالبات ان سب کا علم انھوں نے اپنی کتاب میں قائم کردہ مختلف ابواب میں فراہم کیا ہے۔ انٹرویو اور مستقل کالم نگاری کے تقاضوں کو اختصار اور خوبی سے بیان کر کے گویا مصنف نے صحافت کو بطور پیشہ اختیار کرنے والوں کے لئے کئی آسانیاں فراہم کر دی ہیں۔"

میدانِ صحافت میں قدم رکھنے والے اور نئے صحافیوں کے لئے یہ کتاب اہمیت کی حامل ہے۔ اس کے مشمولات میں تنوع ہے اور موضوع کو سمجھانے کی کوششیں ہیں۔ اس سلسلے میں معروف صحافی عبداللہ تنجر (مدیر "روحِ ادب" کولکاتا) کتاب کے فلیپ پر رقم طراز ہیں :

''ان (شکیل افروز) کی موجودہ کتاب ''عملی صحافت'' اس پیشے میں آنے والوں کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ یہ کتاب ان لوگوں کے لئے بھی شاہکار ثابت ہوگی جو پیشہ ورانہ صحافت سے جڑے ہوئے نہیں ہیں لیکن اپنے علاقے یا محلے کی سماجی، فلاحی، دینی یا ثقافتی روداد لکھ کر اخباروں کے دفاتر کو ارسال کرتے رہے ہیں۔ معنوی اعتبار سے بھی یہ ایک ایسی کتاب ثابت ہوگی جو وقت گزرنے کے ساتھ ایک دستاویز تسلیم کی جائے گی۔''

شاعر اور ادیب نسیم عزیزی اپنے مضمون ''شکیل افروز کی عملی صحافت'' مطبوعہ روزنامہ ''اخبارِ مشرق'' کولکاتا شمارہ ۲۲ر اپریل ۲۰۱۸ء میں اس طرح گویا ہیں :

''شکیل افروز تقریباً ۱۰ر برسوں سے روزنامہ ''اخبارِ مشرق'' میں بحیثیت صحافی اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ یہ ایک تجربہ کار اور بسیار نویس صحافی ہیں۔ اردو میں عملی صحافت کے موضوع پر اب تک کوئی کتاب تحریر نہیں کی گئی ہے۔ اخبارات کے دفاتر میں کام کرنے والے صحافی حضرات میں ایسے بہت سے لوگ ہیں، جو اس فن کو باضابطہ طور پر سیکھنا چاہتے ہیں۔ اصولی علم سکھانے والی کتابیں تو بازار میں دستیاب ہیں مگر ''عملی صحافت'' سے متعلق کتاب ایک بھی کتاب موجود نہیں ہے۔ خدا نے ان کی آزمائش کی اور اسی دوران اس کتاب کا تخلیقی جواز بھی پیدا کر دیا۔...... شکیل افروز کی یہ کتاب یقینی طور پر ایک خاص اہمیت وافادیت کی حامل ہے جو اردو میں صحافت نگاری کے عملی تجربات کا ایک جہان روشن کرتی ہے۔......''

جمیل احمد (نائب صدر، بنگال اردو جرنلسٹ ویلفیئر ایسوسی ایشن) نے صحافت کی بڑھتی ذمہ داریوں کے درمیان اس کتاب سے کئی گوشے روشن ہونے کے امکانات کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

''شکیل افروز صاحب کی یہ کتاب ان صحافیوں کے لئے جو اس پرخار راستے پر

چلنا پسند کرتے ہیں، ایک شمعِ ہدایت ہے۔اس کتاب میں صحافت کے تمام تکنیکی شعبے قدامت وجدیدیت کو ملحوظِ خاطر رکھا گیا ہے۔اب جب کہ صحافت پرانی روش سے نکل کر کمپیوٹرائزڈ اور رنگا رنگ دنیا میں قدم رکھ چکی ہے، تو ایسے میں صحافت کی ذمہ داریاں بڑھی ہیں۔اب صحافت کو نئی آب وتاب، نئی اصطلاح، نئی زبان، نئی ترتیب اور واقعات کو اتنے پر اثر ڈھنگ سے پیش کرنے ہوتے ہیں جس سے قاری کے اندر بھی تجسس پیدا ہو جائے۔آج دنیا کو میڈیا نے اپنی گرفت میں پوری طرح سے جکڑ لیا ہے۔اخبار نویسی بھی ذائقہ دار غذا کی طرح ہو گئی ہے۔"

(فلیپ کتاب "عملی صحافت")

شکیل افروز کی یہ کتاب سماجی، فکری اور تہذیبی میلانات کے تغیر و تبدل سے آشنا کراتی ہے کہ اس میں عملی صحافت کے مبادیات کو انھوں نے تفصیل سے بیان کیا ہے اور تکنیکی منظر نامہ سے بحث کرتے ہوئے اپنے طاقتور ذریعہ اظہار سے اسے ناگزیر بنا دیا ہے۔یہ کتاب ایک طرح سے بازیافت ہے اور دستاویز کی حیثیت بھی رکھتی ہے، جس کے کینوس پر ستارے ٹنکے نظر آتے ہیں۔

❖❖❖

پیش خدمت ہے کتب خانہ گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے 👇
https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
0307-2128068 📱
@Stranger ❤️❤️❤️❤️❤️❤️❤️

محمد ارشد جمیل: احساسات کے آئینے میں

میں پی جی شعبۂ اردو، ایل این متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ میں ۱۹۸۳ء-۱۹۸۱ء سیشن میں ایم اے کا طالب علم تھا۔ اس وقت شعبہ کے سربراہ پروفیسر محمد مطیع الرحمٰن مرحوم اور اساتذہ میں پروفیسر سیّد ضیاء الرحمٰن، ڈاکٹر محمد طیب صدیقی، ڈاکٹر عبدالمنان طرزی، ڈاکٹر فاران شکوہ یزدانی اور ڈاکٹر محمد ارشد جمیل تھے۔ تمام اساتذہ مجھے بے حد عزیز رکھتے۔ ڈاکٹر ارشد جمیل بڑی دلجمعی سے طلباء کو لسانیات پڑھاتے تھے۔ عربی اور فارسی میں انھیں کافی درک تھا۔ اسلامی تاریخ پر بھی گہری نظر تھی۔ نہایت شریف النفس انسان تھے۔ میں نے ایم اے (اردو) میں فرسٹ کلاس سے کامیابی حاصل کی۔ پھر اسی شعبہ سے پروفیسر محمد طیب صدیقی کے زیرِ نگرانی جون 1989ء میں ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی تیز دسمبر 1991ء تا 4 نومبر 1996ء 'یو جی سی ریسرچ ایسوسی ایٹ' کی حیثیت سے تحقیق وتدریسی کام انجام دیتا رہا۔ اس دوران بھی جناب ڈاکٹر ارشد جمیل سے بہت کچھ استفادہ کا موقع ملا۔ دریں اثنا پروفیسر رئیس انور نے بھی ۱۷؍مارچ ۱۹۸۸ء کو ٹی این بی کالج، بھاگلپور سے شعبۂ اردو، ایل این متھلا یونیورسٹی میں بحیثیت ریڈر جوائن کیا۔ 5 نومبر 1996ء سے بہار اسٹیٹ یونیورسٹی سروس کمیشن کے ذریعہ میں اسی یونیورسٹی کے ایک کالج 'آر این کالج' پنڈول میں اردو کا لیکچرار مقرر ہوگیا۔ واضح ہو کہ پروفیسر محمد مطیع الرحمٰن کی سبک دوشی (۳۱؍اکتوبر ۱۹۸۸ء) کے بعد پروفیسر سیّد ضیاء الرحمٰن شعبے کے صدر ہوئے۔ ان کے رجسٹرار بننے کے بعد پروفیسر محمد طیب صدیقی اور پھر سی ایم کالج، دربھنگہ کے شعبۂ اردو سے پروفیسر شاکر خلیق سربراہ ہوئے۔ ان کے بعد پروفیسر محمد طیب صدیقی (دوسری میعادِ کار)، پروفیسر ایم کمال الدین (شعبۂ اردو، سی ایم کالج، دربھنگہ) اور پروفیسر محمد طیب صدیقی (تیسری میعادِ کار) بالترتیب شعبہ کے صدور ہوئے۔ ان حضرات کی سبک دوشی کے بعد پروفیسر رئیس انور شعبہ کے صدر ہوئے۔ پروفیسر رئیس انور کی میعادِ کار مکمل ہونے کے بعد تمام

شعبوں میں روٹیشنل ہیڈ شپ کا آغاز ہوا اور ایل این متھلا یونیورسٹی، شعبۂ اردو میں اے پی ایم کالج، برونی کے پروفیسر ظفر حبیب صدر بنے۔ ان کے بعد ڈاکٹر فاران شکوہ یزدانی چند ماہ انچارج صدر شعبہ رہے۔ پھر پروفیسر جمیلہ خاتون (ایم آر ایم کالج، دربھنگہ)، ڈاکٹر محمد قیس (سی ایم کالج، دربھنگہ)، پروفیسر انیس صدری (سمستی پور کالج، سمستی پور) اور یکم جولائی ۲۰۱۷ء سے ڈاکٹر محمد ظفر الدین انصاری (جی ایم آر ڈی کالج، موہن پور، سمستی پور) یکے بعد دیگرے صدرِ شعبہ ہوئے۔ اس درمیان مضافات کے کالجوں سے پروفیسر عبد السلام اور ڈاکٹر عبد الرؤف نے ایسوسی ایٹ پروفیسروں کی حیثیت سے چند ماہ شعبۂ ہذا میں خدمات پیش کیں۔ ان دنوں ڈاکٹر ایس ایم رضوان اللہ صدرِ شعبہ ہیں۔ میں ۴؍جولائی ۲۰۰۵ء کو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدر آباد کے ریجنل سینٹر دربھنگہ کا ریجنل ڈائریکٹر مقرر ہوا۔ اس طرح ریاستی یونیورسٹی سے فراغت پاکر ایک مرکزی یونیورسٹی کا ملازم ہوگیا مگر شعبۂ اردو، ایل این متھلا یونیورسٹی اور اس کے اربابِ حل و عقد سے مراسم بدستور قائم رہے۔ اسی یونیورسٹی سے پروفیسر سیّد ضیاء الرحمٰن کے زیرِ نگرانی ۲۰۰۵ء میں ڈی لٹ کی سند حاصل کی اور میرے زیرِ نگرانی تین اسکالرس نے پی ایچ ڈی کی ڈگریاں بھی اسی یونیورسٹی سے حاصل کیں۔ دربھنگہ سے تبادلہ کے بعد پٹنہ اور پھر ۴؍اپریل ۲۰۱۲ء کو میں نے مانو، کولکاتا ریجنل سینٹر بحیثیت ریجنل ڈائریکٹر جوائن کیا اور تاحال اسی عہدے پر فائز ہوں۔ اس کے باوجود جب بھی میں دربھنگہ گیا، شعبہ کے وابستگان سے ملاقات ہوتی رہی۔ اس دوران میری کئی مطبوعہ کتابوں اور رسالہ "تمثیلِ نو" کے شماروں کی رونمائی بھی شعبۂ اردو، ایل این متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ میں ہوئی جن میں سے بیشتر مواقع پر ڈاکٹر ارشد جمیل موجود رہے۔

میری مرتب کردہ کتاب "عہدِ اسلامیہ میں دربھنگہ" جب شائع ہوئی تو اس کتاب پر ارشد جمیل نے ایک مضمون بعنوان "عہدِ اسلامیہ میں دربھنگہ اور دوسرے مضامین: ایک اہم تاریخی دستاویز" لکھا جو ڈاکٹر سرور کریم کی مرتبہ کتاب "عہدِ اسلامیہ میں دربھنگہ: تحلیل و تجزیہ" اشاعت 2013ء میں شامل ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے بڑی محبت سے راقم الحروف کا ذکر کیا ہے:

> "زیرِ نظر کتاب ڈاکٹر امام اعظم کی تحقیقی کاوشوں کا ثمرہ ہے۔ وہ اپنی طالب علمی کے زمانے سے ہی بڑے فعال اور سرگرم رہے ہیں اور آج بھی ان کی ادبی

سرگرمیاں جاری ہیں۔مختلف موضوعات پر ان کی کئی کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں جن سے ان کی علمی وادبی جہات وابعاد کا پتہ چلتا ہے۔......"

مرحوم نے اپنی تمام کتابیں 'تاریخِ کوروڈیہہ' (جلد اول ودوم)، 'غبارِ سفر' (سفرنامہ) اور 'راسخ کے دو شاگرد: محسن اور فرحت' (مصنف: پروفیسر محمد مطیع الرحمٰن، مرتب: ڈاکٹر ارشد جمیل) بڑی محبت سے مجھے عنایت بھی کی تھیں۔

ڈاکٹر فاران شکوہ یزدانی اور پروفیسر رئیس انور وغیرہ کے توسط سے یہ جانکاہ خبر ملی کہ استاذِ محترم ڈاکٹر ارشد جمیل (ولادت: ۲۳رجنوری ۱۹۵۳ء) کا انتقال پرملال ۱۲رجون ۲۰۱۷ء صبح ساڑھے سات بجے الہلال نرسنگ ہوم، بی بی پاکر، دربھنگہ میں ہوگیا۔مرحوم کے دماغ کے ٹیومر کا آپریشن دو برس قبل دہلی کے ایک اسپتال میں ہوا تھا۔حالیہ دنوں میں وہ صاحبِ فراش ہوگئے تھے۔ان کا جسدِ خاکی ان کے آبائی گاؤں کوروڈیہہ (بھاگل پور) لے جایا گیا جہاں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ڈاکٹر موصوف نومبر ۱۹۸۲ء میں پی جی شعبۂ اردو، ایل این متھلا یونیورسٹی میں لیکچرار بحال ہوئے تھے۔مرحوم کی میرے غریب خانہ 'ادبستان' گنگوارہ (دربھنگہ) میں کئی بار تشریف آوری ہوچکی تھی۔میرے والد بزرگوار جناب محمد ظفر المنان ظفر فاروقی مرحوم (سابق پولیس افسر) سے بھی قربت تھی۔میں اکثر ملنے ان کی رہائش گاہ جایا کرتا۔مرحوم بڑی محبت اور شفقت سے پیش آتے۔میری ادارت میں شائع ہونے والے اردو جریدہ "تمثیلِ نو" کا انھیں شدت سے انتظار رہتا تھا۔ان کی رحلت کے بعد عزیزی احتشام الحق نے بذریعہ فون مجھے مطلع کیا کہ بہت جلد ان کی یاد میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوگا لہٰذا آپ اپنے تاثرات سے نوازیں۔

ڈاکٹر ارشد جمیل ایک شفیق استاد تھے۔انھوں نے اپنی توجہ زیادہ تر درس و تدریس پر ہی مرکوز رکھی۔ادبی موشگافیاں انھوں نے کم ہی کیں لیکن وہ زبان و ادبی اصناف پر گہری نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ ان سے متعلق مخصوص رائے بھی رکھتے تھے جو دورانِ درس یا علمی مجالس میں گفتگو کے درمیان واضح ہوتی تھی۔تاریخِ کوروڈیہہ (جلد اول ودوم) ان کی وقیع کتاب ہے جس میں شعورِ ذات اور شعورِ حیات کا بہترین اظہار ہوا ہے۔حیات و کائنات کے سلسلے میں ڈاکٹر ارشد جمیل

کی جو فکر تھی، اور سماج و معاشرے کی تشکیل و تعمیر کے سلسلے میں جو رائے تھی، وہ منفرد تھی۔ اس اعتبار سے تاریخِ کوروڈیہہ جیسی کتاب آپ ہی جیسی شخصیت کے زورِ قلم کا نتیجہ ہو سکتی ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں تاریخی حوالوں اور تہذیبی قدروں کو زندہ کرتے ہوئے شعورِ حیات کی شناخت کی ہے۔ ان کی یہ کتاب نہ صرف کوروڈیہہ کے احوال و آثار سے متعارف کراتی ہے بلکہ اس کے مطالعہ سے فکر و عمل کے نئے باب کھلتے ہیں اور نئی راہیں روشن ہوتی ہیں۔

جامعات کے پروفیسر حضرات تحقیقی مقالات اور آزادانہ طور پر تنقیدی مقالات کا سلسلہ ضرور جاری رکھے ہوئے ہیں لیکن سماج کی کارفرمائی پر سوچنے اور عمل کرنے کی طرف ان کا رجحان نہیں کے برابر ہے۔ ڈاکٹر ارشد جمیل نے فکر و فن کی ایسی ہی شناسا قدروں پر توجہ دی ہے اور حقیقت نگاری کو نفسیاتی درک کے ساتھ اہم قرار دیا ہے۔ ان کی کئی کتابیں اشاعت کی منتظر رہ گئیں جن میں ''ظفر خاں احسنؔ: حیات اور شاعری''، ''پروین اعتصامی: حیات و خدمات'' اور ''عظیم نیشاپوری: احوال و آثار'' شامل ہیں۔ انکی رحلت پر میں نے ایک نظم ''اک اور ستارہ ٹوٹ گیا'' لکھی جو میرے احساسات کی آئینہ دار ہے :

ایک دانش ور تھے اُردو کے/ اور تخلیقی نظر کے صاحبِ ایجاد تھے/ نفسیاتی ربط کا رشتہ تھا اُن سے/ میرے وہ استاد تھے/ علمیاتِ فکر و فن اُن کا بہت تابندہ تھا/ اور معیارِ سخن کا طرز بھی رخشندہ تھا/ حسیاتی، تجزیاتی کیش کا رکھتے تھے یک گونہ مزاج/ اُن کے اندر تھا چھپا/ اخلاقیاتی اور انسانی رویّے کا حقیقی امتزاج/ دانش ور تھے، خود بیدار تھے، ادراک کے عمیق بھی/ خوش اطوار بھی، اظہاریہ کے پہلو سے بے حد شفیق بھی/ رس گھولتے لہجے نے بنایا تھا ان کو مُتھلا میں پیکرِ جلیل/ تھے وہاں بہت ہی اعلیٰ و ارفع/ ڈاکٹر ارشد جمیل/ زندگی ایسی کہ مردہ رہ کے بھی ماحول سے رشتہ رہا قائم/ درمیاں در درمیاں تھے حوصلے ان کے بلند/ اور عزائم رہے ان کے جواں/ لیکن جب حکمِ معشوق ہوا/ دُنیا سے رشتہ ٹوٹ گیا

اللہ جنت عطا کرے۔ آمین!

❖❖❖

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ: پیکرِ علم وادب

اردو زبان وادب درباروں اور امراء کی پناہ گاہوں میں نہ کبھی نکھری نہ سنوری۔ اس کی خدمت کرنے والے وؔلی ہوں یا میرؔ، غالبؔ ہوں یا مومنؔ یا عوامی شاعر نظیر اکبر آبادی یا شاعر ملت علامہ اقبال۔ یہ گلی کوچوں اور بازاروں میں مقبول ہو کر درباروں کی زینت ضرور بنی لیکن اس کی خدمت کرنے والے عام طور پر صوفی ہوا کرتے تھے، عوام الناس سے جڑے ہوئے ہوتے تھے۔ خود غالبؔ جو اردو کے نامور اور مشہور اور بے مثال شاعر رہے انہوں نے اپنے بارے میں لکھا ہے:

یہ مسائل تصوف یہ تیرا بیان غالبؔ　　　تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

ہندوستان میں صوفیائے کرام کی ٹولیاں مختلف خطوں میں آتی رہیں اور عوامی رابطے کی زبان اردو کو اپنا کر دین کے حل طلب مسائل کو تحلیل کر کے اردو زبان میں عوام کے لئے مہیا کیا۔ جس کے سبب عوام نے ان صوفیائے کرام کی بڑی قدر ومنزلت کی۔ اردو زبان وادب کے فروغ میں مکاتب، مدارس اور خانقاہوں کا کردار سب سے زیادہ رہا اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔

اگر مخلوط کلچر کا نقشہ کوئی دیکھنا چاہے تو وہ اردو زبان وادب کے سرمایہ میں دیکھ سکتا ہے۔ برٹش دور حکومت میں اردو زبان فورٹ ولیم کالج کے ذریعہ سرکاری افسروں کے اہل بنائی گئی۔ مغرب سے آنے والے سیاحوں اور تاریخ دانوں نے ہندوستان میں آکر درسگاہوں میں اور خصوصی طور پر مذہبی درسگاہوں میں جہاں اسلام کی تعلیم وترویج ہوا کرتی تھی دیکھا کہ مدرسوں میں جس انہماک کے ساتھ قرآن کا مطالعہ کیا جارہا تھا وہاں، گلستاں و بوستاں جن کے اردو تراجم اساتذہ بتایا کرتے تھے وہ بھی بہت ہی مقبول عام تھے۔ سعدی کی گلستاں و بوستاں کی تعلیم مدرسوں میں اردو کے ذریعہ دی جانے لگی۔ اس کے سبب مدرسوں، خانقاہوں اور علمی درسگاہوں میں تعلیم کی زبان اردو رہی۔ یہ سلسلہ آزادی کے بعد بھی ہندوستان کے طول وعرض میں جاری وساری

رہا۔ مدرسوں اور خانقاہوں میں اردو زبان روح کی حیثیت رکھتی تھی۔ یہ سلسلہ ایک روایت کی صورت میں ابھرا۔

جب امارت شرعیہ بہار، جھارکھنڈ واڑیسہ کا ذکر آتا ہے تو ایک بڑی قد آور، نا قابل فراموش، علم کا مخزن اور تمام انسانی اوصاف سے مزین ایک شخص حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کا نام آتا ہے۔ ان کی جادو بیانی، ان کے انتظامی امور کی صلاحیت، ان کی گفتگو کا انداز، ان کا اخلاق، ان کی خطابت یہاں تک کہ ان کی سرگرمیوں میں اردو تہذیب وادب کی جھلکیاں دیکھنے کو ملتی تھیں، جو ان سے گفتگو کرتا تھا ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ یہ اردو زبان کا فیض تھا جس پر انہیں قدرت حاصل تھی کہ جب وہ گفتگو کرتے تھے تو ذہن ودل میں اترنے لگتے تھے اور اتنا گہرا نقش ذہن پر مرتسم کرتے تھے کہ مخاطب اپنے ذہن کی ڈائری میں ان کی جادو بیانی کو نقش کر لیتا تھا۔ مثال کے طور پر ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ''ضرورت ہے کہ ہم مل جل کر کام کرنے کی عادت ڈالیں تا کہ کوئی بھی مضراب ہمارے دل کے تاروں کو چھیڑے تو اس ساز سے صرف وحدت فکر وعمل کے نغمے ہی بکھریں۔ بڑے کنونشن اور جلسے شاید ہمارے درد کا مداوا نہیں بلکہ ایک مشترکہ منصوبہ پر عمل کرنے اور اپنے مسائل پر مل جل کر ٹھنڈے دل ودماغ سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ بقول بہادر یار جنگ مرحوم ''ہمیں اپنی ملت کے لئے ایسے نقش ونگار کی ضرورت نہیں جو نگاہ نظارہ باز کو خیرہ کر سکے بلکہ ایسے پتھروں کی ضرورت ہے جو زمانہ کی نظروں سے اوجھل بنیاد میں رہ کر عمارت کے استحکام میں مضبوطی کی ضمانت دے سکیں۔''

(قاضی مجاہد الاسلام قاسمی، خطبہ صدارت اتحاد ملت کانفرنس، ۱۹۹۲ء)

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ نے اردو ادب اور اردو زبان کو صرف اپنایا نہیں تھا بلکہ وہ خود مجسم زبان اردو تھے، اور اردو تہذیب کے پیکر تھے۔ تقریر ہو یا تحریر الفاظ کی نشست و برخواست اور اس کے لہجے کی اہمیت پر پوری گرفت رکھتے تھے۔ وہ اردو ادب اور اردو زبان کا چلتا

پھرتا نمونہ تھے۔ اس لئے یہ کیسے ممکن تھا کہ غنائیت سے بھرپور آہنگ آمیز خوبصورت اور دلکش جملے اور فقرے ان کی زبان وقلم سے ادا نہ ہوں۔ انہیں ہزاروں اشعار ازبر تھے۔ ہزار شعر پڑھتے پڑھتے تو کوئی عام آدمی بھی شعری ملکہ پیدا کر سکتا تھا۔ آپ تو بلا کے ذہین تھے۔ آپ شعروسخن میں طبع آزمائی نہیں کرتے تو حیرت کی بات ہوتی لیکن انہوں نے شعروسخن میں درک حاصل کیا۔ فی البدیہہ اور برملا شعر بھی کہتے تھے۔ حسن اخلاق اور طبع میں مزاح کا عنصر شامل تھا اس لئے بہت ہی شائستہ اور سلیقہ مند انداز میں اپنی باتوں کو ادا کردیتے تھے جس سے سامنے والا محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ پاتا تھا۔

قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی شہرت ایک اسلامی اسکالر کی حیثیت سے اپنی جگہ مسلم ہے لیکن ان کی زندگی کا یہ پہلو کہ وہ اردو کے پرخلوص خادم تھے اور اردو زبان وادب سے عقیدت ومحبت رکھتے تھے بلکہ جنون کی حد تک اردو کے فروغ کے لئے اپنے دائرہ میں کام کرتے تھے۔ تحقیق کرنے والوں کے لئے یہ موضوع بہت اہمیت کا حامل ہے کہ مجاہد الاسلام قاسمی اشاعت اسلام کے لئے اردو کو ریڑھ کی ہڈی مانتے تھے۔ اس لئے ترغیب بھی دیا کرتے تھے کہ اعلیٰ مذہبی کتابیں جو عربی وفارسی میں ہیں ان کے تراجم اردو میں ہونے چاہئیں۔ اس کے لئے انہوں نے بڑے بڑے مدرسوں میں جیسے ندوۃ العلوم لکھنؤ، دارالعلوم دیوبند میں باضابطہ یہ مشن چلایا کہ مستند مذہبی کتابیں جو عربی و فارسی میں ہیں ان کے اردو ترجمے پر بھرپور کام ہوا اور یہی سبب تھا کہ تمام معتبر مذہبی اور دینی کتابیں جو عربی وفارسی میں تھیں وہ اردو میں منتقل ہوکر منظر عام پر آئیں۔ اردو میں مذہب کو سمجھنا اس لئے بھی آسان تھا کہ اردو ہماری تہذیب وزبان کا ایک حصہ ہے۔ ہم اپنے سوچنے کا عمل بھی اسی تہذیبی زبان میں کرتے ہیں اور اس سے جتنا مستفید ہوسکتے ہیں اتنا دوسری غیر ملکی زبانوں سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ اردو زبان کو مذہبی پیچیدگیوں سے نکال کر سہل بنانے کا کام انہی خطیبوں، ادیبوں اور انہی جیسے مجاہدوں نے کیا ہے۔

بیسویں صدی کے آخری دور میں امت مسلمہ کے تمام مسائل پر گہری نظر رکھنے والی، کہیں سے بھی پیدا ہونے والے فتنہ کی مدافعت کے لئے کمربستہ رہنے والی ہستیوں میں حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ بھی تھے جن کی زندگی جہد مسلسل، عزم پیہم، محنت ولگن اور سچے ارادے کی

داستان ہے، جن کی زندگی اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کے لئے مسلسل بے لوث مجاہدے میں گزری جو کھلی کتاب کے مانند ہے۔

قاضی صاحب ۱۹۳۶ء میں ضلع دربھنگہ کے قصبہ جالے میں پیدا ہوئے، اپنے والد مولانا عبدالاحد قاسمیؒ جو اپنے وقت کے جید عالم ومناظر تھے کے سایۂ شفقت میں تعلیمی سفر شروع کیا تو مدرسہ امدادیہ لہریاسرائے دربھنگہ، مدرسہ محمود العلوم دملہ ضلع مدھوبنی اور دارالعلوم مئو ناتھ بھنجن سے ہوتے ہوئے دارالعلوم دیوبند پہنچے جہاں اپنی ذہانت وفطانت کی شناخت قائم کرکے ۱۹۵۵ء میں تکمیل تعلیم کی اور فوراً حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کی خواہش نیز حضرت شیخ الاسلام حسین احمد مدنیؒ کے حکم سے جامعہ رحمانی مونگیر میں تدریس سے وابستہ ہو گئے۔

بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں ہندوستانی مسلمانوں کی شیرازہ بندی اور ملی اتحاد قائم کرنے کی زعمائے ملت اور علمائے ہند کی کاوشوں کے نتیجہ میں قومی سطح پر "امیر شریعت" کے انتخاب کا مرحلہ جب کامیابی سے ہمکنار نہ ہوسکا تو بہار واڑیسہ کے علماء کرام اور مشائخ عظام نے اس مقصد کی تکمیل کے لئے ۱۹۲۱ء میں امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کی بنیاد پٹنہ میں ڈالی۔ آزادی کے بعد کے کشیدہ ملکی حالات اور اس کے محرک وبانی نائب امیر شریعت مولانا ابوالمحاسن سجادؒ کے انتقال کے بعد اس کا دائرۂ عمل سکڑنے لگا تھا۔ لہٰذا امیر شریعت ثالث مولانا محمد قمرالدین مجیبیؒ کی وفات کے بعد علماء ومشائخ بہار واڑیسہ کی نظریں کسی مدبر اور جری سالار کے تجسس میں بیتاب تھیں کہ قرعۂ فال مولانا منت اللہ رحمانیؒ کے نام نکلا۔ مارچ ۱۹۵۷ء میں مولانا رحمانیؒ امیر شریعت رابع منتخب ہوئے۔ جامعہ رحمانی میں مولانا مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی چند سالہ خدمات کے درمیان امیر شریعت رابع کو فاضل مدرس کے ساتھ تحریکی شعور اور فکری بالیدگی کا حامل مدبر کی شبیہ بھی مولانا مجاہد السلام میں نظر آئی اس لئے مونگیر سے اٹھا کر ۱۹۶۲ء میں امارت شرعیہ پٹنہ لے آئے اور ناظم و قاضی کا عہدہ سونپ دیا۔ جب امارت شرعیہ کا دائرۂ کار اور شعبہ دارالقضاء کا کام بڑھا تو ۱۹۶۵ء میں مولانا محمد نظام الدین صاحب (موجودہ امیر شریعت) کو نظامت سونپ کر دارالقضا کی طرف قاضی صاحب متوجہ ہو گئے۔ اس شعبہ کی بے مثال کارکردگی نے انہیں نہ صرف قاضی القضاۃ بلکہ فقیہ العصر بنا دیا

اور حضرت قاضی صاحبؒ سے ملقب ہوئے:

''دو عجیب اتفاق جمع ہو گئے ہیں، اول یہ کہ تاریخ اسلامی کے مشہور قاضی، قاضی شُریحؒ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ''اطلس'' یعنی بے ریش تھے (وفیات الاعیان لابن خلکان ۲/۴۶۱) بلا شبہ حضرت قاضی (مولانا مجاہد الاسلام قاسمی) جو یقیناً اپنے عہد کے شریح تھے وہ بھی بے ریش تھے۔ دوسرے میرے خاندان کے مورث اعلیٰ بہار کے اس علاقہ میں قاضی ہی کی حیثیت سے آئے تھے اور مسلم حکومتوں کے خاتمہ کے عرصہ بعد خلمۂ تقدیر نے پھر اس عہدہ کو اس خاندان تک پہنچایا۔''

(حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام، حیات وخدمات، افکار وآثار

مرتب: مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، ص: ۵۸)

قاضیؒ صاحب کی قیادت میں دار القضاء، امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کی شناخت قائم ہوئی اور یہ عالمی منظر نامہ پر ابھر کر آ گیا۔ قاضی صاحبؒ قانونی نزاکتوں اور فقہی نکتوں کی دیدہ ورانہ تشریح کی صلاحیتوں کے سبب اسلامی دنیا میں معروف ہوئے اور اسلامک فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ، انٹرنیشنل اسلامک فقہ اکیڈمی جدہ، المجمع العلمی العالی دمشق، الہیئۃ الخیریۃ الاسلامیۃ العالمیہ کویت کے رکن بنائے گئے۔ سعودی عرب کویت، قطر، بحرین، شام، متحدہ عرب امارات، ایران، تاجکستان، قزاکستان، ماریشش، ساؤتھ افریقہ، امریکہ، برطانیہ، بنگلہ دیش اور نیپال وغیرہ ممالک کی علمی مجالس اور سیمیناروں میں مسلسل شرکت کرتے رہے۔

اندرون ملک آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے رکن اساسی اور عمر کے آخری پڑاؤ پر اس کے صدر بھی بنے۔ اپنے تحریکی شعور اور فکری بالیدگی کے سبب فقہ وفتاویٰ کے میدان سے اوپر اٹھ کر ریفارمر اور قائد ساز کا رول بھی ادا کیا۔ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا، آل انڈیا ملی کونسل اور قاضی احمد کالج جالے، دربھنگہ قائم کیا۔ اس کالج کا افتتاح ۱۹۸۵ء میں ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی (سابق گورنر) نے کیا تھا۔ ان کے ساتھ ان کی اہلیہ بھی تھیں۔ میرے والد جناب محمد ظفر المنان ظفر فاروقیؒ مرحوم بحیثیت پولس آفیسر وہاں موجود تھے اور میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ افتتاح کے موقع پر کوثر و

تسنیم سے دھلی شستہ اردو زبان میں قاضی صاحبؒ کی تقریر نے سب کو مسحور کر دیا۔ قاضی صاحبؒ نہ صرف لفظیات اور تراکیب اس طرح استعمال کرتے تھے جیسے وہ اسی موقع کے لئے وضع کئے گئے ہوں۔ تب میں نے جانا کہ زبان کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ قاضی صاحبؒ ''انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز'' نئی دہلی کے موسس اور گورننگ باڈی کے رکن رہے، شرعیہ بورڈ آف الامین اسلامک فائنانشیل فاؤنڈیشن بنگلور کے اساسی رکن رہے، امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ وجھارکھنڈ کے دائرہ عمل کو وسعت دے کر ہمہ جہت فلاحی ورفاہی ادارہ کی موجودہ شکل دینے کے پس پشت قاضی صاحبؒ کا مدبرانہ دیدہ ورانہ ذہن ہی کارفرما رہا ہے۔ جس کے نتیجہ میں امارت کے ماتحت اعلیٰ معیار کے متعدد تعلیمی وتربیتی ادارے مثلاً المعہد العالی، للتدریب فی القضاء والافتاء، مولانا منت اللہ رحمانی ٹیکنکل انسٹی ٹیوٹ اور مولانا سجاد میموریل ہسپتال پھلواری شریف، پٹنہ، امارت ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ ساٹھی، مغربی چمپارن، امارت ٹیکنکل انسٹی ٹیوٹ پورنیہ، امارت مجیبیہ ٹیکنکل انسٹی ٹیوٹ، مہدولی، دربھنگہ وجود میں آئے۔ نائب امیر شریعت مولانا سید محمد نظام الدین صاحب کے امیر شریعت بننے کے بعد نائب امیر شریعت بنائے گئے۔ اس طرح دعوت الی اللہ کے میدان میں، مسلمانوں کی صفوں میں اتحاد پیدا کرنے میں اور ملی مسائل کے حل کرنے میں سچے ارادوں کے ساتھ پوری زندگی سرگرم عمل رہے

بقول پروفیسر اقبال احمد انصاری (معروف رہنما تنظیم حقوق انسانی، علی گڑھ):

''وہ حکمت وتدبر اور عمل سے اختلافات بلکہ نزاعات کو مثبت رخ دے کر متشددین کو معتدل راہ اختیار کرنے پر آمادہ کرنے کا بے پناہ ملکہ رکھتے تھے اور ان میں یہ صفت بھی بدرجۂ اتم موجود تھی:

شانِ خلیل ہوتی ہے اس کے کلام سے عیاں	کرتی ہے اس کی قوم جب اپنا شعار آزری

اس لئے ہر مسلک ومکتبۂ فکر کے لوگوں میں قابل قدر تھے۔''

ان کا مجاہدہ علمی وتحقیقی میدانوں میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیتا رہا ہے۔ یوں تو ان کے بہت سارے فقہی، علمی وتحقیقی مقالات، ملی مسائل پر مضامین دینی وعلمی مجالس کے خطبات عربی و

اردو میں مجلّات ورسائل اور متعدد کتابی شکل میں شائع ہوئے لیکن ان کے قلم وفکر کے عظیم الشان کارنامے ہیں، ساتویں صدی ہجری کے ہندوستان کے قاضی القضاۃ جلیل القدر فقیہ قاضی عماد الدین محمد اشفورقانی کے ۶۴۲ھ میں نوشتہ آداب قضا وافتاء پر مبنی مخطوطہ ''صنوان القضاء وعنوان الافتاء'' کی تحقیق وتدوین جو اس موضوع پر برصغیر کی پہلی تصنیف تھی۔ اسے چار ضخیم جلدوں میں حکومت کویت نے شائع کر دیا ہے۔ دوسری تدوین ''فتاویٰ امارت شرعیہ محشّی جلد اول ودوم ہے تیسری ان کی اپنی تصنیف ''اسلامی عدالت'' ہے اور چوتھا لازوال کارنامہ ہے فقہ مالکی، فقہ حنفی، فقہ شافعی، فقہ حنبلی اور ان کی روشنی میں منظر عام پر آئے مسائل ودلائل پر مشتمل تیرہویں صدی ہجری تک کے ذخیرۂ فقہ اسلامی چالیس جلدوں کی ''موسوعہ'' کو عربی سے اردو میں ترجمہ کرانا جو اردو میں پہلی فقہی انسائیکلوپیڈیا ہے۔ حالات کے تقاضے کے مطابق ملت اسلامیہ کے فکر ونظر کو مہمیز کرنے والا اردو سہ ماہی رسالہ ''بحث ونظر'' نکال کر انہوں نے میدان صحافت میں بھی انمٹ نقش چھوڑے ہیں۔

لہٰذا قاضی صاحبؒ کی پرخلوص اور گراں قدر خدمات کے صلہ میں حکومت کویت نے ''فقیہ وقت ایوارڈ'' حکومت مراکش نے ''گولڈ میڈل برائے بہترین اسلامی وعلمی خدمات'' مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن آف ساؤتھ افریقہ'' نے بہترین اسلامی شخصیت ایوارڈ انمی یعنی امریکن فیڈریشن آف مسلمس ان انڈیا نے ''مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ایوارڈ''، احکام شریعت اسلامی کی تطبیق کے لئے قائم کویت کی اعلیٰ مشاورتی کمیٹی نے ''فقہی ایوارڈ'' الامین ایجوکیشنل ٹرسٹ بنگلور نے ''کمیونٹی لیڈرشپ ایوارڈ'' اور انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز، نئی دہلی نے ''شاہ ولی اللہ ایوارڈ'' سے انہیں نوازا اور جب یہ ۴راپریل ۲۰۰۲ء کو دنیا سے رخصت ہوئے تو پوری ملت اسلامیہ کی کروڑوں آنکھیں اشکبار ہوگئیں، لاکھوں نے متعدد مقامات پر نماز جنازہ پڑھی، بلاامتیاز مذہب ومسلک پورے ملک نے تعزیت کی۔ اگلے دن (۵راپریل) سرکاری اعزاز کے ساتھ محلہ مہدولی، دربھنگہ میں اپنی رہائش گاہ کے احاطہ میں اپنی وصیت کے مطابق سپرد خاک کئے گئے۔ بہار سرکار نے اس دن سوگ دیوس منایا، پوری ملت اسلامیہ کے رسائل و جرائد نے ان پر مضامین وگوشے شائع کئے، ہزاروں صاحبان علم وقلم نے ان کے افکار وکردار اور

کمالات پر خامہ فرسائی کی۔ یہ سب یقیناً ان کی بے لوث خدمات کا ہی نتیجہ تھا۔ یہ یقیناً علامہ اقبال کے اس مصرعہ کے مصداق تھے کہ :

''بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا''

قاضی صاحب کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کرنا ایک مضمون میں ممکن نہیں بس ان کے کردار کا یہ پہلو دیکھیں کتنا مثالی ہے کہ قسمت سے انہیں کوئی وارث صلبی نہ ملا تو انہوں نے ملت اسلامیہ کی ٹیلنٹڈ نئی نسل کو اپنا علمی وفکری وارث بنانے کی ٹھان لی، اتنی بارسوخ و باوقار شخصیت کہ اگر گرجے تو ایوان اقتدار لرزا اٹھے، اتنی مشغولیت ومصروفیت کہ پل پل کسی نہ کسی کام میں لگا رہے، وی۔آئی پیز میں گھرے رہنے کے باوجود ہما شما کوئی بھی حاجت مند، عقیدت مند، قرابت مند کسی بھی وقت ان سے مل سکتا تھا اور مقصد براری ہو یا نہ ہو مگر خلوص ومحبت سے سرشار ہو کر لوٹتا تھا۔ ان کے یہاں 'بڑی شخصیت' کا سا ترک بھڑک اور تزک واحتشام کا اہتمام نہ تھا اور یہ صوفیائے کرام کا طرۂ امتیاز تھا۔ راقم الحروف کی خوش بختی کہ جب جب شرف نیاز حاصل ہوتا بڑی شفقت ومحبت سے پیش آتے۔ ہمیشہ نیک مشورے اور نیک خواہشات سے نوازتے۔ رسالہ ''تمثیل نو'' کے فروغ کے لئے کبھی ہدایت تو کبھی نیک خواہشات کا اظہار کرتے۔ یہ یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم کے سراپا نظیر تھے۔ قوم وملت انہیں کبھی فراموش نہیں کر سکتی، انہوں نے جو تاریخ ساز کارنامے انجام دیئے ہیں، جو علمی ورثہ چھوڑا ہے وہ انہیں کبھی بے نام ونشان نہیں ہونے دیں گے۔ میں اپنی بات اس قطعہ پر ختم کرتا ہوں:

پیکر ادب بھی آپ تھے مجاہد الاسلام قاسمیؒ
علم کے سبب بھی آپ تھے مجاہد الاسلام قاسمیؒ
آپ کا زمانہ تھا مرید آپ تھے وہ نقشِ اہلِ دید
ہند میں عرب بھی آپ تھے مجاہد الاسلام قاسمیؒ

❖❖❖

پیش خدمت ہے **کتب خانہ** گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے 👇
https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
📱0307-2128068
@Stranger ❤️❤️❤️❤️❤️❤️❤️

نظیرا کبرآبادی کی شاعری کے تنوعات

نظیر کی شاعری پر کچھ لکھنے سے قبل شاعری کے عمل اور آج کے شعری تناظر کو سمجھنا ضروری ہے کیوں کہ اٹھارہویں صدی کے تنقیدی نظریات کی بنیاد پر نظیر اکبرآبادی کی تفہیم اور تعبیر کی صورت بالکل مختلف ہوگی جب کہ آج کے تناظر میں نظیر کا تفہیمی حوالہ اور طریقہ کار الگ ہوگا۔

شاعری ایک مابعد الطبیعاتی عمل ہے اور کوئی بھی عمل اُس وقت تک صحیح طور پر سمجھا نہیں جاسکتا جب تک اُس عمل کے کرنے والے کے متعلق مکمل آگہی نہ ہو اس لئے منطقی طور پر شاعری کے عمل کو سمجھنے کے لئے شعر کہنے والے شخص کی وجودی حیثیت سے واقفیت ضروری ہے۔ظاہر ہے کہ معاشرے کا ہر فرد شاعر نہیں ہوتا۔کسی بھی صنف میں چند ہی افراد شاعر ہیں اس لئے شاعری کی جو تعریف کی جائے گی اُس میں اس بات کی گنجائش ہونی چاہیے کہ اس کا اطلاق وسیع ترین معنوں میں موجودات کی کثرت پر بھی ہو اور مخصوص معنوں میں شاعر پر بھی ہو۔ارسطو سے آج تک انسانی وجود کو سمجھنے کی جتنی کوششیں کی گئی ہیں اُن کی ارتقائی تاریخ کے تناظر میں یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ ہمارے فکر ونظر کے زاویے ایک جہت سے دو جہت اور دو جہت سے چہار جہات کے مراحل سے گزر کر ہمہ جہتی تناظر کے عہد میں داخل ہو رہے ہیں۔ادبی تنقید بھی اسی طرح جہات کے ارتقا سے گزر کر ہمہ جہتی دور میں آگئی ہے اور اب ہمہ جہتی ادبی تنقید ایک معین صورت اختیار کر چکی ہے۔اگر شاعری اس تعریف پر پوری نہیں اترتی تو ہم اُسے غیر تسکین بخش کہیں گے اور جو شعر جس حد تک اُس تعریف پر پورا اتر آئے گا اُس حد تک تسکین بخش کہلائے گا۔اسی طرح شاعری جو صرف جبلّت اور حسّیت کی جہتوں سے متعلق ہے اور دوسری جہتوں کا ارتفاع اپنے اندر نہیں رکھتی 'غیر تسکین بخش شاعری' ہے۔صورت کا سمٹاؤ اور معنی کا پھیلاؤ، وضعِ علامات کا سبب ہوتا ہے اور ایسی علامتوں میں بہ یک وقت ہم اپنی جبلّتوں اور ارتقائے حیات وتہذیب سے

حاصل شدہ کیفیتوں، لطافتوں اور صلاحیتوں کی جھنکار سن سکتے ہیں۔

شاعری کی ماہیئت، تہذیب و انسانیت کے مرکزی جمالیاتی و وجدانی تجربات کی اُس ماہیئت و اصلیت میں پوشیدہ ہے جہاں عقلی، اخلاقی اور جمالیاتی حقیقتوں کا ایک ماورائی عالم یا لامحدود کے مرکز کا سنگم ہوتا ہے۔ ارتقاعی منزل سے گزر کر شاعری ''عرفانِ حسنِ ذات'' بنتی ہے اور تب لامحدود کا نقطۂ ارتکاز حاصل ہوتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ نظیر کی شاعری ''تسکین بخش'' ہے، ''محدود تسکین بخش'' ہے یا ''غیر تسکین بخش''۔ نظیر کے یہاں ہر سطح کے نمونے مل جاتے ہیں۔ نظیر سے پہلے دنیائے شاعری میں صرف غزل اور غزل کی دیوی اپنی حشر سامانیوں کے ساتھ سنگھاسن پر قبضہ جمائے ہوئے تھی۔ نظیر نے اُس بُت کا فرادا کو راج سنگھاسن سے اتار کر عوامی دہلیز تک پہنچا دیا۔ اردو ادب میں نظم گو شعراء کا وجود عنقا تھا مگر شاید اوّلیت کا سہرا انہی کے سر ہے۔ اردو نظم گوئی کے موجد کی حیثیت سے اُن کے مختلف النوع مضامین سے پتہ چلتا ہے کہ اژدہے کا بچہ، سمدھن، آندھی، برسات وغیرہ وہ نظمیں ہیں جو ارتقاعی مقام تک پہنچتے پہنچتے ٹوٹ جاتی ہیں۔ یہ نظمیں کم تسکین بخش ہیں۔

بنجارہ نامہ، آدمی نامہ وہ نظمیں ہیں جو ارتقاعی احساسات سے پورا پورا انصاف کرتی ہوئی اپنا ایک مقام تو بنا لیتی ہیں مگر نقطۂ تسکین تک نہیں پہنچ پاتی ہیں۔ نظیر کی شاعری کو ہم بہت حد تک تسکین بخش یا کافی تسکین بخش شاعری کہہ سکتے ہیں لیکن مکمل تسکین بخش شاعری نہیں کہہ سکتے ہیں۔ نظیر عوام سے قریب تھا، عوامی محسوسات کا نمائندہ تھا، مقامی رنگ اُس کی شاعری کا جزو لاینفک بن گیا۔ اُسے اپنی دھرتی کے ذرہ ذرہ سے محبت تھی۔ جہاں اُس نے منقبت سرور کائنات لکھی، معجزۂ حضرت علیؑ بیان کیا وہیں کرشن کنہیا کی راس لیلاؤں کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ اُس کی شاعری کا کینوس بہت وسیع تھا۔ اُس نے مذہب سے متعلق اشعار بھی لکھے، مدح اولیا بھی بیان کیا، تمدنی نظمیں بھی پیش کیں، میلے ٹھیلے، کھیل تماشے کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ اُس کی نظموں میں حب الوطنی بھی پائی جاتی ہے۔ فطرت مدارج عمر، مختلف فصلیں اور ان کے لوازم، تصوف، حکمت، عشق و محبت، حکایات و روایات سبھی کچھ ہے اور اپنے رنگ میں خوب ہے۔ نظیر اکبر آبادی

نے تنگنائے غزل سے نکل کر اپنے طائرِ فکر کو عالمِ نظم کی جانب مرکوز کیا اور وہ بُت جو برسہا برس سے غزل کے روپ میں اپنی پرستش کروار ہا تھا اور استادانِ فن جن کی پرستش کو عین ایمان سمجھے بیٹھے تھے، متزلزل کر دیا۔ نظیر نے صدیوں کے بعد پنپنے والے نظم کے پودے کی داغ بیل ڈال کر اردو زبان کو اس لائق بنا دیا کہ عالمی ادب سے آنکھ ملانے کے قابل ہوگئی۔

نظیر کا وہ کلام جو اس کے زمانے میں عامیانہ، سوقیانہ کہا گیا آج وہ دل پسند اور معیاری ادب کا نمونہ بن گیا ہے۔ جب کوئی 'کلجگ' کے اس بند کو گنگناتا ہے:

جو اور کو پھل دیوے گا وہ بھی صدا پھل پاوے گا
گیہوں سے گیہوں، جَو سے جَو، چاول سے چاول پاوے گا
جو آج دیوے گا یاں ویسا وہ واں کل پاوے گا
کل دیوے گا، کل پاوے گا، کلپاوے گا، کل پاوے گا
کلجگ نہیں کر جگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اِس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

تو ایسا لگتا ہے کہ آج کا کوئی 'جدید شاعر' وقت کے تاروں پر مضراب زنی کر رہا ہو۔

منظر کشی میں بھی نظیر اپنی مثال آپ ہے۔ آگرے کی تیراکی کا ذکر ہو یا بلدیو جی کے میلے کا، بسنت ہو یا ہولی، شبِ برأت ہو یا عید جس پر اُنہوں نے قلم اُٹھایا منظر کشی کا کمال دکھا دیا ہے۔ بطور نمونہ نظم 'ہولی کی بہاریں' کا ایک بند ملاحظہ ہو :

جب پھاگن رنگ جھمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
اور دف کے شور کھڑکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
پریوں کے رنگ دمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
خم، شیشے، جام چھلکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
محبوب نشے میں چھکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

اسی تناظر میں ان کی بے حد مقبول نظم ''آدمی نامہ'' کا ایک بند دیکھیں جس میں طنز کا تیور

نمایاں ہے :

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں　　بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں

پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآن اور نمازیاں　　اور آدمی ہی ان کی چراتے ہیں جوتیاں

جو اُن کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

نظیر کی نظم ''بنجارہ نامہ'' دنیا کی بے ثباتی کے حوالے سے اردو ادب کے بہترین نمونوں میں شمار کی جاتی ہے۔اس نظم کا اولین بند دیکھیں:

ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا

قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارا

کیا بدھیا بھینسا بیل شتر کیا گو میں پلا سر بھارا

کیا گیہوں چانول موٹھ مٹر کیا آگ دھواں اور انگارا

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

اسی طرح نظم ''روٹی'' میں انسان کی بنیادی ضرورتوں میں سے ایک غذا کے حصول پر طنز کے تیر چلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ روٹی کے بغیر انسان کی زندگی میں کچھ نہیں۔خالی پیٹ نہ تو سیر تفریح کی سوجھتی ہے اور نہ ہی عبادت وریاضت میں دل لگتا ہے۔ایک بند ملاحظہ فرمائیں :

روٹی نہ پیٹ میں ہو تو پھر کچھ جتن نہ ہو

میلے کی سیر خواہشِ باغ و چمن نہ ہو

بھوکے غریب دل کی خدا سے لگن نہ ہو

سچ ہے کہا کسی نے کہ بھوکے بھجن نہ ہو

اللہ کی بھی یاد دلاتی ہیں روٹیاں

نظیر پر بحیثیت شاعر گفتگو کرتے ہوئے عملِ شاعری پر چند اہم باتیں کہتا چلوں کہ کوئی بھی شاعر شاعری کی تخلیق اپنے ہی ماحول کے پس منظر میں کرتا ہے۔ٹھیک اُسی طرح کوئی بھی نقاد و مضمون نگار کسی کی بھی شاعری یا کسی بھی شاعر پر طائرانہ یا غائرانہ نظر اپنے ہی ماحول کے پس منظر

میں ڈالتا ہے۔اس طرح اگر نظیر کو اور اُس کی شاعرانہ عظمت کو اُسی کے ماحول کے پس منظر میں پرکھا جائے تو اس کی شاعرانہ عظمت و اہمیت پر حرف نظر آتا دکھائی پڑتا ہے۔ساتھ ہی اُس کی شاعری عامیانہ نظر آتی ہے۔اُس کے برعکس اُس کی شاعرانہ عظمت کو آج کے تناظر میں دیکھا جائے تو شاعرانہ عظمت مخصوص اہمیت کی حامل نظر آتی ہے۔

نظیر کی تمام تر شاعری تخیلاتی رنگ کے برعکس حقیقی رنگ منعکس کرتی ہے اور یہی وہ رنگ ہے جو نظیر کو اور اس کی شاعری کو آج کی شاعری کے دور میں ایک مخصوص مقام دیتا ہے۔نظیر کو اپنے وطن سے پیار تھا لہٰذا اس کی تمام تر شاعری وطن کے گرد گردش کرتی نظر آتی ہے۔نظیر نے اپنے وطن کے تمام تر موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے اور جو بھی طبع آزمائی کی ہے وہ خوب تر کی ہے۔ اس ضمن میں معروف ناقد حقانی القاسمی لکھتے ہیں :

> ''نظیر اکبر آبادی نے عوامی معاشرت اور ثقافت کے سارے رنگ اپنی نظمیہ شاعری میں اس طرح سمو دیے ہیں کہ نظیر کی شاعری ہندوستانی سماجیات اور عمرانیات کا ایک مستحکم حوالہ بن گئی ہے۔سماجیاتی تناظر میں ان کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے معاشرت کے بہت سے زاویے سامنے آتے ہیں۔ان کے ہاں مختلف معاشرتوں کے مظہر ہیں۔مختلف طبقات کے احساسات ہیں ۔وہ فردیت کے نہیں ، اجتماعیت کے شاعر تھے۔اسی لیے نظیر اکبر آبادی کی شاعری ذات کا نوحہ نہیں معاشرے کی داستان نظر آتی ہے۔وہ لوک کتھائیں جن میں پورے ہندوستان کا سماج اپنے تمام تر رنگوں کے ساتھ موجود ہے۔ان کے ہاں طبقہ اشرافیہ کا پیدا کردہ معاشرتی جمود و تعطل نہیں تھا بلکہ ایک ایسا تحرک تھا جس نے ان کے حواس کو تجربات اور مشاہدات کے بیش بہا خزانے عطا کئے۔انھوں نے عوامی اور جمہوری آوازوں سے اردو شاعری کو روشناس کرایا۔ایک عام آدمی کو بھی نظیر کی شاعری میں اپنے دل کی آواز سنائی دیتی ہے۔''

(مضمون ''نظیر اکبر آبادی کی نظمیں'' مطبوعہ ''ایوانِ اردو'' دہلی فروری 2018ء ص:26)

حقیقت تو یہ ہے کہ نظیر نظم کا شاعر ہے اس لئے اس کے یہاں نظم کئے ہوئے تمام موضوعات کا منظر آنکھوں کے سامنے ابھرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر نظیر کے منظوم کئے ہوئے موضوعات کو دیکھا جائے تو حقیقت سامنے آجاتی ہے۔ خواہ وہ منظوم شدہ تخلیق 'موسم' سے متعلق ہو یا 'تہوار' یا 'مشاہدہ' یا 'تجربہ' یا 'اخلاق'۔ الغرض کہ ہر موضوع پر نظیر کی تخلیق داد و تحسین حاصل کر لیتی ہے اور صرف یہی نہیں کہ مخصوص درجات کے اذہان تک اُس تخلیق کی رسائی ہے بلکہ ہر قسم کے اذہان تک یعنی اعلیٰ یا ادنیٰ ہر ذہن سے نظیر کی تخلیق داد و تحسین پا لیتی ہے۔ مثال کے طور پر برسات کی بہاریں، دیوالی، آگرہ کی تیراکی، تندرستی، مفلسی، روٹیاں، کلجگ، بنجارہ نامہ، آدمی نامہ اور دیگر ڈھیر ساری نظمیں۔ المختصر یہ کہ نظیر کو اہم اور مخصوص مقام اس کے منفرد رنگِ شاعری کے تحت دینا ہی پڑتا ہے۔

پروفیسر عبدالغفور شہباز نے سب سے پہلے نظیر کی حیات اور فن کے حوالے سے کتاب ''زندگانی بے نظیر'' لکھی جس نے نظیر کو ان حلقوں میں بھی مقبول بنا دیا جہاں نظیر کا کلام پہنچا نہیں تھا۔ ان کی تقلید کرتے ہوئے نظیر کی شاعری کے حوالے سے اب تک بہت کام ہوا ہے جس کا متقاضی اس کا کلام تھا۔ نظیر کی شاعری بلاشبہ عوامی شاعری ہے۔ اس کی نظموں نے اردو نظموں کو اوجِ ثریا عطا کیا ہے اور اس نے ہی نظم کو تیز قدموں کی رفتار عطا کی ہے اور وہ کردار بھی جس کی وجہ سے اردو نظم مختلف اصناف کی بھیڑ میں بھی اپنی الگ آن بان اور شان کے ساتھ نظر آتی ہے۔ میں بلا تامل کہہ سکتا ہوں کہ آج کے جدید ذہنوں کا امام نظیر اکبر آبادی ہے اور اگر نظیر نہ ہوتا تو اردو نظم ارتقائی منزل تک نہیں پہنچتی۔

پیش خدمت ہے کتب خانہ گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے
https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
0307-2128068
@Stranger

پرویز شاہدی: ترقی پسند تحریک کی توانا آواز

ترقی پسند شاعروں میں پرویز شاہدی کو ممتاز مقام حاصل ہے۔ وہ شعری محاسن سے بھرپور آگاہی رکھتے تھے ساتھ ہی دلی کیفیات اور معاشرتی آگہی کو شعری قالب میں ڈھالنے کے فن پر انھیں دسترس تھا۔ ان کے کلام میں صالحیت اور مثبت و تعمیری لب ولہجہ نمایاں ہے۔ انھوں نے جس نئے انداز سے اپنی شاعری میں متانت، سنجیدگی اور توازن سے نئی فضا اور نئی قوت کو محسوس کرایا ہے، اس سے ان کے عہد کی خارجی کیفیات اور مشاہدات کا نیا رخ اور نیا زاویہ سامنے آتا ہے۔ شعر دیکھیں :

جس سے قائم تھا وقارِ کوہ کن   کچھ اسی پرویز کی باتیں کریں

پرویز شاہدی، جن کا اصل نام سید اکرام حسین تھا، عظیم آباد (بہار) کے ایک نجیب الطرفین سادات اور زمیندار گھرانے کے قادر الکلام شاعر اور صاحبِ طرز ادیب، مذہبیت کی پاسدار روایتی تہذیب کے علمبردار سید احمد حسین کے بڑے صاحبزادے تھے۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۱۰ء کو 'عالم منزل' واقع لودی کٹرہ، پٹنہ سٹی میں پیدا ہوئے۔ خاندانی روایت کے مطابق ابتدا میں درس نظامیہ کے تحت عربی، فارسی اور دینی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۲۵ء میں ایم ایل جبلی انسٹی ٹیوشن کلکتہ سے میٹرک کیا اور پٹنہ لوٹ گئے۔ ۱۹۳۵ء تک پٹنہ یونیورسٹی سے ایم۔ اے۔ اردو، فارسی اور قانون کی بھی تعلیم مکمل کی۔ عظیم آباد کی عصری روایت کے مطابق 'عالم منزل' میں اکثر و بیشتر شعر خوانی کی محفلیں گرم ہوا کرتی تھیں۔ ان کی صحبتوں کے اثر سے سید اکرام حسین کی طبیعت لڑکپن سے ہی موزونیٔ سخن کی طرف مائل ہو گئی۔ یوں شعر گوئی کا چسکا لگا تو اردو، فارسی کے کلاسیکی شعراء کے دواوین سے اکتساب کیا اور پرویز شاہدی کے نام سے غزل گوئی شروع کی اور غزل کے روایتی رنگ و آہنگ میں ڈوب گئے۔ اپنے شعری مجموعہ ''تثلیث حیات'' کے دیباچہ 'متاعِ فقیر'' میں لکھا ہے:

''......دوستوں کو مرعوب کرنے کی دبی ہوئی خواہش نے ناسخ کے پُرشکوہ رنگ سخن

کی تقلید کا مشورہ دیا۔ ایک عرصہ تک اس رنگ میں مشقِ سخن کا سلسلہ قائم رہا۔
جب میں بی. اے. کلاس میں پہنچا اور اس زمانے کے سیاسی اور ادبی تحریکوں میں
حصہ لینے لگا تو اپنے معاشرے کے کھوکھلے پن، اس کے تضادات، اس کے مکرو
فریب وغیرہ پر نظر پڑنے لگی۔ تضادات ہی کی گود میں تو آنکھ کھلی تھی، میں ع
''اے مری جاتی ہوئی دنیا، بڑا دھوکا ہوا'' کہہ کر خاموش ہو جانا نہیں چاہتا تھا۔
مجھے اس فنا آمادہ معاشرے پر غصہ بھی اتارنا تھا، دل کی بھڑاس بھی نکالنی تھی۔
اس لئے دنیائے ادب و سیاست کے بے خوف اور بلند آہنگ رہنمایانِ فکر و عمل
کے نقوشِ قدم کو منزل نما سمجھنے لگا لیکن اس وقت تک ع 'پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر
کو میں' کی منزل سے قدم آگے نہیں بڑھ سکے تھے، رفتہ رفتہ قوتِ تمیز پیدا ہوئی اور
میں راہبروں کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔ ہندوستان اور بیرون ہندوستان میں
جو کچھ ہو رہا تھا، اس سے ہر سوچنے والا دماغ اور محسوس کرنے والا دل متاثر ہو رہا
تھا۔ میں نے بھی اثر قبول کیا اور میری شاعری نے بھی۔'' (ص:۱۵)

یوں پرویز شاہدی کے فکر و فن میں روایت سے بغاوت کا میلان ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۵ء کے درمیان، شعور کی بلوغت کے ساتھ شروع ہوا۔ پرویز شاہدی مزید لکھتے ہیں :

''۱۹۳۵ء میں ایک جذباتی صدمہ کے زیر اثر میں پٹنہ کو خیر باد کہتا ہوا کلکتہ چلا آیا۔
میں ایک نئی زندگی شروع کرنا چاہتا تھا۔ ماضی کے نقوش کو کھرچ کھرچ کر حافظے
سے مٹانے کی کوشش کرنے لگا۔ ان میں سے کتنے ہی مٹ گئے، کتنے ہی دھندلے
ہو کر رہ گئے۔ درس و تدریس کو روزی کا وسیلہ بنایا۔'' (ایضاً ص:۱۶)

مگر وہ روایتی تہذیب کی پروردہ سرشت اور انقلاب نواز فطرت کو ہم آہنگ نہ کر سکے۔ اس لئے ان کی کلکتہ میں شروع کی گئی نئی زندگی تقریباً بیس برسوں تک غیر متوازن رہی۔ پرویز شاہدی کے ہم نشیں و ہم مشرب سالک لکھنوی نے اپنے ایک مضمون ''پرویز شاہدی'' میں لکھا ہے:

''والدین کی آنکھوں کا تارا، بھائی بہنوں کی اٹھلاتی ہوئی محبتوں کا مرکز، کتنے

ہی گلہائے منتظر کا ایک عندلیب، خوش رو وخوش لہجہ۔ پرویز شاہدی! اس نے محبتیں کیں، ناکامیاں جھیلیں، کامیاب ہوا۔ اس کا وہ بھرا ہوا شباب جیسے جوانی تنہا اسی کے حصے میں آئی ہو:

اِس پھول کا منہ چومو، اُس پھول کا منہ چومو
پھر ہٹ کے الگ جھومو، تب لطفِ جوانی ہے

پھولوں کی افراط کے باوجود امتدادِ زمانہ نے جوانی کی شان برقرار نہیں رہنے دی۔ زندگی کو محبت کی کامرانی وشکوۂ ناکامی کے علاوہ کچھ اور بھی چاہئے ہوتا ہے............ دل کے دھچکوں سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں وہ ذہنی دھچکے جو کسی حساس دانشور کے حصے میں آئے ہوں۔ آنکھ کھولی تو خود کو تہذیبِ قدیم کے گہواروں میں جھولتا ہوا پایا۔ شعور جاگا تو اس تہذیب کے غلاف، دبیز ورنگین تر ہوتے گئے لیکن جب زمانے کے اتار چڑھاؤ نے آنکھیں دکھائیں تو شعور نے ایک کروٹ لی اور معاشرے کی تصویر کا دوسرا رخ اچانک نظر آیا۔ یہ سرمایہ دارانہ نظام کے ریاکار کھوکھلے پن کا رخ تھا! برص زدہ، متعفن اور بھیانک!!

اس رخ نے پرویز کو باغی بنادیا۔ ایک انقلاب پسند باغی، انقلاب پسندی اسے اشتراکیت کے دروازے پر لا کھڑا کرتی ہے۔ پرویز کمیونسٹ ہوجاتا ہے۔"

(ماہنامہ "زبان وادب" پٹنہ پرویز شاہدی نمبر فروری-مارچ ۱۹۸۰ء)

مگر پرویز شاہدی کا کمیونزم مطلق الحادی نہ تھا جو کمیونسٹوں کا طرۂ امتیاز تھا اور نہ ان کا وطیرہ کمیونسٹوں کی طرح تمام تہذیبی اقدار کو یکسر مسترد کرنے کے عمل پر مبنی تھا۔ ان کے شاگرد رشید پروفیسر اعزاز افضل کے مطابق:

"پرویز صاحب کا کمیونزم شاید آزاد خیالی کی اس بلندی کو نہیں چھو سکا تھا جہاں پہنچ کر ائمۂ مذاہب پر سب وشتم اور قدماء کے اصولوں پر طعن وتشنیع کو سندِ جواز مل جاتی ہے۔ ان کا الحاد اتنا بے باک نہ ہوسکا تھا کہ وہ کسی مذہبی محفل میں ٹوپی

پہنے بغیر شریک ہو سکتے۔ کسی مرحوم کے ایصال ثواب کے لئے فاتحہ خوانی ہو تو پرویز صاحب کے ہاتھ سب سے پہلے اٹھیں گے۔ انشاء اللہ، ماشاء اللہ، سبحان اللہ، معاذ اللہ، الحمدللہ، جزاک اللہ اور خدا حافظ کو وِردِ دورانِ گفتگو میں جس قدر پرویز صاحب کرتے تھے، شاید صوم وصلوٰۃ کے پابند مسلمان بھی کم ہی کرتے ہوں گے۔ اپنے ہم عقیدوں کی طرح وہ بھی کمیونزم کو ملک کی ترقی کرتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے لیکن ان کی متصوفانہ تربیت نے ان میں وسعتِ نظر اور آزاد خیالی پیدا کر دی تھی، جو ہر متعصبانہ حرکت پر برہم ہو جاتی تھی۔ نقطۂ نظر کے اسی اعتدال نے ان کی شخصیت میں بڑی توانائی پیدا کر دی تھی۔''

(مضمون ''پھول مرجھا گیا خوشبو کا سفر جاری ہے'' ماہنامہ ''زبان وادب'' پٹنہ فروری مارچ ۱۹۸۰ء)

پرویز شاہدی کی اصول پسندی نے زمانے کے چلن سے سمجھوتہ نہ کیا۔ نتیجتاً وہ نہ جانے کتنی بار مرے، اپنی موت مرنے تک مگر مر مر کے جینے کے اشکِ کرب کو ٹپکنے نہ دیا بلکہ رگِ فن میں دوڑا دیا:

ان آنسوؤں کی حقیقت کو کون سمجھے گا
کہ جن میں موت نہیں زندگی کا ماتم ہے

وہ متعدد ہائی اسکولوں سے وابستہ ہوتے اور ہٹتے رہے، انسپکٹر آف دی اسکولس بھی بنے۔ مدنا پور کالج پھر رپن کالج کلکتہ کی لکچرر شپ ملی۔ یہ بھی ان کی عملی سیاست کی نذر ہوتی رہی۔ جیل کی اذیت جھیلی پھر بھی رسوائی کی پرواہ نہ کی، کیونکہ ان کا کہنا تھا:

جنوں کی رہبری میں عقل منزل تک پہنچتی ہے
وہ شہرت پا نہیں سکتا جو رسوا ہو نہیں سکتا

پامال گردنوں کی بلندی کے واسطے
خوش ہو رہا ہوں رکھ کے ہتھیلی پہ سر کو میں

اس ضمن میں سالک لکھنوی کے یہ جملے اہم ہیں:

''پرویز نے جنوں کی رہبری قبول کی، عقل کو تا بہ منزل لے جانے کا عزم کیا اور دونوں ہاتھوں سے رسوائیاں بٹور لیں۔ وہ قید و بند سے چھوٹے تو اہلِ دانش کیلئے ایک ہیرو تھے۔ ایک مفلس ہیرو!'' (ماہنامہ ''زبان وادب'' پٹنہ فروری مارچ ۱۹۸۰ء)

ہیرو، اس لئے کہ عسرت ان کے عزائم پر کمند نہ ڈال سکی، وہ صعوبتوں کی بھٹی میں تپ کر یوں بلند ہوتے گئے:

ہر پتے میں اِک دھار لئے چمکیں گے ۔۔۔ ہر سانس میں تلوار لئے چمکیں گے
دہکے ہوئے فولاد کے ہیں ہم غنچے ۔۔۔ چٹکیں گے تو جھنکار لئے چمکیں گے

یہ بہت سے ترقی پسند شعراء کا سا کھوکھلا نعرۂ مستانہ نہ تھا بلکہ اس میں جذبۂ صادق کی دھار تھی، اس کی جھنکار میں عمل پیہم اور عزم مصمم کا دم تھا۔ اس لئے وہ:

ذرا بیدار تو ہو جائے غیرت، تشنہ کامی کی ۔۔۔ لبِ میخوار کو خود چوم لیں گے بڑھ کے پیمانے

کے سراپا آرزو مند رہے۔ رجعت پسندوں، غفلت شعاروں اور منافقوں کی غیرت و حمیت کو جھنجھوڑنے میں جرأت مند رہے، کہا:

تری روح پر مسلط ترے مرگ زا عقیدے ۔۔۔ مرے پیکرِ تصور میں حیاتِ تازہ سازی
عقاب لالہ و گل کو برا کہیں کیوں کر ۔۔۔ چمن میں آگ لگی تھی ہم آشیاں میں رہے
یہ سیاست کی بلاغت ہے کہ وسعت قلب کی ۔۔۔ جو بھی چپ بیٹھا ہو، اس کو ہم نوا کہتے ہیں آپ

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی نے لکھا ہے کہ:

> ''۱۹۵۰ء میں جب میں علی گڑھ انجمن ترقی پسند مصنفین کا سکریٹری تھا، ایک 'امن کانفرنس' میں شریک ہونے کے لئے کلکتہ گیا۔ اس کانفرنس سے متعلق جہاں اور بہت سے تاثرات ذہن میں ابھی تک محفوظ رہ گئے ہیں، وہاں ایک تاثر یہ بھی ہے کہ پرویز شاہدی اس زمانے میں جیل میں تھے لیکن ان کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا یہ عالم تھا کہ وہاں ہر ادیب و شاعر اور سیاسی کارکن ان کا ہی ذکر کرتا تھا اور کانفرنس کے ہر اجلاس کے شروع میں پرویز کی کوئی نہ کوئی نظم یا غزل پڑھ کر سنائی جاتی اور پورے مجمع میں جوش و خروش کی ایک لہر دوڑ جاتی۔''

(''ہماری زبان'' علی گڑھ ۱۵ر مئی ۱۹۶۸ء)

اسی دورِ زندانی 'بکسا اسپیشل جیل' (موجودہ ضلع علی پور دوار، مغربی بنگال) میں کئی نظمیں،

غزلیں اور رباعیاں لکھیں جن کی ولولہ انگیزی لوگوں کو متاثر کرتی رہی۔ نظم ''تضاد'' اسی جیل کی یادگار ہے۔ اس میں ترقی پسند شعور کا مقابلہ رجعتی اور فراری رجحان سے اس طرح کیا ہے کہ نظم ترقی پسند تحریک کا اعلامیہ بن گئی ہے۔ اس میں فنی جمالیات اور فکری رفعت ایسی ہے کہ آج بھی اپیل کرتی ہے۔ ترقی پسند تحریک کے روحِ رواں سجاد ظہیر کا اعتراف ہے کہ:

> ''ایک خاص بات یاد رکھنے کے لائق یہ ہے کہ اگر ایک طرف پرویز انقلابی تحریکوں کے لئے کبھی کبھی وقتی قسم کی اور پروپیگنڈائی چیزیں لکھتے تھے، جس نے انہیں کلکتہ کا سب سے ہر دلعزیز انقلابی اردو شاعر بنادیا تو دوسری طرف وہ اپنے علمی اور ادبی تبحر کے سبب کلکتے کے سب سے زیادہ ثقیل اور خالص قسم کے اردو ادبی حلقوں میں بھی بے حد احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور ان کی بہترین نظمیں اور غزلیں وہ ہیں جن میں ان کی یہ علمی اور ادبی صلاحیت اور ذوقِ سلیم نئے عوامی اور انقلابی اور اشتراکی شعور اور جذبے سے مدغم ہو گئے ہیں۔ پرویز شاہدی کی غیر معمولی صلاحیت ان کی شاعری کو اگر صحیح معنوں میں جدید اور ہمعصر بناتی ہے تو ساتھ ہی ساتھ ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ ہماری بہترین کلاسیکی روایات سے جڑی ہوئی ہے اور اسی کلاسیکی شاخ کا ہی ایک نیا اور تروتازہ پھول ہے۔''

(ہفتہ وار ''حیات'' دہلی ۲۶ مئی ۱۹۶۸ء)

پرویز شاہدی کی کل شعری کائنات دو شعری مجموعوں ''رقصِ حیات'' اور ''تثلیثِ حیات'' میں سمٹ کر رہ گئی ہے۔ پہلے شعری مجموعہ ''رقصِ حیات'' کی پہلی نظم 'سازِ مستقبل' ہے جو شروع ہوتی ہے اس بیت سے: 'کتنے اصنامِ ناتراشیدہ پتھروں ہی میں کسمساتے ہیں' اور رجائیت سے لبریز، حسین دلکش تشبیہوں اور استعاروں کی صناعانہ لَے سے ابھارتی فکر انگیز اس کی تان اس بیت پر ٹوٹتی ہے: 'کس نے چھیڑا ہے سازِ مستقبل؟ آج لمحات گنگناتے ہیں'۔ یہ نظم پرویز کی شاعری کی تمہید ہے، جس میں موجزن افکار پر ان کی شاعری استوار ہے۔ ان کی شاعری میں یقیناً بتقاضائے حالات اور موقف، پروپیگنڈائی تخلیقات بھی شامل ہیں لیکن جہاں پرویز کی شاعرانہ حسیات، ان کا فلسفۂ

حیات، ان کے سیاسی مزعومات اور ان کی انسانیت پرستی بہ تمام و کمال صناعانہ قدرت کے ساتھ شعری جمالیات کے پیکر میں جلوہ گر ہوئی ہے وہاں ان کی شاعری بہتوں سے آگے نکل گئی ہے۔ نظم ''بربطِ دل'' سازِ مستقبل کی تفسیر ہے تو نظمیں ''فنکار، تضاد، رقص حیات'' ان کی شاعری کا نچوڑ ہیں۔ جہاں پرویز نے سبک روی اور استعارات و اشارات کے جادو جگائے ہیں اور مخصوص نزاکت و نفاست کو برتا ہے تو ''سازِ مستقبل، شیروانی، گل چیں، آخری ملاقات، انتظار، نامہ بر، تلچھٹ، سرد جنگ، میں اور ہم، تثلیث حیات، بے چہرگی'' وغیرہ جیسی لازوال نظمیں معرض وجود میں آئی ہیں جو اردو شاعری میں اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ نظم ''خوابوں کی سیڑھیاں'' میں پرویز نے خواب اور سائنسی حقائق کے امتزاج سے اس نئے عالم کی آئینہ سازی کی تھی جو آج ہمارے سامنے ہے۔ اس نظم میں پرویز نے خوابوں کی ایسی سیڑھیاں بنائی ہیں جن پر سائنس چڑھ کر علم و حکمت کی منزلیں طے کرتی ہیں۔ سائنسی حقائق کی شاعرانہ عکاسی ان کی کئی نظموں میں ملتی ہے مثلاً نظم ''بنت ہمالہ'' میں انہوں نے گنگا کو ہمالہ کا 'غرور سیال' کہا ہے جو مبنی بر حقیقت ہے مگر اس نوع کی نظموں میں ''خوابوں کی سیڑھیاں'' جس فنی و فکری ترفع کی حامل ہے اس کی نظیر ہمعصر شاعری میں نہیں ملتی۔ اِس نظم کا پہلا بند ملاحظہ ہو جس میں اُس وقت انسان کے خلائی سفر کی کوششوں اور دیگر سائنسی رموز کا واضح اشارہ ملتا ہے :

علم و حکمت کی یہ فلک گردی   آسماں پر یہ دشت پیمائی
یہ قدم بوسیاں ستاروں کی   ماہِ تاباں کی یہ جبیں سائی

اور اسی نظم کا آخری بند بھی دیکھیں جس میں شاعر تصوراتی شاعری سے انکار کرتے ہوئے سائنسی حقائق پر مبنی کلام پیش کرنے کا عزم کرتا ہے :

شاعرانِ حیات ہیں ہم لوگ   ہاتھ سائنس کا بٹائیں گے
زندگی خواب دیتی جائے گی   سیڑھیاں ہم بناتے جائیں گے

رومانیت سے گذرنے کے بعد انقلاب کا گن گان ترقی پسند شاعری میں عمومیت سے ملتا ہے۔ پرویز کی شاعری بھی اس سے مبرا نہیں ہے مثلاً ''کھیل اب بند کرو، انتظار، اندھیرے اجالے،

محرکات، بخشش، تجدید سفر، گل چیں وغیرہ اسی قبیل کی نظمیں ہیں مگر اس قبیل کی ان کی نظموں میں اوروں کی طرح کھلی ہوس انگیزی نہیں ملتی اور بعض نامور ہم مشربوں کا ساخستگی و شکستگی کے شکار ہونے کا اظہار ان میں نہیں ملتا بلکہ پرویز کی ایسی نظمیں اپنے اندر ایک خاص توانائی رکھتی ہیں۔ پرویز کے یہاں رومان میں بھی ایک کڑا تیوار اور تیکھا انداز ملتا ہے جو انہیں ترقی پسندوں میں ممیّز کرتا ہے۔ ان کی شاعری میں گہری اشتراکیت اور فکری رومانیت پائی جاتی ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی لکھتے ہیں :

''...... پرویز شاہدی ترقی پسند تحریک کی شاعری کی تاریخ میں ایک انفرادی جگہ رکھتے ہیں جس کا احساس ہونا چاہئے۔''

(''تاریخِ ادب اردو'' جلد دوم ص:۷۳۶)

قدیم شعری روایات کے ساتھ رومانیت اور ادبی جمالیات کو رد کرنا انتہا پسند ترقی پسندوں کی تنگ خیالی اور عصبیت پر مبنی تھا۔ اشتراکی حقیقت نگاری فنکار سے صداقتِ حیات کو فنکارانہ اسلوب میں پیش کرنے کا مطالبہ کرتا ہے جس کا حسن و جمال کے ساتھ صداقتِ حیات انسانی ساجوں کے اندر اور کائنات میں جاری و ساری ہے۔ صداقت حیات، کائنات کی جمالیاتی تنظیم سے الگ محض خارجی حیثیت نہیں رکھتی اس لئے ساجی شعور کے دوسرے پیکروں کی طرح خارجی حقیقتوں کو بھی شعر و ادب میں جمالیاتی پیکر عطا کرنا جمالیاتِ ادب کا تقاضا ہے۔ پرویز شاہدی نے اس تقاضے کو پورا کرنے میں نظریاتی عصبیت کو رد کیا ہے اور خارجی حقیقتوں کو متغزلانہ رنگ دے کر اپنی شاعری کو متمول بنایا ہے۔ اس لئے بسا اوقات ان کی نظم اور غزل میں امتیاز دشوار ہو جاتا ہے۔

اردو غزل کی صنفی روایت گنے چنے موضوعات تک محدود تھی اسلئے ترقی پسندوں نے اسے رد کیا مگر پرویز اس سے دامن کش نہ ہوئے بلکہ اپنے فراوانئ افکار کو غزل میں پرو کر اس کے روایتی حدود کو توڑ ڈالا۔ ان کے نزدیک غزل کی تنگ دامانی عذر کرتی نظر آئی۔ ان کی غزل گوئی میں کیا داخلیت اور کیا خارجیت، کوئی حقیقت اور موضوع غیر مناسب نہیں ٹھہرا بلکہ خارجی حقائق اور موضوع کی خشکی و کرختگی ان کے مالیاتی اظہارِ بیان میں کھوئی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ بقول ل. احمد اکبرآبادی :

''جمالیاتی اظہار و بیان، مخلصانہ لہجہ، شستگئ زبان، صحت الفاظ اور لفظوں کے درو

بست کا اگر فنِ شعر میں کوئی درجہ ہے تو میرے خیال میں پرویز صاحب نے غزل
میں سب ہی موضوع داخل کرنے کے ابداع کو حسن بنا دیا ہے۔''

(تقریظ بعنوان ''اشارات'' شعری مجموعہ ''رقصِ حیات'' ص: ۲۳)

یہ شاعرانہ وصناعانہ قدرت پرویز شاہدی کو طرۂ امتیاز بخشتی ہے۔ اس موضوع پر گفتگو ایک الگ مقام کی متقاضی ہے۔ ان کی غزل گوئی کے نمونے بر سبیل تذکرہ قبل بھی سامنے آچکے ہیں، موضوعاتی تنوع کا اندازہ ہو جائے اس کے لئے چند اور اشعار دیکھ لیں:

سکتے تک اب آپہنچا ہے بڑھتے بڑھتے کربِ سکوت
ہونٹوں پر کیا وقت پڑا ہے، تم بھی چپ ہو ہم بھی چپ

موقعِ یاس کبھی تیری نظر نے نہ دیا
شرط جینے کی لگا دی مجھے مرنے نہ دیا

حسن ہمدرد ترا ہم سفرِ شوق رہا
مجھ کو تنہا کسی منزل سے گذرنے نہ دیا

نہ جانے درسگاہوں کو کہاں پہنچا کے دم لے گی
یہ تعلیمی کج اندیشی، یہ بے سمتی نصابوں کی

اے زندگی! نقاب الٹ کر جواب دے
فن ہم سے پوچھتا ہے کہ فنکار کیوں ہوئے؟

اپنے سرخ ہونٹوں کی مسکراہٹیں دے دو
بجلیوں کی یورش میں آشیاں بنانا ہے

ان پڑھ آندھی گھس پڑتی ہے توڑ کے پھاٹک محلوں کے
''اندر آنا منع ہے'' لکھ کر لٹکانے سے حاصل کیا؟

پرویز نے اپنے ہم مشربوں اور ہمعصروں کے میلان کے خلاف نئی اصناف شاعری سے اجتناب برتا ہے مگر اپنی شاعرانہ صناعیوں سے نظموں، غزلوں اور رباعیوں میں بے حد کامیاب

رہے ہیں۔ ان کی شاعری خوبصورت اور نادر تراکیب، تشبیہات، فقرے اور مصرعے سے اٹی بھری پڑی ہے کہ اس کی نظیر ان کے ہمعصروں میں بمشکل ملے گی۔ یہ بات گو مسلّم ہے کہ پرویز شاہدی کا شہرہ کمیونسٹ پارٹی میں سرگرمیوں کے سبب نہیں بلکہ ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے ہے مگر مقام افسوس ہے کہ ترقی پسندوں میں ان کا نام تو آیا اور کام یعنی شاعری پس انداز ہوگئی۔ ان کے شاعرانہ کمال کی اس طور تعیین قدر نہ کی گئی جو اس کا حق ہے جبکہ بہتوں نے صرف پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہوکر بلند آہنگ نعروں کے بل بوتے عظیم بننے کے وسائل پیدا کئے لیکن پرویز نے کوہ کنی کی۔ انہوں نے جو حیات و کائنات کے ہر موضوع کی چٹانوں کو تراشنے اور انہیں اپنی آزری کے ذریعے حسین پیکر میں ڈھالنے یعنی غیر شاعرانہ اور خشک تر موضوعات کو فکر وفن کی لطافتیں دے کر ادبِ عالیہ کا جزو بنانے کی قدرت دکھائی ہے وہ ترقی پسندوں میں محض چند ہی کے یہاں نظر آتی ہے۔ انہوں نے عصری حسّیت یعنی روحِ عصر کو کلاسیکی شعری جمالیات کے قالب میں ڈھال کر جو توانا آواز پیدا کی، اس کی گونج اس تحریک کی فنا کے بعد بھی سنائی دے رہی ہے کہ ان میں آفاقی قدروں کی بھی جھلکیاں بدرجۂ اتم ملتی ہیں۔ مظہر امام کا یہ خیال صد فیصد درست ہے کہ:

> ''پرویز شاہدی کے یہاں شاداب خیالی کے ساتھ ایک والہانہ پن، سرمستی، نشاط افروز ربودگی، کھو جانے کی کیفیت، موسیقیت اور غنائیت ہے جو انھیں ان کی قبیل کے دوسرے شہرت یافتہ شاعروں مثلاً سردار جعفری، جاں نثار اختر، کیفی اعظمی وغیرہ سے ممتاز و ممیز کرتی ہے اور انہیں ایک انفرادی شان عطا کرتی ہے۔''

(کتاب ''آتی جاتی لہریں'' مضمون ''ناقدوں کے مقتول: پرویز شاہدی'' ص:۱۴۴)

لہٰذا اگر دیکھا جائے تو پرویز شاہدی کی پوری شاعری مقصد کے اظہار میں جذبے کو نمایاں کرتی ہے۔ ریاضت اور وسعت کے علاوہ ستائش وصلہ کی تمنا کے بغیر سیاسی اور سماجی احساسات کے موضوعات کو انھوں نے جس طرح مزین کیا ہے، اس سے ان کے کلام میں لسانی، فطری اور تہذیبی نمو کو دیکھا جا سکتا ہے۔

❖❖❖

پیش خدمت ہے **کتب خانہ** گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے 👇
https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
📱0307-2128068
@Stranger ❤️❤️❤️❤️❤️❤️❤️

شاکر کلکتوی: منفرد احساس کا شاعر

شاکر کلکتوی نے زندگی کی تلخ و شیریں صداقتوں سے پیدا ہونے والے محسوسات و جذبات کو اپنے کلام میں نہ صرف پیش کیا ہے بلکہ اس کی شاندار پیشکش میں اپنی فنی صلاحیتوں کا بھی بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ انھوں نے قلبی جذبات اور عشق کے معاملات کی اثر انگیزی کی تصویر کشی باریک بینی اور فنی بصیرت کے ساتھ کی ہے، جس میں زیست کے نشیب و فراز کے تجربات اور ان سے پیدا ہونے والے حالات کی مرقع کشی ملتی ہے۔ اس طرح ان کے شعور اور لاشعور میں پلنے والی فکر کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھیں زندگی کی تلخ حقیقتوں کا شدید احساس ہے جس کی کیفیت داخلی سطح سے نئی توانائی حاصل کرتی ہے اور فن کے ارتقا کی راہیں سبک روی، اخلاص اور احتیاط کے ساتھ طے ہوتی نظر آتی ہیں جو فکری اور عصری صداقتوں کی طرف ہماری توجہ مرکوز کرتی ہیں۔ ان کے یہاں انتشار و اضطراب کا جو رنگ و آہنگ ابھرا ہے، وہ اُن کے عہد میں اُن کی انفرادیت کو واضح کرتا ہے۔ ان کی غزلوں سے چند اشعار دیکھیں :

عشق میں جو مدعا دل کا تھا پورا ہوگیا — میں نے آج اپنے کو خاکِ کوئے جاناں کردیا

تابکے سنتا رہا آخر کسی کا غم کوئی — مجھ سے آزردہ مرا ہر ہم نشیں ہونے لگا

جب سلامت ایک گل تو نے نہ چھوڑا باغ میں — بلبلوں کو زندہ پھر کیوں اے خزاں رہنے دیا

ہے گردشِ گردوں سے شاکر یہ گلہ مجھ کو — اک حال میں ظالم نے رہنے نہ دیا مجھ کو

اسے غرور تھا اور مجھ کو پاسِ خودداری — میں آپ جا نہ سکا اور وہ مجھے بلا نہ سکا

التفات آج اُس کا پھر شوق آفریں ہونے لگا — پھر مجھے اس کی محبت کا یقیں ہونے لگا

اے خوشا وہ دردِ جاں پرور کہ میرے دل میں ہے — ایک آسانی کا پہلو بھی مری مشکل میں ہے

شاکر کلکتوی کے کلام کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے اشعار بالخصوص مقطعوں میں ظلم

وجبر واستبداد کی طرف اشارے کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ چند اشعار مقطع کے ملاحظہ ہوں :

یہ بات عشق میں جائز تو تھی مگر شاکر — جفائے دوستاں کا شکوہ زباں پہ لا نہ سکا

وہ ظلم کرتے ہیں کہ میں شاکر ہوں شکوہ سنج — اور ہے یہ بات رسم ورہِ عاشقی سے دور

منہ سے چاہے نہ کچھ کہے شاکر — اس کا شکوہ مگر نگاہ میں ہے

شاکر کلکتوی کے یہاں زندگی کے ناہموار حالات کی پرچھائیاں صاف دکھائی دیتی ہیں اور تضاد، انتشار اور اشتراق کی تصویریں عکس ریز نظر آتی ہیں۔ انھوں نے اپنے افکار کے اظہار کے لئے مقطعے سے فائدہ اٹھایا ہے۔ شاکر کلکتوی کی شاعری کے متعلق معروف شاعر، ادیب اور صحافی مصطفیٰ اکبر رقم طراز ہیں :

"شاکر کلکتوی کے کلام کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے مومن کی طرح مقطع میں اپنے تخلص سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ تخلص کے بامعنی استعمال سے مقطع کو بھرتی کے شعر کے بجائے غزل کا لازمی حصہ بنادیا ہے، جو غزل میں دوسرے شعروں کی طرح دلچسپ اور باوقار نظر آتا ہے۔"

(مونوگراف "شاکر کلکتوی: حیات وفن" ص:۸۶)

شاکر کلکتوی علامہ رضا علی وحشت کے چہیتے شاگرد تھے۔ وہ آج بھی وحشتِ ثانی کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کی ولادت ۲۳؍نومبر ۱۹۱۴ء کو اور وفات ۴؍جولائی ۱۹۶۸ء کو کلکتہ ہی میں ہوئی۔ عمر کے ساتھ ساتھ ان کی ادبی زندگی بھی مختصر رہی۔ اس کے باوجود انھوں نے اردو غزل کی شاندار روایتوں اور اعلیٰ قدروں کی پاسداری میں فکر وفن کے وہ نمونے پیش کئے ہیں جو شعری ادب کا سرمایہ بن گئے ہیں۔ وہ بنگلہ نژاد تھے لیکن اردو کے مستند شاعر ہوئے۔ انھیں اردو اور فارسی پر زبردست عبور حاصل تھا۔ علامہ وحشت کے معتقد تھے اور ان ہی کے رنگ میں شاعری کرنا اپنے لیے باعثِ افتخار سمجھتے تھے اور وحشتؔ کو بھی اپنے شاگرد اور ان کی شاعری پر ناز تھا جس کا ذکر انھوں نے بار بار کیا ہے۔ بزرگ شاعر وادیب جناب حلیم صابر اپنے مضمون "جانشینِ وحشت: طاہر علی شاکر کلکتوی" میں لکھتے ہیں :

''شاکر کلکتوی اگر چہ روایتی انداز میں شعر کہتے تھے لیکن ان کا رنگِ تغزل علامہ وحشت کو مرغوب تھا۔ ہمیشہ ان کی پذیرائی کیا کرتے تھے۔............ یہ حقیقت ہے کہ شاکر صاحب غزل' خالص غزل کے رنگ میں کہنے کا ہنر جانتے تھے۔''

(روزنامہ ''اخبارِ مشرق'' کولکاتا مورخہ ۹ ردسمبر ۲۰۱۸ء)

وحشت نے انھیں استادِ فن قرار دے کر ایک طرح سے اپنا جانشیں تسلیم کر لیا تھا۔ وحشت کو شاکر کلکتوی کی فنی خوبیوں کا بخوبی اندازہ تھا۔ اس کا ذکر انھوں نے اپنے خطوط میں جا بجا کیا ہے۔ وحشت کے خطوط کا مجموعہ ''مکاتیبِ وحشت'' کے نام سے بزمِ شاکری، کلکتہ کے زیر اہتمام شائع ہوا جس کے مرتبین شاکر کلکتوی اور ان کے شاگرد شمس الدین احمد عازم تھے۔ شاکر کلکتوی کے شعور فن اور مزاجِ شاعری سے متاثر ہو کر وحشت نے اپنے مقطع کے شعر میں ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ یہ شعر بہت مشہور ہوا :

نہیں ہے شعر میں وحشت کا ہم نوا کوئی
بس ایک شاکرِ خوش فکر ہے خدا رکھے

اس شعر سے شاکر کلکتوی کی عظمت و مرتبت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ علامہ وحشت کی زندگی میں ہی شاکر کلکتوی کی شاعرانہ عظمت کے سبب ان کے تلامذہ کی تعداد میں زبردست اضافہ ہوا اور ہندوستان کے مختلف علاقوں سے اصلاح کے لئے ان کے پاس کلام پہنچنے لگے۔ شاکر کلکتوی کے شاگردان کا بیحد احترام کرتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے شاگردوں نے کلکتہ میں ۱۹۳۷ء میں ''بزمِ شاکری'' کی بنیاد ڈالی جس کے متعلق وحشت کا یہ شعر اس کی اہمیت و افادیت کو واضح کرتا ہے :

خوب ہے بزمِ شاکری وحشت
جس کو با فیض و با اثر دیکھا

شاکر کلکتوی کی شہرت کلکتہ اور بنگال کی حدود سے گزرتی ہوئی مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) اور ہندوستان کی دیگر ریاستوں تک جا پہنچی لہٰذا ''بزمِ شاکری'' کی شاخیں ڈھاکہ،

چٹا گاؤں، دربھنگہ (بہار) اور دیگر مقامات پر بھی قائم ہوئیں۔ ۱۹۸۷ء کے آس پاس ''بزمِ شاکری'' دربھنگہ کا ایک مشاعرہ لال باغ اسکول میں منعقد ہوا جس میں راقم الحروف کی بھی شرکت ہوئی تھی۔ اس مشاعرے میں کلکتے سے شاکر کلکتوی کے شاگرد اور ''بزمِ شاکری'' کے اس وقت کے سکریٹری جناب غلام حسین ایاز تشریف لائے تھے۔ مشاعرہ کے منتظم جمیل احمد جمالپوری تھے۔ دیگر شرکاء میں حسن امام درد، اویس احمد دوراں، پروفیسر ایم اے ضیاء، ڈاکٹر منصور عمر وغیرہ بھی شامل تھے۔ مشاعرہ طرحی تھا۔ شاکر کلکتوی کے مصرعہ ''ہم بلاؤں کا کہاں تک سامنا کرتے رہیں'' پر راقم الحروف نے بھی غزل پیش کی تھی جو میرے دوسرے مجموعہ ''نیلم کی آواز'' (مطبوعہ ۲۰۱۴ء) میں شامل ہے۔ میری غزل کا ایک شعر یوں ہے :

ہم بھی اک انسان ہیں گھبرا کے کہہ دیں گے کبھی
''ہم بلاؤں کا کہاں تک سامنا کرتے رہیں''

شاکر کلکتوی کے دو مجموعہ ہائے کلام ''پری خانۂ الفت'' (غزلیں) اور ''شاہ کار قصیدے'' (رمضانی قصائد) ''بزمِ شاکری'' کلکتہ کے زیرِ اہتمام شائع ہوئے ہیں۔ اس بزم کے موجودہ معتمد عمومی جناب مصطفیٰ اکبر ہیں۔ انھوں نے ہی مغربی بنگال اردو اکاڈمی کے لئے شاکر کلکتوی کی حیات و شاعری پر مونوگراف لکھ کر ان کی حیات و خدمات کے مختلف گوشوں کو اجاگر کیا ہے۔ اردو اکاڈمی نے شاکر کلکتوی کی یاد میں ایک ایوارڈ ۲۰۱۷ء سے جاری کیا۔ ۲۰۱۷ء کا ایوارڈ شاکر کلکتوی کے عزیز شاگرد اور صوفی شاعر سجاد شاکری کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ راقم الحروف (ڈاکٹر امام اعظم) کی زیرِ اشاعت کتاب ''یہی کولکاتا ہے!'' (مختصر منظوم تاریخ) میں شاکر کلکتوی کے حوالے سے نثری نظم کا ایک حصہ شامل ہے جو اُن کی شاعرانہ عظمت کو واضح کرتا ہے :

عکس و آئینہ کے درمیان پروردہ حقیقت کی تلاش/ وقتی طور پر دھندلی ہوسکتی ہے
......لیکن/ یہاں تو عقل حیران ہے/ وحشت کا نام جس مقام پر آ کر ختم ہوتا ہے/
شاکر کا نام بلاواسطہ وہیں سے شروع ہوجاتا ہے/ ایسی مماثلت اور قدرِ مشترک/
جو ایک تجربہ بھی ہے اور سچائی بھی/ جس رشتے کا دائرہ وسیع ہوتا ہے/ ایک تصویر

چھوڑ جاتا ہے/ جو خود بخود ایک پہچان بن جاتی ہے/ یعنی ایک آئینہ کے مقابل
دوسرا آئینہ/ یہ ایک ایسا روحانی سلسلہ ہوتا ہے/ جہاں کارکردگی، ترسیل کا ذریعہ
بن جاتی ہے/ ممکن ہے یہ دُور بینی کا ایک سرا ہو/ مبارک باد کے مستحق ہیں شاکر
کلکتوی/ جنھوں نے معنویت انگیز طرزِ اظہار کی اہمیت کو/ اپنی ہمہ گیر صفات
میں سمویا/ اور ہمیں نیا حوصلہ، نیا مواد اور نیا اسلوبِ سخن عطا کیا/ جو لفظوں کی
حلاوت اور حرارت بن کر سرمایۂ ادب بن گیا/ انھوں نے اپنے محترم استاد کے قلم
کے ساتھ/ ان کے ذہن کو بھی نشانِ راہ بنایا/ ان کی حیات اور فن پر/ مصطفیٰ اکبر کا
مونوگراف/ کلکتہ کی ادبی تاریخ کا اہم باب/ قارئین کو تحقیق کی نئی راہ دکھاتا ہے/
ہاں وہی جو پہلے کلکتہ تھا/ اب کولکاتا ہے!

مختصر یہ کہ شاکر کلکتوی کو اردو کے ناقدوں اور محققوں نے نظر انداز کیا لیکن ان کا اسلوبِ سخن، اندازِ فکر اور طرزِ بیان آج بھی ہمیں از حد متاثر کرتا ہے۔ مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے دیر سے ہی سہی، مونوگراف لکھوا کر ان کی پذیرائی کی ہے، جو مستحسن قدم ہے۔ امید ہے کہ اس کتاب کے بعد شاکر کلکتوی کے فن پر اہلِ نقد و نظر کی فکر و تحریر کا سلسلہ جاری رہے گا۔

پیش خدمت ہے کتب خانہ گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے 👉
https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
0307-2128068 📱
@Stranger ❤️❤️❤️❤️❤️❤️❤️

مظہر امام کی شاعری ''زخمِ تمنا'' کے حوالے سے

دربھنگہ کا ادبی منظر نامہ طویل عرصے پر محیط ہے جس میں سمندر اور قطرے کی تخلیق بھی ہوتی رہی ہے جو بظاہر روایتی شاعری سے منسلک ہے لیکن نئے فن کی جلوہ نمائی بھی ہوئی ہے۔ اسی سرزمین دربھنگہ سے اظہار کے سچے وسیلے کو مظہر امام نے صبح صادق عطا کیا ہے۔

مظہر امام ان تخلیق کاروں میں سے ایک ہیں جن کی شخصیت اور فن کاری دونوں متاثر کن ہیں۔ ان کی شخصیت کے مختلف گوشے اردو شعر و ادب کی توانا روایت کی ترویج سے آراستہ ہیں۔ ان میں ایک طرح کی سنجیدگی، متانت اور زبان سے والہانہ عشق کی حد تک وارفتگی شامل ہے۔ ان کی شخصیت کی تعمیر میں ان کے ذاتی کشف و وجدان کے علاوہ ان کے آباء واجداد سے حاصل شدہ علمی و تربیتی جواہر شامل ہیں، جو صوفیائے پنجاب سے تعلق رکھتے تھے۔ جن دنوں ان کے والد سیّد امیر علی مونگیر میں ہیڈ پوسٹ ماسٹر تھے، ان کے گھر ۱۲/ مارچ ۱۹۲۸ء (میٹریکولیشن کی سند کے مطابق ۵/ مارچ ۱۹۳۰ء) کو علی الصبح مظہر امام کی پیدائش ہوئی اور ۳۰/ جنوری ۲۰۱۲ء کو دہلی میں انتقال ہوا۔ ابتدا میں مظہر امام کو شعر و ادب سے ایک طرح کی بیزاری تھی اور درسی کتابوں کی طرف تمام توجہ مبذول رہتی تھی لیکن ۱۹۴۱ء میں دربھنگہ میں مقامی انتظامیہ کی جانب سے زراعتی نمائش کے موقع پر ایک طرحی مشاعرہ منعقد ہوا، شعرا کو جگر مرادآبادی کا یہ مصرع بطورِ طرح دیا گیا تھا: 'نادیدہ اک نگاہ کیے جا رہا ہوں میں'۔ یہی وہ پہلا مشاعرہ تھا جس میں مظہر امام نے شرکت کی اور اسی شرکت نے ان کے ادبی اور شعری ذوق کو مہمیز لگائی۔ مظہر امام کو لکھنے لکھانے سے دلچسپی تیرہ سال کی عمر میں پیدا ہوئی۔ پہلے افسانے لکھے، پھر شعر کہنے لگے۔ غزل، آزاد غزل، نظم، نظم معریٰ، آزاد نظم، ترائلے، سانیٹ جیسے اصناف میں طبع آزمائی کی۔

مظہر امام کا تعلق متھلا کی اُس دھرتی سے تھا جہاں مہاکوی ودیاپتی کے نغموں کی گونج آج

بھی سنائی دیتی ہے۔ متھلا کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہاں کے لوگ بہت ہی نرم مزاج اور نرم لہجے کے مالک ہیں۔ ان کی گفتگو میں شیرینی ہوتی ہے۔ سخت بات بھی بہت ہی نرم لہجے میں کہتے ہیں۔ یہ میتھلی زبان کی بھی خوبی ہے اور یہاں کے کلچر کی بھی۔ اُن دنوں دربھنگہ میں شعر وسخن کا اچھا خاصا چرچا تھا۔ ان کے ماموں منظور احمد نظر اور افتخار احمد دہر ناصری کا شعر وادب میں انہماک ان کے پیشِ نظر تھا۔ اس کے علاوہ سیّد محمد کریم تمنا (شاگرد نوح ناروی) اور حکیم علیم الدین سوز اس سہسرامی کی معرکہ آرائیوں کا چرچا بھی تھا۔ فلسفیانہ آگہی کے شاعر مولانا طہ الٰہی فکری، انقلابی شاعری کرنے والے مولانا عبدالعلیم آسی اور نرم لہجہ اور تیکھے انداز میں شعر کہنے والے محسن دربھنگوی یہاں کے مشاعروں کے معتبر شاعر سمجھے جاتے تھے۔ ان ہی دنوں یعنی ۱۹۴۱ء میں دربھنگہ سے ایک معیاری ادبی ماہنامہ 'ہمالہ' کا اجرا ہوا جس کے مالک مولانا اعجاز احمد نستوی تھے اور ادارت میں ش. مظفر پوری، عبدالعلیم آسی اور حسنین سیّد جامعی کے نام تھے۔ اس ماحول نے مظہر امام کے ادبی ذوق کو ایک منظر عطا کیا۔ مظہر امام نے ۱۹۴۵ء میں مولانا عبدالعلیم آسی، افتخار احمد دہر ناصری، حسن امام درد، سیّد منسوب حسن کے ساتھ مل کر ''اردو ادارہ'' قائم کیا۔ کچھ عرصہ بعد ان کی کوششوں سے انجمن ترقی پسند مصنّفین کی شاخ بھی یہاں قائم کی گئی۔ اس کے پہلے سکریٹری منظر شہاب تھے لیکن ان کے پٹنہ چلے جانے کے باعث سارا کام مظہر امام ہی دیکھتے تھے۔ جنوری ۱۹۴۹ء میں انھوں نے منظر شہاب کے ساتھ مل کر ترقی پسند ادبی جریدہ ''نئی کرن'' کا اجراء کیا۔ اس کے تین شمارے طویل وقفوں پر شائع ہوئے اور مقتدر ادبی حلقوں میں اس جریدے کی غیر معمولی پذیرائی ہوئی۔

مظہر امام نے اپنی شاعری کی ابتدا اور اپنے علمی فکری ذوق کے بارے میں ''زخمِ تمنا'' کے دیباچہ ''اعتراف'' میں اظہار اس طرح کیا ہے:

> ''میرے خیال میں میری شاعری کی باضابطہ ابتدا ۱۹۴۸ء سے ہوتی ہے۔ اُس وقت تک فن اور زبان کی معمولی شد بد کے ساتھ ساتھ مجھے اپنے جذبات و محسوسات کے اظہار کا تھوڑا سا سلیقہ بھی پیدا ہو چلا تھا۔ اپنے کلکتے کے قیام کے

زمانے میں ۱۹۵۳ء اور ۱۹۵۵ء کے درمیان میری جذباتی زندگی نامحسوس، غیر مرئی بہاروں سے آشنا ہوئی۔ میرے بعض خوابوں نے حقیقت کا پیرہن پہنا اور وہ امنگیں جواب تک قلب کے زنداں میں محبوس تھیں، کھلی فضا میں سانس لینے لگیں۔ یہی وہ زمانہ ہے جب میری شاعری میں حوصلوں اور ولولوں کی صبح جگمگائی اور میرے فکروشعور سے رجاونشاط کی شعاعیں پھوٹیں۔" (ص:۱۳)

اپنی زندگی میں پیش آنے والے اہم واقعات اور نجی خانگی تجربات ومحسوسات کا اظہار کرتے ہوئے، مزید فرماتے ہیں :

"میری زندگی میں چکاچوند پیدا کرنے والے واقعات نہیں ہیں۔ ایک معمولی، غیر اہم زندگی ہے جو اسی نہج سے گذر رہی ہے، جیسی عام لوگوں کی زندگی گذرتی ہے......وہی بے یقینی، بے تعلقی، بیزاری، جذباتی ناآسودگی اور احساسِ تنہائی۔ جو تلخیاں مجھے ودیعت ہوئی ہیں، میں بلاشرکتِ غیرے ان کا حق دار نہیں ہوں۔ یہ تلخیاں میری رگوں میں ہی نہیں، بلکہ معاشرے کی شریانوں میں بھی سرایت ہیں۔ ان تلخیوں کو اپنی شاعری میں حتی الامکان معتدل بنانے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ اگر تھوڑی سی رجعت پسندی کی اجازت دی جائے تو میں اپنے والد سیّد امیر علی کا ذکر کرتا چلوں جو اگر میری کم عمری میں ہی وفات نہ پاتے تو شاید میرے فکروعمل کے دھاروں کا رخ کسی بہتر سمت ہوتا۔ مرحوم کو شعروادب سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا، لیکن ان کی شرافتِ نفس اور اخلاق وکردار کی بلندی نے مجھے ہمیشہ متاثر کیا اور اگر مجھ میں روحانی اور اخلاقی طہارت کا تھوڑا سا شائبہ بھی موجود ہے یا میری شاعری میں نرمی اور لطافت کا ہلکا سا عکس بھی نظر آتا ہے تو اسے میں بالواسطہ انھیں کا فیض سمجھتا ہوں۔" (ص:۱۴-۱۵)

مظہر امام نے جدید شعروادب کے خزانے میں بیش بہا اضافے کیے ہیں۔ انہوں نے ۱۹۴۵ء میں صرف سترہ سال کی عمر میں ایک نئی صنف سخن "آزاد غزل" کی داغ بیل ڈالی جو تمام

برصغیر میں زیر بحث رہی ہے۔ ڈھائی سو سے زائد شعراء نے اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے اور اس تعداد میں بدستور اضافہ ہوتا رہا ہے۔ آزادغزل کے مختلف شعراء کے کئی مجموعے منظرعام پر آچکے ہیں۔ ہندو پاک کے کئی رسائل نے اس صنف پر خصوصی گوشے شائع کیے ہیں جن میں ''شاعر'' (ممبئی)، ''جدید ادب'' (پاکستان)، ''اسباق'' (پونا)، ''توازن'' (مالیگاؤں) اور ''کوہسار'' (بھاگلپور) اہم ہیں جنھوں نے مظہر امام کی ایجادکردہ اس صنف میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ماہنامہ ''کتاب نما'' (نئی دہلی) نے مظہر امام کا تیار کردہ ضمیمہ ''آزادغزل کا منظر نامہ'' (آزادغزل: اشاعت کے پچیس سال) ایک خصوصی شمارہ کی شکل میں اپریل ۱۹۸۸ء میں شائع کیا تھا۔ اس صنف کی ایجاد دربھنگہ میں ہوئی لیکن اس کا دائروی عمل پوری اردو دنیا پر گردش کرتا رہا ہے۔ مظہر امام کی پہلی آزادغزل دربھنگہ سے نکلنے والے سہ ماہی رسالہ ''رفتارِنو'' (۱۹۶۲ء) میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد اسی سال ان کا مجموعہ ''زخمِ تمنا'' منظرِعام پر آیا جس میں ایک آزادغزل شامل تھی، جس کا ایک اشعار ملاحظہ ہو:

ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا آپ ہیں
عشق طوفاں ہے، سفینہ آپ ہیں

اردو شاعری کا ذکر ہو اور غزل کا ذکر نہ آئے یہ ناممکن ہے۔ اگر ہم یہ کہہ دیں کہ اردو شاعری کی شناخت غزل سے ہے تو غلط نہ ہوگا۔ غزل دھان پان مزاج رکھتی ہے یعنی انتہائی نازک صنفِ سخن ہے۔ اس کی جمالیاتی خوبیاں ہر دور میں ذہن و دل کو اپنی طرف کھینچتی رہی ہیں۔ اس کا اثر اتنا گہرا رہا ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں یہ دخیل رہی ہے اور ہزاروں اشعار ایسے ہیں جو زبان زدِ عام ہیں، اور ضرب الامثال کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہماری تہذیب اور روایت کا حصہ بن چکے ہیں۔

ترقی پسند اور جدید غزل گو شعراء میں مظہر امام ایک بلند پایہ شاعر ہیں۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''زخمِ تمنا'' ہے جس میں ۵۱ر غزلیں، ار آزادغزل اور ۳۹ر نظمیں شامل ہیں۔ مظہر امام نے قومی اور بین الاقوامی انتشار کا تذکرہ اپنے مجموعہ کے دیباچہ میں کیا ہے۔ انہوں نے اسی سلسلے میں جذباتی ناآسودگی کے ساتھ ساتھ تنہائی کے احساس کا ذکر بھی کیا ہے پھر بھی کچھ لوگوں کا خیال ہے

کہ مظہر امام اچانک ترقی پسندی کو رد کر کے جدیدیت کے قلعے میں داخل ہوئے تھے۔ اس کتاب کی ابتدا ایک شعر سے کی گئی ہے:

ڈھونڈا ہے اگر زخم تمنا نے مداوا
اک نرگسِ بیمار کی بات آ ہی گئی ہے

یہ شعر مظہر امام کی ذہنی کیفیت کا پتہ دیتا ہے۔ حادثے زندگی میں آتے رہتے ہیں اور انسان کی ہر خواہش کا پورا ہونا ممکن بھی نہیں۔ مگر کچھ ایسی خواہشیں بھی ہیں جو کبھی کبھی زخم کی صورت اختیار کر لیتی ہیں اور ان کا مداوا یا علاج آسان نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں نا آسودہ خواہشیں، نئی دشواریاں اور نئی صعوبتیں اور الجھنیں پیدا کر دیتی ہیں۔ ان ہی الجھنوں کے گرفتار مظہر امام شاعری میں مختلف زاویے سے اپنی حیات کے شب و روز کی عکاسی کرتے ہیں۔ اسی مجموعہ کی پہلی غزل کا ایک شعر ہے کہ:

فروغِ حسن سے صیقل ہوئی دماغوں کو
کمالِ عشق سے عالم میں انقلاب آیا

اس میں حسن و عشق کا روایتی تصور نہیں۔ حسن ایک ایسی تجلی ہے جس سے عقل جلا پاتی ہے اور عشق ایک ایسی طاقت ہے جو انقلابوں کا سرچشمہ ثابت ہوئی ہے۔ مظہر امام زندگی کی جدوجہد میں ہمیشہ خود کو شریک رکھتے ہیں۔ وہ کبھی راہ فرار اختیار نہیں کرتے، ایک پرسکون زندگی کی تمنا کسے نہیں ہوتی، لیکن صعوبتوں کا مقابلہ کیے بغیر کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ان کا ایک شعر ہے:

افق پہ ذہن کے قوس قزح سی لہرائی
بہت دنوں پہ یکایک ترا خیال آیا

اس شعر سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عشق و جنس کے تصور میں ان کے ابتدائی دور میں بھی کافی تبدیلی آئی تھی اور یہ تبدیلی مظہر امام کے یہاں بھی موجود تھی۔ جہاں عورت کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیت بدلی ہے وہاں مرد کے ذہنی اور نفسیاتی رویے شاید عورت سے بھی زیادہ تبدیل ہوئے ہیں۔ گونا گوں مسائل میں کھوئے انسان کی وفا، محبت، خلوص اور یاد کے تصورات بھی بدلے ہیں، پہلے یاد آتی تھی

تو آتی ہی چلی جاتی تھی۔ اب یاد آنے کے لئے اسباب کی ضرورت ہوتی ہے۔ مظہر امام نے اسی کیفیت کا اظہار مندرجہ بالا شعر میں کیا ہے۔ ٹوٹتے، بکھرتے خوابوں کا یہ سلسلہ دراز ہے اور ان خوابوں کو کب تک سمیٹا جائے۔ آج کے دور میں وقت مہلت نہیں دیتا۔ اگر بھولی بسری یادیں کبھی آجاتی ہیں تو ایک لذت کا احساس ہوتا ہے مگر ساتھ ہی وہ مسلسل لگاؤ کی کیفیت جو عشق کے اصول میں لازمی وضروری سمجھی جاتی تھی اب باقی نہیں رہی۔

اردو کی عشقیہ شاعری میں وصل وفراق کے قصے عام ہیں لیکن مظہر امام کی شاعری کے ابتدائی دور میں انسان اپنی ناپائیداری کو شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ کس لمحہ کیا ہو جائے کوئی نہیں جانتا۔ اس کا وجود کب شاخ گل سے ٹوٹ جائے اور برگِ آوارہ کی طرح بکھر جائے۔ اس دور میں وصل کی لذت میں کرب کا احساس بھی ہوتا تھا کیونکہ مسائل اور وصل کے درمیان ایک خلیج حائل ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مظہر امام کے یہاں ایسے عناصر کی نشان دہی ہوتی ہے:

یہ دورِ غم ہے، تیرے تغافل کا آئینہ
شام فراق ہے، نہ یہ صبح وصال ہے

تغافل محبوب کا پرانا شعار رہا ہے۔ لیکن اس کو نئے زاویے سے دیکھنے کا کام بہت کم لوگوں نے کیا ہے۔ محبوب کے تغافل پر پڑے تمام پردوں کو مظہر امام اس طرح اٹھاتے ہیں:

اب اگر تیرے تغافل سے گلہ ہے تو بجا
تو نے ہی مجھ کو بڑے پیار سے دیکھا تھا کبھی

مظہر امام کے مجموعہ ''زخم تمنا'' میں شامل غزلوں میں کچھ ایسے احساسات بھی ہیں جن کو کوئی نام نہیں دیا جا سکتا اور اگر ان کو کوئی نام دے بھی دیا جائے تو ان کی صحیح کیفیت کی ترجمانی لفظوں میں ممکن نہیں ہے۔ گرچہ وہ احساسات نئے نہیں ہیں لیکن اتنے واضح طور پر اپنی رعنائیوں کے ساتھ روایتی شاعری میں دیکھنے کو نہیں ملتے۔ مثلاً :

کسی کی بزم میں گذرے ہوئے حسیں لمحو!
قریب آؤ، کہ جی بھر کے تم کو پیار کریں

مظہر امام کے یہاں عشق و محبت کا تصور بھی جدید ہے لیکن اس میں ترقی پسند عناصر کی جلوہ گری نظر آتی ہے جس سے وہ متاثر تھے۔ مکمل خود سپردگی جو عشق کی معراج تصور کی جاتی ہے ان کے دور میں ممکن نہیں تھی اس لیے ایسے شعر جو اس دور کے احساسات سے تال میل نہیں کھاتے وہ یقینی طور پر تقلیدی تھے۔ مظہر امام کا نیا ذہن کہتا ہے :

چلو ہم بھی وفا سے باز آئے
محبت کوئی مجبوری نہیں ہے

مظہر امام کا ایک نہایت مشہور شعر ہے، جو ایک معروف فلم ''گمنام'' کے مکالمے میں بھی شامل کیا گیا ہے۔ سادگی میں پرکاری اسے ہی کہتے ہیں:

آپ کو میرے تعارف کی ضرورت کیا ہے؟
میں وہی ہوں کہ جسے آپ نے چاہا تھا کبھی

غزل جیسی نازک صنف سخن کے لیے مظہر امام کا شعری رویہ صناعانہ اور چابک دستانہ ہے۔ ان کی غزلیں اپنے اندر ایمائیت اور معنوی تہہ داری رکھتی ہیں۔ احساسات کی شدت کبھی فن کارانہ اظہار پر حاوی نہیں ہوتی۔ انہوں نے غزل کے بانکپن کو روایتی پس منظر میں بھی قبول کیا ہے اور نئی جہتیں تلاش کرنے پر بھی توجہ کی ہے۔ ''زخم تمنا'' میں شامل بیش تر غزلوں میں ان کا لب ولہجہ ان کے دوسرے مجموعہ ''رشتہ گونگے سفر کا'' اور تیسرے مجموعہ ''پچھلے موسم کا پھول'' سے مختلف ہے۔ ملاحظہ ہوں ''زخم تمنا'' سے چند اشعار :

کاکلِ وقت میں سلجھاؤ نظر آتا ہے
آپ نے زلف پریشاں کو سنوارا تو نہیں؟

خواب دیکھے تو بہت میں نے شبستانوں میں
تو مرے خوابوں کی تعبیر ہے، معلوم نہ تھا

ان کو دے آئے ہیں خود اپنی محبت کے خطوط
غم گساروں کی ذرا نامہ بری تو دیکھو

کیا ہوا، مجھ پہ اگر عقل کا الزام آیا
آپ کا راز کسی طرح چھپایا تو سہی

محو ہوتی ہی نہیں یاد تری
کوئی بچپن کا سبق ہو جیسے

تارے تو چمک اپنی دکھاتے ہیں سحر تک
دل ڈوبنے لگتا ہے مگر پچھلے پہر سے

ان اشعار کو دیکھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ ان میں شاعر کی فطری صلاحیتیں پوری طرح اجاگر ہیں۔ گرچہ یہ ابتدائی غزلیں ہیں لیکن غزلوں کی نوک پلک سنوارنا، لفظوں کے مناسب صوتی آہنگ کو مدنظر رکھنا، قوافی اور ردیف کے ساتھ انصاف کرنا اور افہام و تفہیم کو آسان بنا دینا مظہر امام کا فنی وصف رہا ہے۔ شعر میں آمد کی کیفیت کے ساتھ ساتھ یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کا لہجہ نہایت نرم، شگفتہ اور ملائم ہے جو غزل اور غزلیہ شاعری کا خاص وصف ہے۔ اس کے علاوہ داخلی احساسات کو خارجی مشاہدات سے ہم آہنگ کرتے وقت مظہر امام نے غزلیہ شاعری کو ایک نئی سمت عطا کی۔ صرف اپنے مفہوم کو ادا ہی نہیں کیا بلکہ مفہوم کی ادائیگی کے لیے اظہار کا جو سلیقہ اپنایا اس سے فوری طور پر ذہن ایک مخصوص زاویے سے سوچنے پر مائل ہو جاتا ہے اور دیر تک اس کی بازگشت ذہن میں جاری رہتی ہے۔

مظہر امام کے پہلے مجموعہ ''زخم تمنا'' میں ایک نظم ''۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء'' کے زیر عنوان ہے۔ اس کا موضوع مہاتما گاندھی کی شہادت ہے۔ نظم ''شمع خاموش ہے'' میں شاعر نے انسان کی مجبوری اور بے بسی کا ذکر کیا ہے۔ نظم ''برف میں آگ'' کا اختتام انتہائی مایوسی کے اظہار سے ہوتا ہے:

لگاؤں آگ اگر برف میں تو کیا حاصل؟
کہ آگ اپنی حرارت کو بھی گنوا دے گی

نظم ''غروبِ شام'' صرف چار مصرعوں پر مشتمل ہے۔ اس میں بھی مایوسی ہے اور امید کی کرن کہیں نہیں پھوٹتی:

شام کے ڈوبتے سورج کی سسکتی کرنیں
میرے افکار کو کیا دیں گی تب و تاب حیات
میرے ٹھٹھرے ہوئے جذبات کے ویرانے میں
اور امڈا ہی چلا آتا ہے سیل ظلمات

نظم ''پھیلے ہوئے ہاتھ'' میں امید کی کرن جاگتی ہے اور اس میں شاعر کہتا ہے کہ اس تنہائی کے ذمہ دار تم خود ہو کیوں کہ تم اپنے تخیل کے حصار میں قید ہو۔ نظم ''رات گزرنے والی ہے'' میں

اس سرخ سویرا کی بات ہے جس کو ترقی پسند حضرات مختلف پیرائے میں کہتے رہے ہیں:

قندیل بغاوت روشن ہے طوفانِ تشدد کی زد پر
پہچان رخِ ایام، کہ ساقی! رات گزرنے والی ہے
خورشید محبت کے پرتو سے حسن کے جلوے جاگیں گے
کر ذوقِ نظر کو عام، کہ ساقی! رات گزرنے والی ہے

''سرسوتی''، علم اور فنون لطیفہ کی دیوی ہے۔ مظہر امام اپنی نظم ''سرسوتی!'' میں کہتے ہیں کہ انہیں بہت سی محرومیوں کا سامنا کرنا پڑا اور پے در پے مایوسیوں کے حملے ہوئے، لیکن علم وفن سے ان کی رغبت نے انہیں ہمیشہ ہمت اور حوصلہ بخشا اور وہ مصاف زندگی میں نبرد آزما ہونے کے قابل ہوئے:

چراغِ شوق کی لو تیز ہی رہی ہر دم
رہیں امید کی پریاں بھی گود پھیلائے

''ہم ایک ہیں'' بچوں کی نظم ہے۔ جس میں قومی یکجہتی کا پیام ہے۔ ''......ایں چہ دوریست؟'' ایک پابند نظم ہے۔ اس نظم میں اس دور کی سیاسی اور سماجی زبوں حالی کا شکوہ ہی نہیں بلکہ اس صورتحال کو بدلنے کا حوصلہ بھی ہے۔ اس نظم میں ایک احتجاجی کیفیت ہے جو بلند آہنگ ہوتے ہوتے رہ گئی ہے۔ اس کے ایک مصرعے میں انگریزی کے مشہور فقرے hot bed of crimes کا خوبصورت ترجمہ ہوا ہے:

تمہارا دور جرائم کا 'گرم بستر' ہے

مظہر امام کی عشقیہ Erotic اور Sensuous نظموں میں ایک مخصوص نوع کی دلنوازی ہے۔ ''قرب دوست'' میں ان کیفیات اور احساسات کا بیان ہے جو محبوب کی آمد سے عاشق کے دل میں پیدا ہوئے:

تارے اتر کے آئے ہیں گردوں سے خاک پر
پستی ہے سربلند ، زمیں آسماں ہے آج

اس سلسلے کی ایک نہایت خوبصورت نظم "...اپنی محبت کے لئے" ہے۔اس نظم میں جسمانی محبت کو جس نازک شاعرانہ زبان میں پیش کیا گیا ہے، اس کی مثال دوسری جگہ ملنی مشکل ہے۔ خوش آہنگی ان نظموں کا بڑا وصف ہے۔مظہر امام کے یہاں الفاظ کا استعمال تخلیقیت آمیز ہے اور ان کی تمثالوں میں ایک قسم کی انفرادیت اور تازہ کاری ہے۔

"اشتراک" اور "آؤ" نظم وضبط اور وحدت تاثر کے اعتبار سے اردو کی بہت عمدہ مختصر نظموں میں شمار کئے جانے کے قابل ہیں۔دوسری مختصر نظموں میں "شعاع فردا کے راز دانو"، "وہ ایک بات"، "آئینہ سے ٹپکتا لہو"، "پوسٹ نہ ہونے والا ایک خط" اور "کھلے آسمان کے نیچے" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔مظہر امام کی سب سے طویل نظم "خواب سچ بھی ہوتے ہیں" الفاظ کے فطری بہاؤ اور اسلوب کی روانی کے علاوہ اپنے فکری مواد کے لحاظ سے بھی توجہ طلب ہے۔اس میں ترقی پسندانہ فلسفۂ حیات کا بھرپور اظہار ہوا ہے۔

"انتظار" بڑی اثر انگیز نظم ہے جس میں ایک مشرقی لڑکی کے دل میں اٹھتے ہوئے طوفان کو گھریلو فضا آفرینی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔نظم میں انتظار کی گوناگوں کیفیات مصورانہ چابک دستی سے پیش ہوئی ہیں۔ملاحظہ ہو اس نظم کا ایک بند :

تو مرے انتظار میں ہوگی

میری یادوں کے نرم و نازک لب — تیرے خوابوں کو چومتے ہوں گے

میری باتوں کے میگھ دوت اکثر — دل کی وادی میں گھومتے ہوں گے

تو خیالوں میں ڈھونڈتی ہوگی

میرے ہونٹوں کی گم شدہ لذت

تکیۓ آنسو سے بھیگتے ہوں گے

بھیجتی ہوگی دل پہ تو لعنت

نظم "مسیحا کی زبان" پرویز شاہدی کی شادی کے موقع پر لکھی گئی تھی۔یہ روایتی تہنیتی نظموں سے بالکل مختلف ہے اور اپنے ڈکشن کے حسن کے ساتھ شاعر کے جذبۂ اخلاص کی آئینہ دار ہے۔

فکر وفن کے دلکش امتزاج نے اسے بے حد اثر انگیز بنا دیا ہے۔

''نگارِ شہر'' ایک ایسی نظم ہے جس میں شاعر دوراہے پر کھڑا ہے۔ ایک طرف اس کا محبوب ہے۔ دوسری طرف دنیا کے تقاضے ہیں۔ ایسے عالم میں شاعر ایک تذبذب کا شکار ہے کہ وہ کیا کرے۔ اسے جنونِ وفا بھی راس نہیں آتا اور وہ سوچتا ہے کہ ترکِ محبت بھی اس کے لئے مشکل ہے۔ ذہن میں ابھرنے والی متضاد کیفیتوں کو اور حالات کے تقاضوں کو مظہر امام نے ایسے آہنگ میں پیش کیا ہے جس میں یہ احساس ابھر کر سامنے آیا ہے کہ انسان کبھی ایسے موڑ پر بھی آ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ کون سا راستہ اختیار کیا جائے۔

''اگر'' خواب اور شکست خواب کی نہایت دل پذیر نظم ہے۔ ہمارے ملک کی آزادی سے پہلے ہماری کیا کیا توقعات تھیں، لیکن ہمارے رہنماؤں نے اس ملک کو کیا سے کیا بنا ڈالا۔ غیر ملکی استعمار ہمارا کھلا دشمن تھا۔ ہم اسے پہچانتے تھے لیکن جب ہم نے اپنوں کے ہاتھوں میں زمامِ اختیار دیا تو انہوں نے منافقت کو راہ دی، مہر و وفا سے منہ موڑ لیا اور ہمارے یقین کو لہولہان کر دیا۔ نظم کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے:

ہمیں گلہ تھا رقیبوں سے، یہ خبر کب تھی؟
کہ اپنے دوست بھی مہر و وفا کے دشمن ہیں

اور پھر شاعر یہ سوچتا ہے کہ اگر ہماری قربانیوں کا، ہمارے جنونِ وفا کا، ہمارے ذوق و شوق کا حاصل یہی ہے، تو پھر ہم مستقبل سے کیا امیدیں رکھیں۔ موجودہ حالات میں انسانوں کے دکھ، درد، مصیبتیں اور تکلیفیں اتنی بڑھ گئی ہیں کہ اب سکون و مسرت کا تصور بھی محال ہے۔ نظم کا اختتام اس شعر پر ہوتا ہے:

جو ایک غم ہو تو سہ لے کسی طرح کوئی
ہزار غم ہوں تو فکر سکوں کہاں جائے؟

گویا یہ نظم سوال سے شروع ہوتی ہے اور سوال پر ختم ہو جاتی ہے لیکن یہ وہ سوالات ہیں جو انسان کے سامنے کھڑے ہیں اور جواب کے منتظر ہیں۔

''سفر ہے شرط'' ایک ایسی نظم ہے جس میں شاعر پیش قدمی کے لئے پورے عزم وحوصلہ کے ساتھ ہمیں اکساتا ہے اور یقین کا یہ عالم ہے کہ صرف سفر شرط ہے، منزل کا ملنا یقینی۔

مظہر امام نے زندگی کی تلخیوں کو اپنی نظم ''تحفہ'' میں پیش کیا ہے اور زندگی کو نا کام آرزوؤں کا مسکن بتایا ہے۔ اس نظم میں پوری زندگی کو کرب، گھٹن، امنگوں کی نا آسودگی اور تھکن سے تعبیر کیا گیا ہے۔

''شعاع فردا کے راز دانو'' ایک ایسی نظم ہے جس میں شاعر نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جنوں چونکہ دیدہ ور نہیں ہے اور خرد اعتبار کے لائق نہیں، اس لئے منزل کو منزل نہیں سمجھنا ہلاکت خیز ہے۔

نظم ''رہ تمنا سے میں جو گزرا'' میں شاعر کہتا ہے کہ آرزو کی کوئی منزل نہیں ہوتی اور عزم و شوق کی کوئی حد نہیں اور انسان کی بلندی کی بھی کوئی انتہا نہیں ہوتی یعنی خوب سے خوب تر کی تلاش جاری رہتی ہے۔

''آؤ'' ایک مختصر نظم ہے۔ جس میں بہت خوبصورتی کے ساتھ شاعر نے اپنے اضطراب کو پیش کیا ہے اور بڑھایا بھی ہے:

بے ادب ستاروں نے
نیند میں مخل ہوکر
تم سے کچھ کہا ہوگا
لیکن ان کی باتوں کا
تم یقین مت کرنا
آؤ، آ کے خود دیکھو
مضطرب کہاں ہوں میں!

نظم ''خیر طلب'' میں شاعر نے اپنے فریب کھانے کا ذکر کیا ہے اور دوبارہ نہ فریب کھانے کا عزم کیا ہے کیوں کہ وہ اداکاری اور سچائی کے درمیان تمیز کرنے لگا ہے۔

کاروباری زندگی میں رشتے محض ضرورت ہی تک محدود ہوتے ہیں اور کسی کا بھروسہ کرنا بے کار ہے۔ کیوں کہ ایسا کرنے سے مزید ناامیدی اور تکلیف ہوتی ہے۔ ''اشتراک'' میں مظہر امام نے اسی خیال کو پیش کیا ہے۔ ساتھ ہی یہ اشارہ بھی دیا ہے کہ اس ماحول اور ایسی فضا میں بھی جینے کا فرض انجام دینا چاہئے۔ اس نظم کا آخری مصرع نہایت اہم ہے:

آؤ، ہم لوگ جینے کی کوشش کریں!

نظم ''غم کدۂ شام وسحر'' میں بیزاری کے ساتھ ساتھ بے نیازی بھی ہے۔ شاعر اس مقام پر نظر آتا ہے جہاں نفع ونقصان کی اہمیت نہیں رہتی۔

نظم ''یہ جہاں'' (جو دراصل ایک قطعہ ہے) میں دنیا کی ظالمانہ روش اور انسان کی بے بسی کو کس اثر آفریں دلکشی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے:

یہ نہنگوں کی کمیں گاہ، مگر کا یہ دیار
یہ جہاں ہے کہ سمندر ہے، بھیانک، ذخار
زندگی جس میں بہی جاتی ہے تنکے کی طرح
لہر کے ایک اشارے پہ ہے انساں کا مدار

''مے کش'' میں دو آوازوں کو پیش کیا گیا ہے۔ پہلی آواز نسائی ہے اور دوسری مردانہ۔ یہ نظم باغیانہ ذہن کا اظہار ہے:

کسی کا شوق، کسی دل کی آرزو ہوکر
کبھی رباب، کبھی گل، کبھی سبو ہوکر
کمالِ رندی و مستی کی آبرو ہوکر
کسی کی روح میں، دل میں سما کے بیٹھی ہوں

''حد ادراک سے دور'' ایک خواب کے کہر میں لپٹی ہوئی نظم ہے جس میں تخیل کی دنیا میں شاعر کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے مگر یہ بھی سمجھتا ہے کہ زندگی کی سچائیوں کا مقابلہ کرنا ہی دراصل زندگی ہے اور اس سے فرار کی کوئی صورت نہیں ہے:

زندگی طنز سے بولی کہ ''تو مجھ سے بچ کر
اپنی تخئیل کی چادر میں ہوا ہے مستور؟''

''وہ دیکھو!'' ایک ایسی نظم ہے جس میں شاعر محبوب کی آنکھوں اور اس کے پورے پیکر سے بے حد متاثر ہے اور اسے زندگی کا حاصل سمجھتا ہے مگر دوسری طرف وہ اپنی بے حسی اور جذبات کی مردنی سے بیزار ہے۔ نیز تمناؤں میں زہر گھلتا ہوا پاتا ہے اور اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ فضا کسی شرر بار طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ اس نظم میں ایک انجانے خوف کا احساس شاعر کو ملول کر دیتا ہے:

...یہ افسردہ ظلمت، فضاؤں کی یہ سرگرانی کسی آنے والے شرر بار طوفان
کا پیش خیمہ ہے شاید
وہ دیکھو، وہ دیکھو کہ خونیں لکیریں ابھرنے لگیں آسماں پر
وہ دیکھو___!

نظم ''حیات آوارہ'' زندگی کی تلخیوں کی طرف اشارہ کرتی ہے اور انتہائی افسردگی کا احساس دلاتی ہے۔ یہ نظم یاسیت و قنوطیت سے بھرپور ہے۔

''ترائلے'' ایک فرانسیسی صنف سخن ہے۔ مظہر امام نے اپنے ترائلے میں اپنی زندگی اور جوانی کو غم سے عبارت بتایا ہے۔ انہیں اپنی زندگی ایک بوجھ معلوم ہوتی ہے جس میں نہ ساعت کا لطف ہے اور نہ لذتِ دید باقی ہے۔ اس نظم پر بھی قنوطی افکار حاوی ہیں:

مرا شباب غم و یاس سے عبارت ہے
نہیں ہے کوئی سہارا، نہیں ہے کوئی امید
مرے وجود کی دنیا کو کیا ضرورت ہے!

''آئینہ بردار'' ایک سیاسی نظم ہے۔ جس میں کیبنٹ مشن کی ناکامی کا ایک تاثر پیش کیا گیا ہے اور فرنگیوں کی ناپاک سیاست کا بھرم کھولا گیا ہے۔

مظہر امام نے نظموں میں جو تجربے کیے ہیں ان کی حیثیت اور انفرادیت مسلم ہے۔ ان

نظموں میں جو سلیقہ ہے اس سے وہ تلخی بھی معدوم ہو جاتی ہے جو روایتی اور مثالی تصور کے سبب ان کی حق گوئی کے طفیل میں جنم لیتی ہے۔ یہ ایک جرأت مندانہ اقدام ہے اور فنکارانہ ایمان داری بھی۔ نظموں میں تسلسل اور ربط کے ساتھ ساتھ تاثر، بالخصوص وحدت تاثر کا قائم رہنا کبھی کبھی دشوار ہو جاتا ہے۔ لیکن مظہر امام نے اس وحدت تاثر کو جہاں منتشر ہوتا ہوا دیکھا وہاں نظموں میں افسانوی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ ان کی بیشتر نظمیں مختصر ترین افسانوں کی طرح دھما کہ خیز اور پرتاثیر ہیں۔ اپنے محسوسات کو جمالیاتی پیرہن عطا کرنے کا ملکہ مظہر امام کو حاصل تھا۔ انھوں نے گرچہ وقتی طور پر ترقی پسندوں سے سمجھوتا کر لیا تھا مگر ذہنی و روحانی طور پر وہ ایک مرحلہ تھا، ان کی منزل نہیں۔ اس لئے ان کی اس دور کی شاعری بھی اپنے اندر ایک نئی کیفیت، ایک نیا احساس اور ایک مخصوص لب ولہجہ رکھتی ہے۔ ان کی شاعری میں کہیں بھی ترقی پسندوں جیسی گھن گرج، تیز اونچی آواز اور شدت کا احساس نہیں ہوتا۔ چنگاریاں اگر ابھرتی بھی ہیں تو ان پر راکھ کی دبیز تہہ نظر آتی ہے۔ یہ ان کے اسلوب کا خاص کمال ہے۔ اس لیے جب وہ جدید وجدان سے کام لیتے ہیں تو ان کے یہاں عامیانہ فیشن زدگی اور بے راہروی نہیں ہوتی۔ ان کے یہاں ایک سلیقہ اور ایک دھیما پن ہے جن کا اثر دیرپا اور پائدار ہے۔ بہت دیر تک ان کی شاعری ذہن کو مسحور کرتی رہتی ہے۔

مظہر امام کے اولین شعری مجموعہ ''زخم تمنا'' پر بعض اکابرینِ ادب نے اپنی رائے اس طرح پیش کی ہے :

پروفیسر احتشام حسین رقم طراز ہیں'' میں مظہر امام کی نظمیں اور غزلیں بڑے شوق سے پڑھتا ہوں۔ اظہار بیان کی تازگی کی وجہ سے وہ فوراً اپنی جانب متوجہ کر لیتی ہیں۔ مظہر امام نے اشاریت اور سپاٹ اظہار کے درمیان ایک راستہ نکالا ہے جو نہ تو ابہام کی طرف جاتا ہے نہ فرسودگی کی جانب۔ بلکہ تازگی اور تنوع کا احساس دلاتا ہے۔ یہی بات ان کے موضوعات کے انتخاب کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔ ان میں بھی وہ احتیاط برتتے ہیں یعنی نہ تو اہم سماجی اور انفرادی محرکات سے جان بوجھ کر اغماض برتتے ہیں اور نہ نئے خیالات اور تصورات کے پیش کرنے میں جھجک محسوس کرتے ہیں۔ ہمارے نئے شعراء میں ان کا مقام محفوظ ہے۔''

پروفیسر اختر اورینوی کہتے ہیں ''مظہر امام کی شاعری روایت اور نئی تبدیلیوں کا خوش گوار امتزاج پیش کرتی ہے۔ یہ مخلصانہ، جاندار اور پر اثر ہے۔ اس میں انفرادیت پائی جاتی ہے کیونکہ شاعر کو ذوق جمال بھی حاصل ہے اور ذہن بیدار بھی۔ مظہر امام سطحی ترقی پسندی اور سستی پیام رسانی سے اجتناب کرتے ہیں۔ شاعر کو سلیقۂ فن اور زبان دانی سے آگاہی حاصل ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ حسن خیال اور حسن ادا کی مدد سے مظہر امام کی شاعری صرف امروز کی تجلیاں ہی پیش نہیں کرے گی بلکہ جلوۂ فردا اور مظہر دیروز بھی ثابت ہوگی۔ کامیاب فنکاری حسن واثر کو آفاقی اور ابدی بنانے کا نام ہے۔ مظہر امام اگر بیدار رہے تو ان کی شاعری اپنے امکانات کے وعدے پورے کرے گی۔''

پرویز شاہدی اس طرح گویا ہیں ''بحمد اللہ آپ ایک مقام بنا چکے ہیں اور آپ کا کلام اپنی جاذبیت کا خود اعلان کر رہا ہے۔ آپ کی شاعری بلند بالا، جامہ زیب، خوش لباس اور خوش اندام شاعری ہے۔ آج کے دور کا کرب بڑی رعنائی کے ساتھ آپ کے اشعار میں ظاہر ہوتا ہے۔''

حسن نعیم کا خیال ہے ''زخم تمنا'' میں تم نے واقعی اپنا تقریباً منتخب کلام دیا ہے۔ ''اعتراف'' لائق احترام تعارف ذات ہے۔ یہ ایک سچا فن کار ہی لکھ سکتا تھا۔ اردو شاعری کی صالح اور دلکش روایات کے حامل جتنے مجموعے ۱۹۶۲ء میں شائع ہوئے ہیں ان میں ''زخم تمنا'' کا ایک ممتاز مقام ہے۔ تمہاری نظم ''اشتراک'' میں ایک گہرے تجربے اور غیر معمولی مشاہدے کو فن کا جامہ مختصر ترین الفاظ میں پہنایا گیا ہے۔ غزلیں ''تمام حسن صداقت، تمام رعنائی'' ہیں۔''

ڈاکٹر ذاکر حسین (سابق صدر جمہوریۂ ہند) کے الفاظ اس طرح ہیں ''میں ایک نشست میں زیادہ شعر نہیں پڑھتا۔ ٹھہر ٹھہر کر دم لے لے کر چلتا ہوں لیکن آپ کی غزلیں جو رات شروع کیں تو سب ہی پڑھ ڈالیں۔ کئی شعروں کو دیر تک گنگنایا اور آپ ہی کے لفظوں میں کہوں تو بار بار ایسا لگا کہ:

تیرے اشعار کا یہ رنگ امامؔ
ان کے ہونٹوں پہ شفق ہو جیسے''

سیّد سجاد ظہیر لکھتے ہیں ’’میں بہار کو عظمت کی سرزمین کہتا ہوں۔ گوتم بدھ کے عرفان کی سرزمین، ودیاپتی کے شیریں نغموں، مرزا عبدالقادر بیدل کی عظیم شاعری کی سرزمین بدقسمتی سے بہار کے جدید ادب سے اس قدر واقف نہیں جتنا کہ ہونا چاہئے لیکن اردو والوں میں جب سوچتا ہوں تو پرویز شاہدی اور سہیل عظیم آبادی کے بعد تمہارا ہی نام ذہن میں چکر لگانے لگتا ہے۔

غلام ربانی تاباں اپنے محسوسات کی ترجمانی اس طرح کرتے ہیں ’’مظہر امام کے کلام میں زبان و بیان کی پختگی، لہجے کی سنجیدگی، جذبے کی شدت اور بدلتے ہوئے حالات کا شعور بھر پور موجود ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں جذبات و تاثرات کے ساتھ عصری رجحانات کا اظہار بھی کیا ہے اور یہ ان کے کامیاب شاعر ہونے کی دلیل ہے۔‘‘

فراق گورکھپوری اپنی رائے اس طرح دیتے ہیں ’’مظہر امام کی شاعری لطافت احساس اور طہارت فکر کی خوبصورت مثال ہے۔ ان کے یہاں ایک ایسا چٹیلا پن اور نشاط آمیز دل گرفتگی ہے جو ان کے کلام کو انفرادیت بھی عطا کرتی ہے اور دل نوازی بھی۔‘‘

راجندر سنگھ بیدی کا خیال ہے کہ ’’......زخمِ تمنا‘‘ میں سیکڑوں ایسے شعر ہیں جن میں چمک ہے۔ جو فرزانگی کی حدوں کو پھاند گئے ہیں۔ ہماری ترقی پسندی نے جہاں ہمارا ذہنی افق وسیع کیا، وہاں کئی برلن کی دیواریں بھی کھڑی کر دیں اور یوں:

بنے ہوئے ہیں جو آقائے حال و مستقبل
ستم تو یہ ہے، وہی ارتقا کے دشمن ہیں‘‘

پروفیسر گوپی چند نارنگ تسلیم کرتے ہیں ’’مظہر امام ہماری شاعری میں کسی دھماکے سے داخل نہیں ہوئے۔ انہوں نے فکر و خیال کو خلوص و درد کی دھیمی آنچ میں تپا کر اپنے لئے رفتہ رفتہ جگہ پیدا کی ہے۔ ان کی شاعری کا رخ نئے تقاضوں کی طرف ہے لیکن فنی سطح پر انہوں نے روایت سے اپنا رشتہ نہیں توڑا، اس سے ان کے اسلوب و اظہار میں ایک خوش آہنگ روانی اور بے تکلفی آ گئی ہے۔ ان کی شاعری ایک سنبھلی ہوئی طبیعت اور صحت مند افتادِ ذہنی کا پتہ دیتی ہے انہوں نے اردو کے بعض جدید شاعروں کی طرح کشاکش حیات سے بیزار ہو کر ماتم پرستی شعار کی ہے نہ جدید

دور کی الجھنوں کو شاعری کے گلے کا ہار بنایا ہے۔ بلکہ نہایت اعتماد سے زندگی کے اپنے تجربوں کو دل کے ساز پر پیش کیا ہے۔ موجودہ دور میں ہماری قدیم اخلاقی اور تہذیبی قدریں سائنسی اور اقتصادی یلغار کی زد میں ہیں۔ زندگی کی تہ در تہ پیچیدگی ایک نئے ذہن کا مطالبہ کرتی ہے۔ مظہر امام کی شاعری میں یہ نیا ذہن ملتا ہے لیکن خوشی کی بات ہے کہ انہوں نے شاعری کو ذہنی تجرید سے بچالیا ہے۔ ان کے فطری ضبط و اعتدال نے انہیں فکر کو جذبے میں سمونے کی راہ دکھائی ہے جس سے ان کے کلام میں انبساط اور آ گہی کی ایک خوش گوار امتزاجی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔''

نریش کمار شاد کا اعتراف یوں ہے ''مظہر امام کی صبح بہار کی طرح تازہ و شاداب شاعری میں روایت اور جدت کا نہایت متوازن اور خوبصورت امتزاج پایا جاتا ہے ان کی غزلوں کے اکثر اشعار نے مجھے یہ ماننے پر مجبور کر دیا ہے کہ وہ سچے اور حقیقی شاعر ہیں۔ مظہر امام کی جاندار شاعری اردو شعر و ادب میں جمود کے دعوے کی نہایت شاندار تردید کرتی ہے اور اردو شاعری کا مستقبل ان سے بلاشبہ بہت بڑی امیدیں وابستہ کر سکتا ہے۔''

ارشد کاکوی کے الفاظ میں ''مظہر امام کی شاعری زخم تمنا بھی ہے اور تمنائے زخم بھی۔ وہ گلہ مند ہی نہیں، حوصلہ مند بھی ہیں۔ رومانیت ہو یا سماجیت، زندگی سے ان کا بڑا مفاہمانہ سمجھوتہ رہا ہے۔ اسی لیے ان کی شاعری میں جذبات و احساسات کی بڑی شریفانہ ترتیب و تربیت ملتی ہے۔ ان کا کلام محض ان کے ادبی ذوق کا نہیں بلکہ ان کی شخصیت کا بھی اظہار ہے۔''

(بحوالہ ''مظہر امام: ایک تعارف'' مناظر عاشق ہرگانوی اشاعت: ۱۹۷۴ء)

مظہر امام کے سوچنے اور کہنے کے فن اور انداز میں ایک نیا پن ہے۔ اگر کسی پرانے مضمون کو بھی باندھا ہے تو اس میں نئی بات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور لہجہ بھی نیا اپنایا ہے۔ یہ شاعر کی شاعرانہ صلابت کی دلیل ہے۔ اس پس منظر میں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اپنے ابتدائی دور میں ہی مظہر امام کی ذہنی ساخت میں سماجی بیداری کے ساتھ اصلاحی اور افادی مقاصد بھی نیا رخ دکھانے میں اور خدوخال واضح کرنے میں معاونت کر رہے تھے۔

❖❖❖

پیش خدمت ہے **کتب خانہ** گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے 👇
https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
0307-2128068 📱
@Stranger ❣️❣️❣️❣️❣️❣️❣️

منظر شہاب کا ادبی منظر نامہ

منظر شہاب کا اصل نام سید محمد یٰسین تھا۔ ان کی ولادت ۳۱ رمئی ۱۹۲۷ء کو شاہو بگہہ، ضلع گیا، ثم جہان آباد (بہار) میں ہوئی۔ ان کے جد امجد آبائی وطن ’کوسیاواں‘ ترک کر کے موضع بلاول، تھانہ ہلسہ ضلع نالندہ میں جا بسے تھے۔ والد بزرگوار سید محمد طٰہٰ الٰہی فکری کا سلسلۂ نسب نویں پشت میں حضرت سلطان بلخیؒ سے جا ملتا ہے جن کے نانا سید شاہ مبارک حسین ساکن شیخ پورہ (مونگیر) حضرت شیخ شعیب، عم زادہ حضرت مخدوم جہاں کی اولاد میں سے تھے جب کہ نانی کا خاندانی تسلسل حضرت مظفر شمس بلخیؒ، حضرت ابراہیم ادھم اور حضرت امام حسینؓ سے گزرتا ہوا امیر المومنین حضرت علیؓ کرم اللہ وجہٗ تک پہنچتا ہے۔ منظر شہاب کے نانا ڈاکٹر شمس الدین کے جد اعلیٰ سید شاہ فیض اللہ بخاری نے ۱۵۱۸ء (یہ زمانہ بہلول لودی) شاہو بگہہ میں سکونت اختیار کر لی۔ صوبہ بہار کا یہ دور افتادہ گاؤں مردم خیزی کے لئے مشہور تھا۔ علامہ فضل حق آزاد جیسے متبحر عالم اور ملک گیر شہرت یافتہ شاعر، شاعر خمریات عزیز عظیم آبادی اور نامور مثنوی نگار عبد المجید شمس (پرنسپل) کو اسی سرزمین سے نسبت تھی۔ اسی گاؤں کی بالیدہ فضاؤں میں منظر شہاب کی زندگی کے ابتدائی ایام گزرے۔ ان کے والد سید محمد طٰہٰ الٰہی فکری جو بذات خود ایک عالم دین، شعلہ بیاں خطیب اور معتبر شاعر تھے، اپنے آبائی وطن بھدول، ضلع نالندہ کو بھول گئے اور شاہو بگہہ ضلع گیا ثم جہان آباد کے ہو کر رہ گئے۔ وہ جمعیۃ العلماء ہند کے سرگرم رکن تھے اور جنگ آزادی کی تحریک میں انگریزی حکومت کے عتاب کا شکار بھی ہو چکے تھے۔ انھوں نے مدرسۃ الٰہیات، کانپور سے فراغت حاصل کی تھی۔ منطق، فلسفہ اور علم کلام ان کے خاص مضامین تھے۔ وہ شعر گوئی کا بھی ذوقِ سلیم رکھتے تھے۔ طٰہٰ الٰہی فکری کی والدہ کا نام سیّدہ آمنہ بلخی تھا۔ غرض یہ کہ بچپن سے منظر شہاب کو ایسا ماحول ملا جو مذہب، فلسفہ، ادب اور سیاست سے متعلق مباحث کا محور تھا۔ اس طرح ادب اور سیاست سے ان کی دلچسپی میں اضافہ ہوتا

گیا۔ سید محمد طٰہٰ الٰہی فکری مدرسہ حمیدیہ، قلعہ گھاٹ، دربھنگہ میں (۱۹۲۴ء) استاد ہوئے۔ پھر مدرسہ الٰہیات، کانپور ۱۹۲۸ء میں مدرس ہو کر چلے گئے۔ ۱۹۳۱ء میں راج ہائی اسکول دربھنگہ میں بحیثیت مدرس اردو، فارسی ہو کر آئے۔ ۱۹۴۶ء کے فرقہ وارانہ فسادات میں شاہو بگہہ اجڑ گیا تو انھوں نے دربھنگہ کو اپنا مستقر بنالیا۔ منظر شہاب کی والدہ کا نام سیّدہ بی بی سکینہ خاتون تھا۔ منظر شہاب تاج فقیہی، فردوسی اور بلخی بھی تھے۔

۱۹۳۹ء میں والد کی نگرانی میں مہاراجہ دربھنگہ کی مشہور درسگاہ راج اسکول میں منظر شہاب کا داخلہ ہوا جہاں بنگلہ ادب کے مشہور ادیب وبھوتی بھوشن بنرجی مدرس اعلیٰ تھے۔ مہاراجہ دھیراج کو اپنی درسگاہ کی نمائش کا بے حد شوق تھا۔ مشاہیر وقت کی خوشگوار آمد کا سلسلہ قائم تھا جن میں معروف گلوکار کے ایل سہگل، لارڈ لنلتھگو وائسرائے اور مینارِ فلسفہ اور سابق صدر جمہوریہ ہند سروپلّی رادھا کرشنن جیسی شخصیات کی آمد کے نقوش ان کے ذہن میں ثبت رہے۔ وہیں سے انہوں نے ۱۹۴۴ء میں میٹریکولیشن کیا اور ۱۹۴۵ء میں سی ایم کالج، دربھنگہ میں داخلہ لے لیا جہاں سے ۱۹۴۹ء میں گریجویشن مکمل کیا۔ اسی درمیان ۱۹۴۵ء میں ایک قلمی رسالہ 'رحیل' سید محمد یٰسین شعلہ شاہو بگھوی کے نام سے مرتب کیا جس کا مقصد ادبی سے زیادہ اصلاحی تھا۔ بعد میں مظہر امام کے مشورہ پر اپنا ادبی نام منظر شہاب رکھ لیا۔ منظر شہاب کے جمشید پور میں لیکچرار ہونے کے بعد ان کا خانوادہ جمشید پور مستقلاً منتقل ہو گیا۔ ۱۹۸۱ء میں سید محمد طٰہٰ الٰہی فکری کا انتقال ہوا اور وہ وہیں مدفون ہوئے۔ مرحوم نے اپنے پیچھے تین بیٹوں منظر شہاب، سید احمد شمیم، اعجاز احمد کو چھوڑا جن میں معروف شاعر اور ناقد پروفیسر سید احمد شمیم کریم سٹی کالج، جمشید پور کے شعبۂ اردو سے سبکدوش ہو کر پارڈیہہ، مانگو، جمشید پور میں مقیم ہیں۔ جب کہ ایک بیٹی سیدہ فردوسیہ خاتون کا انتقال ان کی حیات ہی میں ہو گیا تھا۔

گھریلو ماحول کے زیر اثر منظر شہاب کانگریس کے ہم نوا اور مسلم لیگ کے مخالف بن گئے تھے۔ ہندوستان میں فرقہ وارانہ فساد، کشت و خون اور ملک کی تقسیم نے ان کے سیاسی نظریات پر گہرا اثر ڈالا اور وہ اشتراکی تحریک سے قریب ہو گئے۔ ۱۹۴۱ء سے ان کی تخلیقات دربھنگہ، پٹنہ، کلکتہ، دہلی وغیرہ کے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتی رہیں۔ ماہنامہ ''تہذیب'' نے برصغیر میں ان کو

متعارف کرانے میں بڑا رول ادا کیا۔ ۱۹۴۸ء میں انجمن ترقی پسند مصنّفین (شاخ دربھنگہ) کا قیام جب عمل میں آیا تو معتمد اول کی ذمہ داری انھیں سونپی گئی۔ منسوب حسن، حسن امام درد اور مظہر امام اس کے سرگرم رکن تھے۔ یہیں سے ۱۹۴۹ء میں ترقی پسند ادب کے ترجمان سہ ماہی 'نئی کرن' کا اجرا مظہر امام اور ان کی مشترکہ ادارت میں ہوا جس کے صرف تین شمارے ہی شائع ہو سکے۔ 'نئی کرن' نے ان دونوں کی شہرت میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اشتراکی رجحان کے سبب ان دونوں کو بھی حکومت وقت نے خطرناک شہری قرار دے کر فروری ۱۹۴۹ء میں گرفتار کرلیا جس کے احتجاج کے طور پر کئی رسائل میں اداریے بھی لکھے گئے۔ بالخصوص کرشن چندر نے ''محاذ'' (بمبئی) میں ایک سخت نوٹ سپردِ قلم کیا۔ جیل سے رہا ہو کر منظر شہاب نے جولائی ۱۹۴۹ء میں گاندھی میموریل خانقاہ انگلش ہائی اسکول، اسلام پور، ضلع نالندہ میں مدرس کی ملازمت کرلی اور ملازمت کے بعد اشتراکی تحریک کے سرگرم رکن بن گئے۔ ۱۹۵۰ء میں ملازمت چھوڑی اور اسی سال پٹنہ کالج کے ایم اے اردو کورس میں داخلہ لیا۔ کلام حیدری، انور عظیم اور اختر پیامی ان کے ہم جماعت تھے۔ شکیل الرحمٰن، نادم بلخی اور انیس امام ایک سال بعد آئے۔ ان کا کمرہ ترقی پسند ادیبوں کا اڈہ بن گیا۔ گاہے گاہے سیاسی کارکن بھی وارد ہو جاتے تھے۔ کامریڈ حبیب الرحمٰن جن سے ان سب کو والہانہ عقیدت تھی اکثر و بیشتر ان کے مہمان کی حیثیت سے قیام فرماتے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پٹنہ کے ادبی آسمان پر قدیم اور جدید ادیبوں کی کہکشاں جگمگا رہی تھی۔ اختر پیامی، انور عظیم، کلام حیدری، حسن نعیم، شکیل الرحمٰن اور نادم بلخی جیسے نو یافت ستارے روشنی بکھیر رہے تھے۔ پٹنہ کے قیام نے ان کے ادبی ذوق کو امید افزا مہمیز لگائی۔ علامہ جمیل مظہری، پروفیسر اختر اورینوی، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر آل احمد سرور، سجاد ظہیر اور سہیل عظیم آبادی جیسے قد آور ادیبوں نے ان کی تخلیقات کو توصیفی کلمات سے نوازا۔ انجمن ترقی پسند مصنّفین پٹنہ نے ایک ادبی جریدہ ''نئی راہ'' شائع کیا جس کی مجلسِ ادارت میں انور عظیم، حسن نعیم اور رفیق جابر کے ساتھ وہ بھی شامل تھے۔ کامریڈ حبیب الرحمٰن کے اصرار پر انھوں نے کمیونسٹ پارٹی کی رکنیت قبول کرلی لیکن عملی سیاست سے ہمیشہ دور رہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد ان کے آئیڈیل رہے اور ان کی طرزِ نگارش کو اپنانے کا ان کے اندر جنون تھا۔

جولائی ۱۹۵۳ء میں شعبۂ اردو، کوآپریٹو کالج (جمشید پور) میں ان کی تقرری بحیثیت لیکچرار ہوئی۔ جمشید پور فنونِ لطیفہ کی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے۔ اس شہر نے ان کے مذاقِ فن کو ڈراما اور اسٹیج کے شوقِ لطیف سے آشنا کیا۔ ہدایت کاری کے علاوہ انھوں نے خود بھی کئی تمثیلوں میں کام کیا۔ کل ہند یوتھ فیسٹول میں ان کی ہدایت کاری میں اسٹیج شدہ ڈرامہ مسز پرول ویدم (۱۹۵۶ء) کو اول انعام ملا۔ اس کے علاوہ ''پردہ اٹھاؤ، پردہ گراؤ'' (اوپندر ناتھ اشک) ۱۹۵۴ء میں اور ''بھگوان چور بھیجو'' (۱۹۵۸ء) میں اسٹیج ہوئے۔ ''میر کلو کی گواہی'' اور "Monkey's Paw" جیسے ڈراموں کو ہدایت بھی دی۔ خود انھوں نے کئی ڈراموں میں اداکاری کی تھی۔ ۵/اگست ۱۹۶۵ء کو کریمیہ ٹرسٹ کے ٹرسٹی کی ایما پر انھوں نے کریم سٹی کالج کے بانی پرنسپل کی ذمہ داری سنبھالی اور مئی ۱۹۸۹ء میں وہ اس سرگراں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ ۱۹۶۳ء میں جب کمیونسٹ پارٹی انتشار کا شکار ہوگئی تو انھوں نے رکنیت سے استعفیٰ دے دیا۔ ویسے وہ اشتراکی نظریات کو انسانی ارتقاء کا اہم ستون سمجھتے رہے۔ ادب میں وہ موضوع کی صحت اور ہیئت کے حسن کے قائل تھے۔ ادب یا دیگر فنونِ لطیفہ میں ناوابستگی کے سوال کو بے معنی سمجھتے تھے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''پیراہن جاں'' (۱۹۸۹ء)، مضامین کا مجموعہ ''اور پھر بیاں اپنا'' (۲۰۰۲ء) اور دوسرا شعری مجموعہ ''مجروح پرندے کی صدا'' (۲۰۰۷ء) شائع ہو چکے ہیں۔ خطوط ''حرف حرف داستاں'' کے نام سے زیرِ اشاعت ہیں۔ ''شاخ شاخ پھول'' (غزلوں کا مجموعہ) اور کئی کتابیں منتظرِ اشاعت ہیں۔ ان کی حیات اور کارناموں پر لکھے گئے دو تحقیقی مقالات پر ڈاکٹر ایم صلاح الدین اور ڈاکٹر انور مجیب کو بالترتیب ایل. این. متھلا یونیورسٹی (دربھنگہ) اور مگدھ یونیورسٹی (بودھ گیا) سے ڈاکٹریٹ کی سندیں بھی تفویض ہو چکی ہیں نیز ڈاکٹر ایم صلاح الدین کی کتاب 'منظر شہاب: حیات اور فکر و فن' ۲۰۰۴ء میں شائع ہو کر ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل کر چکی ہے۔ کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین (دہلی)، مغربی بنگال اردو اکاڈمی (کولکاتا)، بہار اردو اکاڈمی (پٹنہ)، سنگھ بھوم ہندی ساہتیہ سمیلن (جمشید پور)، اردو گھر، شائقین ادب، ہندو مسلم ویلفیئر سوسائٹی (جمشید پور) نے ان کی ادبی و ثقافتی خدمات کے اعتراف میں انعامات و اعزازات سے نوازا ہے۔

منظر شہاب ۷/نومبر ۱۹۴۷ء کو حسن امام درد، مظہر امام اور سیّد منظر امام کی بہن سیّدہ نسرین (نسرین شہاب) سے امیر منزل، قلعہ گھاٹ، دربھنگہ میں رشتۂ ازدواج سے بندھے۔ ان کے دو بیٹے ڈاکٹر منظر حسنین (سابق صدر، شعبۂ حیوانیات، کریم سٹی کالج، جمشید پور) اور پروفیسر اختر حسنین (سابق استاذ، شعبۂ نفسیات، کے ایم پی ایم انٹر کالج، جمشید پور) ہیں جب کہ دو بیٹیاں نکہت نسرین عرف بے بی (صدر شعبۂ ہوم سائنس، اسکول کالج فار گریجویشن، سا کچی، جمشید پور) اور شبنم نسرین عرف پونم (متوفی ۱۵/اپریل ۲۰۱۷ء، تدفین ۱۶/اپریل ۲۰۱۷ء بمقام میورو ہار قبرستان دہلی) ہیں۔ داماد ڈاکٹر اشرف بہاری (صدر شعبۂ فلسفہ، کریم سٹی کالج، جمشید پور) اور شہیر امام (کنسلٹنٹ، سی ٹیل بینک، ساؤتھ افریقہ) ہیں۔ بہوئیں ڈاکٹر شیریں حسنین (صدر شعبۂ اردو، گریجویٹ اسکول کالج فار ویمن، جمشید پور) اور ڈاکٹر کشور آرا (شعبۂ اقتصادیات، ویمنس کالج، جمشید پور) ہیں۔

منظر شہاب کا انتقال ۷/ستمبر ۲۰۱۶ء کو آٹھ بجے رات ان کے بڑے بیٹے ڈاکٹر منظر حسنین کی رہائش گاہ (آزاد نگر، جمشید پور) میں ہوا۔ نمازِ جنازہ ۸/ستمبر ۲۰۱۶ء کو بعد نمازِ ظہر ادا کی گئی اور پرولیا روڈ قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ منظر شہاب اپنی کشمکش حیات کا ماحصل یہ اشعار چھوڑ گئے:

اس دور میں پتھر کی انا چاہیے یارو شیشے کی کوئی چیز سلامت نہ رہے گی

......

بیچ دریا کے خموشی ہے، کنارے ہلچل میری کشتی کا سفر ختم ہوا لگتا ہے

ہم یہ جانتے ہیں کہ منظر شہاب ترقی پسند شاعر تھے اسی لئے ترقی پسند تحریک کے زوال کے بعد بہتوں کی طرح ترقی پسندی کے منکر کبھی نہیں ہوئے اور نہ اپنی شاعری کو مقصدیت کا آلہ بنایا۔ ترقی پسندی کے باوصف ان کے یہاں فن کا احترام بہتوں کے مقابلے میں بدرجۂ اتم ملتا ہے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''پیراہنِ جاں'' ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا جس میں ۱۹۴۸ء سے ۱۹۸۸ء تک کے کلام شامل ہیں۔ گرچہ ان کا شعری سرمایہ ۴۱ سال کے طویل عرصے پر محیط ہے جو کافی تاخیر سے منظر عام پر آیا مگر اس کے وجود نے ثابت کر دیا کہ شاعری مقصدیت اور جمالیت کے امتزاج سے کس طرح سحر کار بنتی ہے۔ اس پہلے مجموعہ نے ہی بتا دیا کہ منظر شہاب الفاظ کے مزاج داں

تھے، ان کی قدر و قیمت پہچانتے تھے، الفاظ میں پوشیدہ ساحری کو اچھی طرح محسوس کرتے تھے۔ اس لئے انتہائی مشاقی اور خوش سلیقگی سے انہیں برتتے رہے۔ منظر شہاب کے الفاظ محض لفظوں کی ترتیب کے قواعدی اصولوں کے پابند نہیں تھے، وہ اپنی دنیا رکھتے ہیں اور جذبات کی کیمیا سے گزر کر آزاد اور کھلی فضا میں سانس لیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں نادر تشبیہات اور تازہ کار استعاروں کا عجب نظام ملتا ہے۔ رمز و کنایہ کا ان کے یہاں استعمال حد درجہ منفرد و مخصوص ہوتا ہے، جن سے ''پیراہن جاں'' کا گوشہ گوشہ جگمگاتا نظر آتا ہے۔

''پیراہن جاں'' کی نظمیں ''ساقی نامہ''، ''ایک رات'' اور ''چاندنی رات'' باور کراتی ہیں کہ تخلیقی عمل میں مقصدیت اور جمالیت کا خوبصورت امتزاج ہو تو شاعری سر چڑھ کر بولتی ہے۔ ''ایک تہنیتی نظم (بنام مظہر امام)''، ''ہدیۂ خلوص (بنام کامریڈ محمد عالم)'' جیسی واقعاتی نظموں میں نظریاتی آئینہ بندی کے ساتھ ساتھ اسلوب کی بہار اور الفاظ کے نکھار کا سجا نگار خانہ قابل دید ہے۔ نظمیں ''ماتم زکی انور کا'' اور ''شجر کے چوتھے جگنو کا آخری سفر'' اصلاً مرثیہ ہیں اور اتنے دلدوز کہ انھیں Elegy بھی کہا جا سکتا ہے کیونکہ ان میں شاعر کی دردمندی قاری کے اندر بوند بوند اترتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور نس نس میں درد کی لہر بن کر سما جاتی ہے۔ یہ مرثیے جمشید پور کے ہولناک فرقہ وارانہ فساد کی ایسی پر اثر آئینہ کاری کرتے ہیں کہ ان میں الفاظ احساس کی آنچ سے پگھلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور آنسوؤں کی ترسیل بن جاتے ہیں جو کاسۂ چشم سے ٹپک بھی نہ سکے۔ یہ مرثیے ان کے اس شعر کے مصداق ٹھہرتے ہیں کہ:

سنی جو میری کہانی تو رو پڑے سب لوگ　　سبھوں کے درد میں اک رشتۂ نہاں نکلا

منظر شہاب کی دردمندی، زندگی سے گہری انسیت، اقدار کی پامالی سے سلگتی دھیمی دھیمی چیخ ان کی غزلوں میں بھی موجود ہے مگر چیخ میں کرختگی نہیں، لہجے میں وہ پھوہڑ پن نہیں، گھن گرج، بلند آہنگ دعوے اور نعرہ بازی نہیں جو مقصدی یا ترقی پسند شاعری کا طرۂ امتیاز باور کیا جاتا رہا ہے بلکہ یہ اس موقف پر سدا گامزن رہے کہ:

نرم لہجہ بھی عجب آگ لگاتا ہے شہابؔ　　آگ دھیمی ہی سہی دل سے لپٹ جاتی ہے

اس کی توجیہہ مظہر امام نے یوں کی ہے:

''منظر شہاب کی شاعری عام طور سے بالواسطہ اظہار کی شاعری ہے، ہر چند انہوں نے وقتی مسائل کے تعلق سے بھی نظمیں اور اشعار کہے، مگر چونکہ ان کا مزاج بنیادی طور پر رومانی رہا، اس لئے انہوں نے ایسے موضوعات و مسائل کے برتاؤ میں بھی نرمی، نفاست، تزئین اور آرائش کو ترجیح دی اور تحریک کے سیاسی نظریئے سے اتفاق رکھتے ہوئے بھی شاعری کو شاعری کی طرح برتا۔ انہوں نے رمزیت و ایمائیت سے بھی حسبِ ضرورت خلاّقانہ کام لیا اور استعارہ سازی اور پیکر تراشی سے بھی اپنی تخلیقات کو تہہ داری عطا کی۔ ان کی شاعری صرف غمِ دوراں کی شاعری نہیں ہے۔ اس میں غمِ جاناں بھی ہے اور غمِ ذات بھی۔ انہوں نے انفرادی احساس اور تجربے سے اپنی شاعری کا نگار خانہ سجایا ہے۔ ان کے کلام کو ان کے دل آویز دلکشی کے حوالے سے دیکھنا چاہئے......''

(کتاب 'تنقید نما' ۲۰۰۴ء مضمون ''منظر شہاب: پیراہنِ جاں اور تیز ہوا''، ص: ۱۶۷)

ان کا دل آویز دلکشی کیا ہے؟ اس کی وضاحت کلام حیدری نے یوں کی ہے:

''منظر شہاب کی زبان پُر اثر ہے۔ اس میں شعلگی اور لپلپاتی آگ کی لپٹیں نہیں ہیں مگر ہڈیوں تک پگھلا دینے والی وہ آگ ہے جو اوپر سے راکھ ہے۔ منظر شہاب کی پوری شاعری مدھم آگ ہے۔ شعریت بہت کم مجروح ہوئی ہے، وہ بھی ترقی پسندی کے ۱۹۵۰ء-۱۹۵۱ء اور ۱۹۵۲ء وغیرہ کے خارجی اثرات کی بنا پر، منظر شہاب کو وہاں تلاش کرنا، اس کی شناخت کرنا غلط ہوگا، وہ تو یہاں ہے:

دوست پتھر نہ اٹھاؤ یہ ہے غیروں کا چلن زخم پھولوں کے لگاؤ کہ سنبھل بھی نہ سکوں''

(ماہنامہ 'کتاب نما': نئی دہلی، شمارہ: ۱۰، ۱۹۹۱ء، ص: ۶۷-۶۸)

یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں خوش آوازوں اور دلنشیں رنگوں سے قدم قدم پر معانقہ ہوتا ہے۔ فکری اعتبار سے منظر شہاب کی شاعری میں ۱۹۷۷ء کے آس پاس ایک نیا موڑ آتا دکھائی

دیتا ہے۔ وہ، یہ کہ نظریاتی وفاداری کے ساتھ عصری حسیت کی آمیزش سے اپنی شاعری کو نیا رنگ و آہنگ دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ گرچہ ان کی باخبری، سماجی دردمندی وہی ہے جو پہلے تھی، نظریاتی پاسداری میں بھی کوئی فرق نہیں آتا مگر اب الفاظ کے سبھاؤ، سجاؤ اور گھبن سے اسلوب میں جادوگری اور نئے تلازمات کی مصوری سے نئے نگارخانے کی تزئین کرتے نظر آتے ہیں۔ شعری مجموعہ ''پیراہن جاں'' میں اس رویہ کی کچھ جھلک ملتی ہے مگر دوسرا مجموعہ ''مجروح پرندے کی صدا'' (مطبوعہ: ۲۰۰۷ء) میں منظر شہاب الگ رنگ ڈھنگ میں سامنے آتے ہیں۔ کہتے ہیں :

خوش رنگ موتیوں سے سجائیں غزل شہابؔ
انمول آنسوؤں کا خزانہ کریں گے کیا

اس لئے یہ مجموعہ خالص غزلوں پر مشتمل ہے۔

جب معاشرت، سیاست، تہذیب اور تمدن بدلے تو زندگی کے دھارے بدلے اور قدریں بدلیں۔ زندگی نئے مسائل و معاملات سے دوچار ہوئی۔ ان تغیرات نے شاعر کو جو درد دیا ہے اس کا اظہار تو حسبِ حال کرنا ہی تھا سو منظر شہاب نے خوب کیا اور اس طرح کیا:

ضعیف جسم تھا تخئیل ذی فراش نہ تھی   زوالِ عمر میں بھی تھے شگفتہ ذہن شہابؔ
رنگ لائے گی زخمِ پیرہنی   درد پگھلے گا ہڈیوں میں جب

ظاہر ہے جب درد ہڈیوں میں پگھلتا ہے اور اشک بن کر ٹپکنے کی بجائے شعروں میں ڈھلتا ہے تو اثر رکھتا ہے اور اثر پذیری کا فن ابھی تک غزل ہی ہے۔ لہٰذا ان کی غزلیں مقصدیت اور جمالیات کے آمیزے سے تیار دھنک رنگ شعری پیکروں پر مبنی شبنم بن کر موتی رولنے کی صناعی کے نمونے ہیں، جن میں مختلف النوع اپنے اور بنی نوع انسان کے درد، متبدل تہذیب اور سیاست کے بخشے ہوئے کرب، سائنس اور ٹکنالوجیکل ارتقا کے ضرب سے ابھے احساسات وادراک کے ایسے پیکر ملیں گے جو نظر کو خیرہ، فکر کو مہمیز اور دل کو مسوس کر رکھ دیتے ہیں۔ عموماً غزلوں میں حیرتناک جلوے گاہے گاہے کوندتے ہیں مگر ان کی بعض غزلیں پوری کی پوری ''از دل خیز دو بر دل ایزد'' کی مصداق ہیں اور فن میں مقصدیت کی آمیزش پر نیش زنی کرنے والوں کو آئینہ دکھاتی ہیں۔ مثلاً یہ اشعار دیکھیں :

خرد کی دھوپ کڑی دوپہر میں کیا ہوگی　　ابھی تو عکسِ رخِ صبح کی تمازت ہے

......

کچے آنگن میں کھلے پھول نہ مرجھا جائیں　　دھوپ ڈالر کی ابھی گرچہ ضیا سی ٹھہری

......

کیا ضروری ہے فسادات لکھیں　　کیوں نہ اس کو لفظ گجرات لکھیں

......

ریشے ریشے میں کہیں زہر نہ بھر دے شبنم　　ہم نشینوں سے کبھی یوں نہ ڈرے تھے پتے

......

نرم و نازک تھے بہت پھول کنول کے پر اب　　اس میں ایک تیز انی کیوں ہے سمجھنا ہوگا

یہ مثالیں شاہد ہیں کہ پہلے کے مقابلے ان کے اسلوب میں تنوع، شعروں میں تپش اور نشتریت زیادہ در آئی ہے۔ گویا ع ''گردوں کا رنگ دیکھ بدلتا سخن کا رنگ' کے مصداق ''چپکے چپکے شہاب کے دل میں جو شاعری طرز نوا گاتی ہے'' اس کے جلوے خوب تر ہیں۔ نئے الفاظ، الفاظ کی نئی معنویت، نئی اصطلاحوں، نئی نئی زمینوں، استعاروں کے نئے رنگ و آہنگ، نئی نئی ترکیبوں اور نئی نئی علامتوں کی پھبن اور کھبن دیکھ قاری عش عش کر اٹھتا ہے۔ ہاں! کہیں کہیں ان کی نامانوسیت منظر شہاب کے شبنمی لہجے کو گھائل ضرور کرتی ہے مگر ان سے تنگ دامنی کا ازالہ بھی ہوتا ہے اور تہذیبِ فن کی پاسداری بھی ہوتی ہے۔ اس کی دو مثالیں کافی ہیں:

رخسار کھل اٹھے تو بدن کے تمام عضو　　اس حسنِ اختصار کی تفصیل ہو گئے

......

حرفِ گفتار تھر کتے ہیں اب انٹرنیٹ پر　　روبرو کیفیتِ دل کا بیاں بھول گئے

لہٰذا اس کے اعتراف میں کوئی باک نہیں کہ منظر شہاب تہذیب فن کے شاعر تھے۔ وہ ایک ایسے حساس فنکار تھے جن کا آئینہ تندیٔ صہبا سے پگھلتا رہا ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی نے روزانہ 'قومی آواز'، دہلی شمارہ ۴؍مارچ ۱۹۹۱ء میں لکھا ہے کہ :

''منظر شہاب ایک ترقی پسند شاعر ہیں۔ ان کا ذہن کشادہ ہے۔ وہ کسی خاص نظریئے سے بندھے ہوئے نہیں ہیں۔ ان کی شعری تخلیقات میں ذات اور کائنات کا انتہائی خوبصورت اظہار ملتا ہے۔ ان کی شاعری کو ترقی پسندیدیت

اور رومانیت کا حسین امتزاج سمجھنا چاہئے۔اچھا شاعر اپنا لہجہ رکھتا ہے اور منظر شہاب کا ایک لہجہ ہے۔"

منظر شہاب نے تنقید بھی لکھی ہے۔منظر شہاب کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "اور پھر بیاں اپنا" ان کے ادبی سفر کا احاطہ کرتا ہے۔مضامین کی اہمیت سے کوئی بھی باشعور انکار نہیں کر سکتا۔ منظر شہاب خود بھی گہری فکر کی شخصیت کے مالک تھے۔جو کچھ بھی لکھتے رہے اس میں تنوع اور مواد کی جامعیت موجود ہوتی ہے۔اس کتاب میں شامل مضامین میں "میتھلی کے لوک گیت"، "حیات و کائنات: مختلف بھی، اہم بھی"، "مولانا آزاد کا اسلوب"، "اختر پیامی: تیرے غزال کیا ہوئے؟ تیرے ختن کو کیا ہوا؟"، "میر تقی میر اور سودا کی غزلوں کا تقابلی جائزہ"، "اسٹیج کی چند اہم اصطلاحیں"، "افسانہ نگاری کے فنی حدود" ایسے مضامین ہیں جو اہم بھی ہیں، معلوماتی بھی اور ان کی تحریری صلاحیت کے غماز بھی۔

منظر شہاب جب تجزیہ کرتے ہیں، تقابلی مطالعہ کرتے ہیں، تنقیدی جائزہ لیتے ہیں تو اعتدال کا دامن نہیں چھوڑتے۔وہ فن اور فنکاری کی بات کرتے ہیں لیکن مواد کی اہمیت ان کے یہاں موضوعِ بحث رہی ہے۔زبان کی چاشنی کا جب ذکر کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ "زبان مصری کی ڈلی کی طرح شیریں ہے"۔کسی گیت کا جائزہ لیتے ہیں تو فرماتے ہیں: "اس گیت کی مثال تپتے ریگستان میں نخلستان جیسی ہے۔" جب ودّیاپتی کا تذکرہ کرتے ہیں تو تسلی آمیز باتیں کرتے ہیں: "......یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ ودیاپتی محبت اور حسن کے پجاری ہیں۔" ایک جگہ انہوں نے اس کا بھی اعتراف کیا ہے: "مجھے جہاں بھی حسن ملا میں نے اس سے محبت کی۔"

غرض کہ پوری کتاب میں ان کی تحریری اور فکری صلاحیتوں کے گل بوٹے بکھرے نظر آتے ہیں۔تحریر میں جاذبیت کا خیال رکھتے ہیں۔بے جا طوالت سے احتراز کرتے ہیں۔موضوع سے بھٹکنے کی کوشش نہیں کرتے۔Pin Pointed باتیں کہنے کی ان کے یہاں بے پناہ صلاحیتیں موجود تھیں۔لہٰذا ان کی تنقیدی بصیرت کو حقیقی تنقید کا نام دیا جا سکتا ہے۔

❖❖❖

پیش خدمت ہے کتب خانہ گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے 👇
https://www.facebook.com/groups
/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
0307-2128068 📱
@Stranger ❤️❤️❤️❤️❤️❤️❤️

مظفر حنفی کی شاعری کا منفرد آہنگ

پروفیسر مظفر حنفی ادبی دنیا میں بحیثیت جدید شاعر، ناقد، محقق اور معلم اپنی شناخت رکھتے ہیں۔انہوں نے اپنی تخلیقات سے اردو ادب کو مالا مال کیا ہے۔اُن کے نمائندہ کلام کا مجموعہ ''چنیدہ'' زیرِ نظر ہے۔وہ ایک پکے اور سچے مسلمان ہیں۔اُن کے دل میں اللہ کی عظمت پورے طور پر منقش ہے۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے اس مجموعے کا آغاز اس حمدیہ شعر سے کیا ہے:

خدائے عزّ و جل تو جاوداں کرتا ہے لفظوں کو
مظفرؔ اپنی ہر تخلیق تیرے نام کرتا ہے

وہ جانتے ہیں کہ لفظوں میں تاثیر خود بخود پیدا نہیں ہوتی بلکہ لفظوں میں بھی کشش خدا عطا کرتا ہے۔اس لئے ان کی خواہش ہے کہ اس کی تخلیق جس میں بظاہر کوئی ایسی کشش موجود نہیں جس کے وہ متمنی ہیں مگر خدا سے دعا گو ہیں کہ ان کے لفظوں میں ایسی تاثیر پیدا کردے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں بیٹھ جائیں۔

مظفر حنفی کی شاعری میں حیات و کائنات کی رنگینیوں کے ساتھ مشاہدات و تجربات اور عصری حالاتِ زندگی پورے طور پر نمایاں نظر آتی ہیں۔ان کی شاعری میں فیض و فیضان حاصل کرنے کی سعی ملتی ہے اور فنی صلاحیتوں کو منقش کرنے کی ہر ممکن کوشش بھی نظر آتی ہے۔ان کی بالغ نظری پر کسی کو اعتراض نہیں ہوسکتا کیوں کہ وہ کیف و کشش کی متحرک تصویر پیش کرتے ہیں۔ان کے یہاں الفاظ و ادا سادگی کے ساتھ معنویت کی گہرائی کو منور کرتے ہیں۔مظفر حنفی کا کلام حقیقت کی وضاحت کرنے کے ساتھ حالات و واقعات میں بیداری اور حرکت و عمل سے جذبات کو مہمیز اور متحرک کرتا ہے اور دعوتِ عمل بھی دیتا ہے۔ان میں مشاہدہ اور مطالعہ دونوں کو ہم دیکھ سکتے ہیں اور کیفیت کو محسوس کرسکتے ہیں۔

''عرضِ حال'' کے عنوان کے تحت شاعر رقمطراز ہے کہ ''میں اُناسی (۷۹) سال کا ہوگیا ہوں مگر اللہ کا فضل ہے کہ آج بھی میرے دل میں وہی طغیانی موجود ہے جو ایامِ شباب میں موجزن تھی۔'' شاعر تنقید نگاروں کی جارحیت کی پروا کئے بغیر اپنا سفر جاری رکھنا چاہتا ہے۔ اس مشینی دور میں جب انسان بے پناہ مشغول ہے اُسے فرصت کہاں کہ ضخیم کتابوں کا مطالعہ کرے۔ اس نکتہ کو سامنے رکھ کر شاعر اپنے چنیدہ اشعار جمع کر کے قاری کو پیش کرتا ہے اور اس کی خواہش ہے کہ ادب کے طلباء اس کو پڑھیں اور اپنا نقطۂ نظر واضح کریں۔

شاعر کے دل میں ایک اُڑان ہے جو اُسے کسی پل چین سے بیٹھنے نہیں دیتی۔ اُس کے دل میں پلنے والا درد اُسے کچوکے لگاتا ہے کہ وہ کچھ کہے۔ دو رباعیات دیکھیں:

گر خود کو سنبھالوں نہ میں آنسو کی طرح　　یہ فن بھی ہے تاثیر میں جادو کی طرح
دن رات گھمائے مجھے صحرا صحرا　　خوشبوئے سخن نافۂ آہو کی طرح

......

بھڑکی ہوئی اک مشعلِ غم رکھتا ہوں　　شبنم کی طرح دیدۂ نم رکھتا ہوں
دُکھتی ہوئی رگ اپنی چھپالے دنیا　　مجبور ہوں کاغذ پہ قلم رکھتا ہوں

شاعر جدیدیت کی طرف مائل ہے پھر بھی روایت سے اپنا رشتہ جوڑے رکھا ہے جس کی وجہ سے اُس کی شاعری قاری کو ایک نئے لطف سے ہمکنار کرتی ہے۔ اُس کی شاعری میں میرؔ جیسا درد ہے اور غالبؔ جیسی شگفتگی بھی ہے۔ ان دونوں کے امتزاج سے وہ ایسی تصویر بناتا ہے جس میں حسن و عشق بھی ہے، دردمندی بھی اور وفاشعاری بھی، کسی کے کام آنے کا جذبہ بھی، خودداری بھی اور جفاؤں کو برداشت کر کے اُف نہ کرنے کا سلیقہ بھی۔ شاعر کو احساس ہے کہ درد و غم، کرب و الم بھی مقدر ہے۔ اس کے باوجود وہ خدا سے اس کا شکوہ نہیں کرتا اور پوری ہمت اور جواں مردی کے ساتھ زندگی کے راستہ پر اپنی گاڑی دوڑاتا ہے اور اپنے مشن کی تکمیل میں پوری طرح پُرعزم ہے جو اس رباعی سے واضح ہے:

تقدیر پہ الزام نہیں دھر سکتے　　خاکے میں سیہ رنگ نہیں بھر سکتے

ہر لوح پہ تحریر ہے جینا ہے حرام　　آواز لگا دو کہ نہیں مر سکتے

شاعر کو محبوب کا دیا ہوا زخم پیارا ہے۔ وہ اُسی کے سہارے اپنی زندگی کی گاڑی کو آگے لے جانا چاہتا ہے۔ عمر کے اس پڑاؤ پر اس کی نگاہ سمٹ کر رہ گئی ہے۔ اب وہ خود کو رومانی تصور سے دور رکھ کر زندگی گذارنا چاہتا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو:

مہکتے رہیں پھول احساس کے　　مرا زخم یوں ہی ہرا چھوڑ دو
مبارک تمہیں پرچم و تخت و تاج　　مری دھوپ اور بوریا چھوڑ دو

شاعر زمانہ کے ساتھ ساتھ اپنا رُخ نہیں بدلتا ہے بلکہ وہ اپنا راستہ الگ نکالتا ہے۔ شعر یوں ہے:

تم رُخ بدل رہے تھے زمانے کیساتھ ساتھ　　کیسا نظر بچا کے زمانہ نکل گیا
دنیا سے مختلف ہے مظفؔر کا راستہ　　اتنا لُٹے کہ نام ہمارا نکل گیا

شاعر کو ناقد سے شکوہ ہے کہ اُس کی نظروں میں بظاہر خوبصورت اشعار تو سما جاتے ہیں مگر اُسے سنجیدہ اشعار نہیں بھاتے جس کی وجہ سے اچھے اچھے شعراء کی پذیرائی نہیں ہوتی ہے اور اُن کے محاسن کلام سامنے نہیں آتے۔ شاعر نئی نئی زمین اور جدید غزلوں کی تخلیق کر رہا ہے، مگر ناقدین نظریں اس جانب نہیں کرتے۔ شعر دیکھئے:

ہر جامہ زیب تیری نظر میں سما گیا　　چہرہ کھلی کتاب ترے واسطے نہیں
اے خوش نما کنول تری قسمت خراب ہے　　شفاف سطحِ آب ترے واسطے نہیں
پیہم نئی زمین، مظفؔر، نئی غزل　　کیا نقد و احتساب ترے واسطے نہیں

شاعر کو احساس ہے کہ وہ اپنے ہم عصروں میں ممتاز مقام کا مالک ہے۔ اُس کے اشعار فنی تقاضوں کے مطابق ہیں۔ اس میں وہ سب کچھ ہے جس کا فن متقاضی ہے۔ اس کے باوجود ناقدینِ ادب کا رویہ نا قابل فہم ہے۔ شعر ملاحظہ فرمائیں:

عہد سازوں میں مظفؔر کا کوئی ہمسر ہے　　ایک ناقد سے مری فکرِ رسا نے پوچھا

مظفر حنفی شاعری کو عبادت تصور کرتے ہیں، وہ اپنے احساسات کو غزل کے سانچے میں

ڈھال کر قاری تک پہنچانا اپنا فرضِ منصبی سمجھتے ہیں۔ وہ مختلف اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کرتے ہیں مگر اُن کا سرمایۂ حیات غزل ہے۔ وہ کہتے ہیں:

مری حیات کا سرمایہ ہے غزل گوئی   یہی سلیقہ مجھے عمر بھر میں آجائے

شاعر بے پناہ حساس ہوتا ہے اور وہ وہی لکھتا ہے جو وہ محسوس کرتا ہے چاہے اس کی پذیرائی ہو یا نہیں۔ وہ اپنے احساسات بہر حال قاری تک پہنچانا اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کی روش اور اس کی سنجیدہ شاعری ناقدین ادب کو اپنی طرف مائل نہیں کر سکے گی اس لئے وہ بار بار اس جانب یوں اشارہ کرتا ہے:

ہمارے پاؤں میں چھالے بہت ہیں اسلئے ہم پر   گل افشانی نہیں ہوگی، گہرباری نہیں ہوگی
ہمیشہ سے وہی کہتے ہیں جو محسوس کرتے ہیں   مظفرؔ شاعری میں ہم سے عیاری نہیں ہوگی

اردو شاعری میں میر تقی میرؔ کی زندگی درد وغم سے عبارت رہی ہے۔ میرؔ درد وغم کو پیتے رہے ہیں اور اس کا اظہار بھی بڑے سلیقے سے کرتے رہے ہیں۔ شعر دیکھیں:

جو اِس شور سے میرؔ روتا رہے گا   تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

مظفرؔ حنفی بھی درد وغم کو اپنی میراث تصور کرتے ہیں اور اسے پی جانا چاہتے ہیں۔ وہ چیختے نہیں بلکہ اپنی آنکھوں میں پرو کر قطروں کی شکل میں موتی بنا دینا چاہتے ہیں۔ ان کا شعر ہے:

تلخیاں تو مظفرؔ کی میراث ہیں   شعر میں آنسوؤں کو چھپاتا ہے وہ

شاعر اپنی حکایت بیان کر دینا چاہتا ہے۔ اُسے کسی صلہ کی تمنا نہیں ہے۔ وہ اپنی شاعری کو عبادت سمجھتا ہے اور عبادت کے بدلے وہ کسی اعزاز کا متمنی نہیں۔ شعر دیکھیں:

سارے اعزازات سے افضل ترین   لہجۂ بے باک میرے واسطے

شاعری رجائی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ مسلسل کاوش کرتے رہنا اُس کی ذمہ داری ہے جب مٹی نم ہوگی تو انکھوے ضرور پھوٹیں گے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

بیجوں کے ساتھ ساتھ پسینہ بھی چاہئے   انکھوے ضرور پھوٹیں گے مٹی تو نم کرو
غیروں کی داستاں میں اثر کیسے لاؤ گے   کچھ اپنے تجربوں کی حکایت رقم کرو

بے کیف ہو رہی ہے مظفرؔ یہ انجمن　　　تم ہی غزل سنا کے اُسے تازہ دم کرو

مظفرؔ حنفی کو شاعری وراثت میں نہیں ملی بلکہ وہ ایک فطری شاعر ہیں اور اسی کا اسیر بن کر رہ گئے ہیں۔ نہ تو وہ اس جذبہ کو دل و دماغ سے کھرچ کر پھینک سکتے ہیں اور نہ وہ زمانہ کے ساتھ چل سکتے ہیں۔ شاعری ان کے گلے پڑ گئی ہے جس کو وہ ڈھو رہے ہیں۔ شعر ملاحظہ ہو:

مظفرؔ گلے پڑ گئی شاعری　　　یہ پیشہ مرا خاندانی نہیں

وہ شاعری کو پیغمبری سمجھتے ہیں اس لئے ہمیشہ ناری کو نوری نہیں کہتے:

مظفرؔ سچ ہی کہتا آ رہا ہوں سچ ہی لکھتا ہوں　　　خدا کا شکر ہے ناری کو میں نوری نہیں کہتا

شاعر زخم کھا کر مسکرانا اپنی فطرت سمجھتا ہے۔ دوسروں کے وار کو سہنا اس کی فطرت بن گئی ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی ذات میں انجمن بن گیا ہے۔ چند اشعار اس ضمن میں ملاحظہ ہوں:

تیغ میری نوادرات میں ہے　　　اور کشکول میرے ہات میں ہے

زخم کھاتا ہوں مسکراتا ہوں　　　وار کرنا تری صفات میں ہے

گرتی رہتی ہے دل پہ شبنم سی　　　جانے کیا بات اس کی بات میں ہے

تم نے دیکھا نہیں مظفرؔ کو　　　انجمن وہ بھی اپنی ذات میں ہے

شاعر خود پر وار کرنے والوں سے بھی حسنِ ظن رکھتا ہے:

وہ ہم سے لاکھ رکھے بدگمانی　　　ہمارا حسنِ ظن جاتا کہاں ہے

....

مجموعہ کے اخیر میں مظفرؔ حنفی پھر ناقدین ادب سے مخاطب ہوتے ہیں اور شاعر کے قد کو چھوٹا کرنے پر احتجاج کرتے ہیں۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

گھٹاتے کیوں ہو میرا قد، مری آواز نقادو
کبھی سچ بولنا سیکھو نظریہ ساز نقادو
حقیقت بھی سر آنکھوں پر ہے جدّت بھی سر آنکھوں پر
مگر اک شئے لطافت بھی ہے نعرے باز نقادو

ہر اک سچائی کو تقسیم کردیتے ہو خانوں میں
ہر اک ندرت کو کرتے ہو نظر انداز نقادو

کئی صدیوں سے کس کی گونج ہے ہندوستاں بھر میں
سنا تم نے ، غزل کے دشمنو ، طناز نقادو

مگر تازہ ہوا سے واسطہ تم نے نہیں رکھا
پروں سے مصلحت کے مائلِ پرواز نقادو

دیانت خون بن کر دوڑتی ہے اس کی باتوں میں
اِسی میں ہے مظفرؔ کی غزل کا راز نقادو

مظفرؔ حنفی کی شاعری تیز احساسات کی زائیدہ اور گہرے جذبات کی پروردہ ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کی اساس اپنے ذاتی تجربات اور خود پر بیتے حالات پر رکھی ہے۔ اس کو سادہ اور دلنشیں، سلیس اور تکلفات سے عاری زبان میں پیش کیا ہے جو قاری کے دل تک اترتی چلی گئی۔ یہی شاعری کا کمال بھی ہے اور اس میں مظفرؔ حنفی پورے طور پر کامیاب ہیں۔

❖❖❖

پیش خدمت ہے کتب خانہ گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے 👇
https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
0307-2128068 📱
@Stranger ❤️❤️❤️❤️❤️❤️❤️

سیّد احمد شمیم: عصرِ نو کا ایک اہم شاعر

سیّد احمد شمیم ہمارے عہد کے اہم شاعر و نقاد ہیں۔ ان کے مضامین کا مجموعہ "ارژنگ" ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل کر چکا ہے۔ حال ہی میں ان کے خاکوں کا مجموعہ "بند آنکھوں کا تماشہ" شائع ہوا ہے۔ موصوف کی ادبی خدمات پر ڈاکٹر انوری بیگم نے ایک کتاب "آئینہ در آئینہ" لکھی ہے جسے پسند کیا گیا ہے۔ سیّد احمد شمیم کریم سٹی کالج، جمشید پور سے صدر، شعبۂ اردو کی حیثیت سے سبک دوش ہو کر تصنیف و تالیف کے کاموں میں مصروف ہیں۔ ان کی حیثیت ایک اچھے خطیب کی بھی ہے اور سہ ماہی "وقت" (مدیر: سید منظر امام) نے ان پر ایک مبسوط گوشہ بھی نکالا تھا۔ جہاں تک رہی سید احمد شمیم کی شاعری کی بات، تو اس پر قلم اٹھانے سے قبل میں مظہر امام کے اس جملے سے آغاز کرنا ہی بہتر سمجھوں گا کہ:

"سید احمد شمیم کی جگہ اول الذکر صف میں ہے۔ وہ شعر کہتے ہیں اور شعر کہنے کا حق رکھتے ہیں...... سید احمد شمیم جدیدیت کی ابتدا اور اس کے عروج کے زمانے کے شاعر ہیں۔"

سید احمد شمیم نے خالق کائنات کی ثنا خوانی کر کے توشۂ آخرت جمع کرنے کی سعادت بھی حاصل کی ہے۔ ان کا شعری مجموعہ "بے در و دیوار" حمد سے شروع ہوتا ہے:

بے حسی پتھر کو بخشی، آگ کو سوز و تپش
موجِ دریا کو روانی، سیپ کو گوہر دیا

اللہ تبارک و تعالیٰ کے حضور دعا بھی قابلِ توجہ ہے، ملاحظہ فرمائیں:

غبارِ تشکیک میں گرفتہ/ خود اپنے بارِ انا کے نیچے/ دبا ہوا ہے....../ مگر یہ تیرا/ حقیر بندہ!

اسی طرح سید احمد شمیم کا شعری مجموعہ ''ڈوبتی شام'' رنگوں کے اعتبار سے ڈوبتے ہوئے سورج کے وقت جو رنگ آسمان پر بکھرا رہتا ہے، کم وبیش اسی رنگ کا سرورق اس مجموعہ کا بھی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی ڈسٹ کور پر سید احمد شمیم کی شاعری پر یوں رقم طراز ہیں:

''ان کا رجحان انفرادیت پسندی کی طرف رہا ہے۔ دنیا کو انہوں نے اجنبی کی آنکھ سے دیکھا ہے۔ اس اجتماعی آنکھ سے نہیں جو ترقی پسند بوطیقا نے اپنے ہر مقلد کی فطری آنکھ پر چڑھا رکھی تھی۔''

پروفیسر وہاب اشرفی نے ان کی شاعری کے متعلق لکھا ہے:

''سید احمد شمیم کی نظمیں ہوں یا غزلیں، دونوں ہی ایسے تحیر زا مناظر پیش کرتے ہیں...... اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ شمیم عشق و عاشقی کے ایک منفرد شاعر ہیں۔ اگر یہ خیال درست بھی ہے تو انہیں حیرت زدہ عاشق کہئے، جس کی عشقیہ شاعری جسم و جان سے پرے ہٹ کر کائنات کی پیچیدگی اور اس کے عوامل کے حیرت زا پہلوؤں سے والہانہ شگفتگی کا کیف پیدا کر رہی ہے۔''

سید احمد شمیم نے اس مجموعہ کے آخری صفحہ پر ایک مختصر سی نظم ''جستجو'' لکھی ہے جو ان کی ذات کی خود تلاش کا پتہ دیتی ہے اور کتاب کے ڈسٹ کور پر جہاں ان کی تصویر ہے، کے نیچے یہ شعر خود ان کی شاعری کی پہچان کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے:

پگھلتی رہتی ہیں ہر لمحہ دل کی دیواریں
کرے گا کون یہ ساون قبول میرے سوا

اسلم بدر نے اس مجموعہ کے پیش لفظ بعنوان ''اپنی آنچ میں پگھلتا شاعر'' میں کچھ اس طرح لکھا ہے:

''......سید احمد شمیم کی بے نیازی مسلّم ہے۔ بقول شمس الرحمٰن فاروقی نہ صرف اپنے آپ بے نیاز ہیں بلکہ شہرت سے گریز پائی بھی ان کا ایک وصف ہے......''

شاعر اپنے ذوق کی تسکین کے لئے شاعری کرتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اسے وہ شائع ہی

کرے۔ اگر وقت اور حالات نے اسے موقع دے دیا یا کسی طور پر اس کا مجموعہ سامنے آ گیا تو اس کے اندر چھپے ہوئے جوہر نکھر جاتے ہیں اور لوگ ان کی شاعرانہ عظمت سے واقف ہو جاتے ہیں کیوں کہ مشاعرہ کا شاعر وقتی چھاپ چھوڑتا ہے لیکن جو شاعر صاحبِ کتاب ہوتے ہیں، اس کی شاعری پر لوگوں کی نظر ہوتی ہے اور اسے گہرائی سے لوگ پڑھتے ہیں۔ سید احمد شمیم کی شاعری کو میں نے اسی زاویئے سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ سچائیوں کو سمجھنے کا عمل ایک عمر کے بعد آتا ہے لیکن اس کے بعد بھی انسان خواب دیکھنا بند نہیں کرتا۔ یہ انسانی فطرت ہے اور اس خواب سے انسان وقتی طور پر سکون بھی پا لیتا ہے۔ سید احمد شمیم نے بھی کچھ ایسا ہی محسوس کیا ہے:

اپنے خوابوں کے دریچے سے نہ باہر جھانکو   آرزوؤں کے شجر دھوپ میں جل جائیں گے

......

لوگوں نے ساتھ چھوڑ دیا وقت کی طرح   تنہائیوں کو آج گلے سے لگایئے

ان کے بیشتر اشعار رومانی پیکر میں ڈھلے ہوئے ہیں لیکن وقت اور حالات کی سچائیوں کے ساتھ ان کا رشتہ نہیں ٹوٹتا:

آگہی کر گئی بہت گمراہ   کام آئی تو عاشقی آئی

......

ہجوم عاشقاں میں مجھ پہ ٹھہری   تیری تلوار ، سر پہچانتی ہے

......

تمہیں میں بھولتا رہتا ہوں لیکن کیوں نہیں بھولا   نگاہ و دل کا رشتہ جانِ من توڑا نہیں ہے

......

غیر تو غیر ہیں، تم نے بھی ستم کم نہ کیے   اب گلہ کیسے کریں ہم کسی بے گانہ کا

سید احمد شمیم کی نظمیں گفتگو بے صدا، آنگن کا درد، قصہ پہلی بھول کا، میں وہ نہیں، اللہ بھی چپ، چہرہ، سوال، جستجو وغیرہ کافی موثر ہیں۔

سید احمد شمیم ایک با کمال شاعر ہیں۔ مثبت سوچ رکھتے ہیں۔ گداز دل کے ساتھ وقت اور

حالات کی تبدیلی کو بھی محسوس کر کے شعری جمالیات کے ساتھ پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کی شاعری بہت ہی سادگی مگر گہرے اثر کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ وہ کسی بھی مکتبۂ فکر کی وکالت اپنی شاعری میں نہیں کرتے۔ نظموں میں مربوطیت بہت ہی کمال کا پایا جاتا ہے۔ میری ان باتوں کی توثیق کے لئے ان کے پہلے مجموعۂ کلام ''بے درودیوار'' میں شامل ان کی نظموں کے عنوان ملاحظہ ہوں:

'اجالوں میں خواب'، 'مسافت کی تھکن'، 'راون رتھی بے رتھی رگھوویرا'، 'دکھی دل لوگو'، 'اگر یہ سچ ہے'، 'سزا لب مدعا کی'، 'تم کون ہو؟'، 'صحراؤں کی پیاس'، 'ہوس جھیل میں اترنے کی'، 'چندن بدن'، 'ساون لباس'، 'پنکھڑی اور خوشبو'، 'لمس کی لذت'، 'بدن کی تھرتھری'، 'ذائقہ لہو کا'، 'صرف تمہارے نام'، ذائقہ: ماورائے بدن'، 'وپینگ ٹری'، 'قوسِ قزح'، 'حلقۂ بازو'، 'نوح کا سفینہ ڈوب چکا ہے'، 'من عرف نفسہٗ'، 'بادباں کو نہ کھولو'، 'ایک خط'، 'ایک خط اور'، 'خوشبو، پھول اور دائرے'، 'چاندنی'، 'ندی اور پتوار'، 'جھیل، ہونٹ اور جلتی لکیریں'، 'صبح ہونے کے بعد'، 'بولو! جواب دو'، 'پندار شکست'، 'شجر کی تمنا'، 'حدیں مٹ چکی ہیں'، 'سمندر موتی'، 'بادلوں سے پرے'، 'مجھے بکھرنے سے روک دینا'، 'صحرائے سکوت'، 'بادل، چاند اور سمندر'، 'رات، چاندنی اور جھیل'، 'کل من علیھا فان'، 'تم کہاں جاؤ گی؟'، 'اور جب'، 'تب کیا ہوگا؟'، 'اوس، آگ اور پالیس'، 'مہمان'، 'اندیشہ'، 'زمیں، مادرِ مہرباں'، 'لفظوں پر یقین مت کرو'، 'اعلان'، 'قیدی پرندہ'، 'مبارزت'، 'میں وفادار نہیں ہوں'، 'تم کو یہ کیا ہو گیا ہے؟'، 'شکستِ انا'، 'آئینۂ ناروا'، 'خمیازہ وراثت کا'، 'قیامت، جشنِ لہو، ماتم'، 'سفر کے بعد'، 'پرکھوں کی بھول'، 'شہر آشوب'، 'لکیریں کون کھینچے گا؟'، 'ایک سفر اور'، 'پھر تم کتنا پچھتاؤ گی'، 'لذتِ منفعل'، 'تشویش'، 'تیسری آنکھ کا عذاب'، 'پہچان'، 'لذتِ لاحاصل'، 'نروان'، 'گمراہ'، 'باہر راون ناچ رہا ہے'، 'صلیب'، 'عذاب'، 'شوقِ لاحاصل'، 'نیادرس'، 'رفیق'، 'لرزیدہ گہر'، 'آئینہ کہ جمال دارد' اور پھر غزلیں ہیں اور اخیر میں 'نوحہ برگِ گل کی گمشدگی کا'، 'ایک پرانی تصویر دیکھ کر'، 'کھوئی ہوئی آنکھیں'۔

مجموعہ میں نظموں کی بہ نسبت غزلوں کی کم تعداد کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ گویا سیّد احمد شمیم کو غزلوں سے دلچسپی کم ہے لیکن غزلوں کو دیکھ کر یہ اندازہ بخوبی ہوتا ہے کہ شاعر کو نظموں اور غزلوں

دونوں پر یکساں عبور حاصل ہے۔ ''بے در و دیوار'' میں شامل غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اس قدر ٹوٹ کے مت پیار کیا کر مجھ کو　　　تجھ سے چھوٹوں تو کبھی تجھ کو بھلا بھی نہ سکوں

......

امیرِ شہر سے مطلب نہیں قلندر کو　　　میں سب لٹا چکا اب فکرِ آبرو کیسی
مجھے تو، وحشتِ شب نے کہا تھا آوارہ　　　نسیمِ صبح پریشان تھی کو بہ کو کیسی
ہوا نہ کبھی دل کا مے کدہ آباد　　　چھلک چھلک سی اٹھی ہے مئے سبو کیسی

......

کچھ یہی بستیاں جینے کا پتہ دیتی ہیں　　　کیا بگڑتا جو نہ تو ان کو مٹاتی ندی

بہر حال نظموں کے عنوانات اور غزلوں کے اشعار دیکھنے سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ آپ فطری شاعر ہیں۔ ان پر کسی طرح کا لیبل لگا کر ان کی پہچان نہیں کی جا سکتی کیوں کہ ان کا بدلتا ہوا اسلوب، ان کا سوچتا ہوا ذہن، ان کے مطالعہ کی گہرائی، ان کے دل کی کسک، ان کے احساس کی ٹھنڈک، ان کی روح کی بے چینی، ان کے جذبات کا والہانہ پن، ان کی نظروں کی وسعت، ان کے قلب کا گداز پن، ان کے انداز کا بانکپن، شعر کا تیور، محسوسات کی آنچ، لفظوں کا زیر و بم، ترتیب و تزئین میں حسن و جمال کا عکس، موجوں کی طرح ٹھاٹھیں مارتا ہوا رواں انداز، سب کچھ کہہ کے مطمئن نہیں ہونے کا کرب، معصومیت اور کھلنڈرا پن سب کچھ ان کی شاعری میں موجود ہے۔ جس زاویہ سے دیکھیں اندازہ ہوگا کہ فن کی گرفت اتنی زبردست ہے کہ کہیں بھی بے ضابطگی کا گمان نہیں ہوتا۔ ہر جگہ ایک طمطراق کے ساتھ سنجیدگی کی دبیز تہہ شعری حسن میں اضافہ کرتی نظر آتی ہے اور مظہر امام نے صحیح کہا ہے کہ سیّد احمد شمیم کو شعر کہنے کا حق ہے اور اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ وہ اس عہد کے اہم شاعر ہیں جن کے اندر آفاق گم ہے۔

❖❖❖

پیش خدمت ہے کتب خانہ گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے 👇
https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
📱 0307-2128068
@Stranger ❤️❤️❤️❤️❤️❤️❤️

مناظر عاشق ہرگانوی کی نعتوں میں جاگتے احساس کی چبھن

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی اپنے زمانہ کے ایسے نابغہ ہیں جن کی خلاقی کے خراد پر متنوع شعری تجربوں نے، جدت اور شاعری نے وقار پایا ہے۔ ان کی ندرت فکروفن کا مظہر ان کی نعتوں کا تازہ مجموعہ ہے جس کا نام بھی اچھوتا ہے یعنی ''ہر سانس محمدؐ پڑھتی ہے''۔ ان کی نعتوں میں تازگی ہے، دل دوزی ہے اور جاگتے ہوئے احساس کی چبھن ہے، ایسی چبھن کہ قاری کا دل بھر آتا ہے، کبھی آنکھیں چھلک پڑتی ہیں، کبھی دیدہ و دل سرشار ہو اٹھتے ہیں اور ایمان کی حرارت بڑھ جاتی ہے۔ پہلے مناظر عاشق کے تخیل کی تازگی کی ایک جھلک دیکھیں :

اسی کے جلوے سے عاشق ہے روشنی ساری ۔۔۔ اسی کے نام سے دنیا میں زندگی ساری
ہر شئے میں ان کا نام ہے اس کائنات کی ۔۔۔ خلقِ خدا سے رشتہ ہے کیسا حضورؐ کا

اب ذرا گرونانک اور کبیر داس کی چوپائیوں پر نظر ڈالیں:

نام جس وستو کا انک کرو تم چوگنے داؤ ۔۔۔ دو ملائیکے پنچ گن کرلو بیسئے بھاگ لگاؤ
باقی بچے تو نوگن کرلو پیچھے دوئی ملاؤ ۔۔۔ نانک اس ودھی ہر شئے میں تم نام محمدؐ پاؤ

عدد نکالو ہر چیز سے چوگن کرلو وائے ۔۔۔ دوملائے پنچ گن کرلو، بیس سے بھاگ لگائے
باقی بچے تو نوگن کرلو، دو اس میں اور ملائے ۔۔۔ کہے کبیرا سنو بھائی سادھو، نام محمدؐ آئے

ان چوپائیوں میں حروف کے ابجدی اعداد سے ریاضی کا جو فارمولا سامنے آتا ہے اس کے مطابق کائنات کی ہر چیز کے عدد سے محمدؐ کا عدد-۹۲ نکلتا ہے۔ اس طور دونوں سنتوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ خالقِ کائنات نے اپنے حبیبؐ کا نوری کرنٹ ہر شئے میں دوڑا رکھا ہے۔ بالفاظ دیگر انہوں نے بھی تائید کی ہے کہ پیغمبر اسلامؐ وجہِ تخلیق کائنات ہیں۔ اب دیکھیں کہ ڈاکٹر مناظر

کے تخیل نے حسن ووجدان کی آمیزش سے منشاء الٰہی اور نانک وکبیر کے استدلال کی کیسی دلکش تجسیم کردی ہے کہ ''اسی کے نام سے دنیا میں زندگی ساری'' اور ''خلق خدا سے رشتہ ہے کیسا''؟ کی تہہ میں سیرت رسول اکرمؐ کی روشنی میں اترتے جایئے اور فکر وفن کے وجد آگیں کیف سے سرشار ہوتے جایئے۔

ایسی تاثیر محض سخن آفرینی کی نہیں لگتی کہ ''دل چاہتا نہ ہوتو زباں میں اثر کہاں''۔ایسی صدائیں فی الواقع تبھی دل سے نکلتی ہیں جب تجربۂانا کا عرفان ہوتا ہے، اپنے وجود کے مقصدِ تخلیق کی منشائے خالق کا ادراک اور عاقبت کا ایقان ہوتا ہے۔ پھر احساس یوں جاگتا ہے :

کچھ کر نہ سکے طاعت وللہ نبیؐ کی ہم　　یہ سوچ کے دل اپنا کچھ اور پریشاں ہے

تب مرتعش بصیرت، ہادی اعظم وشافع محشرؐ سے دل کے تاروں کو اس طور جوڑ دیتی ہے کہ حبِّ نبیؐ کی چنگاری دہکنے لگتی ہے جسے فروزاں کرنے کے لئے شاعر اپنے خالق سے یوں رجوع کرتا ہے:

اسے آباد کردے اے خدا حبِّ نبیؐ سے　　کہ اب تک دیدہ ودل کا مرے خالی مکاں ہے

ایسے احساس سے جگی بے قراری اور وجدانی کیفیت میں شاعر کا دل بھی گاہے گاہے مدحت سرا ہوتا رہا ہے۔خیال ناچیز میں نعت گوئی کا حق بھی ایسی ہی کیفیات میں ادا ہوا کرتا ہے۔ بصورت دیگر محض سخن طرازی کے ثمرات میں وہ حلاوت کہاں ملتی ہے جو لبوں پر پھیل جائے۔

انسان عموماً دنیا کے دام تزویر یعنی مایا جال میں پھنس کر اپنے دیدہ ودل میں دنیا کو ہی بسا لیتا ہے لیکن جیسے ہی زندگی کے کسی مرحلے میں ایماں کی حرارت یہ احساس کراتی ہے کہ وہ صرف دنیا کے لئے نہیں بلکہ دنیا تو اس کے لئے محض ایک میدان عمل کی حیثیت رکھتی ہے، اس کیلئے ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہے تو اسے دیدہ ودل کے مکاں خالی ہونے کا احساس شدید ہوتا ہے تب دل کی گہرائیوں سے ایسی صدائیں نکلتی ہیں:

آپ کو تو چاہنے والوں کی اپنے ہے خبر　　خواب ہی میں آکے دل پاکیزہ میرا کیجئے

کار دنیا آپ سے غافل کرے مجھ کو اگر　　لو چراغِ عشق کی اس دم بڑھایا کیجئے

اک آپؐ کا سہارا مناظر کو ہے فقط　　کچھ مغفرت کا ہے نہیں سامان مصطفیؐ

یہ صرف مناظر کے جاگتے احساس کی چبھن نہیں رہ گئی ہے بلکہ اپنے سے باخبر ہر اہلِ ایماں کی حس کو بھی کچوکے لگاتی ہے۔ یہی تو شاعری کا کمال ہے کہ یہ شاعر کے احساس، اس کے مشاہدے، اس کے تجربے کو عام حسیات کا جزو بنا دیتی ہے لیکن یہ تبھی ممکن ہوتا ہے جب بقول مناظر عاشق:

''شاعری اسلوب، طہارت اور جذبے کی بنیادی ہم کاری سے اور مختلف تخلیقاتی مراحل سے گزر کر ایک ایسے نقطہ ارتکاز تک پہنچاتی ہے جہاں حسن اور وجدان کی آمیزش سے صوتی ڈھانچے ماورائی معانی سے ارتباط پیدا کر کے نغمات سرمدی بن جاتے ہیں......۔'' (گفتنی، ص:۳۰)

اب دیکھیں کہ موصوف کا خیال ان کے فن میں کس طور اترا ہے۔ کہا ہے:

بخشا ہر ایک ذرّے کو خورشید کا فروغ　　اعجاز یہ دکھا گئی صحبت رسولؐ کی

قبل اسلام کے عرب قبائل کی جبلت کو نظر میں رکھیں اور قبولیت اسلام کے بعد ان کی اشرفیت کے عروج پر نظر ڈالیں تو پوری تاریخ انسانی میں وہی دور ایسا سامنے آتا ہے جس میں تخلیق انسانی کی منشاء الٰہی پوری ہوتی نظر آتی ہے۔ ایسی کایا پلٹ کرنے والی ہستی کون ہے؟:

وہ جس نے درد دیا دل کو درد کو عظمت　　جگر کو سوز دیا اور سوز کو راحت
دعا دشمنوں کے لئے بھی کرے جو　　نہ آیا کوئی آج تک دیں کا رہبر
کبھی پیٹ بھر جَو کی روٹی نہ کھائی　　ہیں مختارِ عالم، چٹائی ہے بستر
ہیں محتاج و نادار و بیکس کی دولت　　وہ بابِ کرم بھی تو بحرِ عطا ہیں
ہے عرفانِ حق بھی جو بندے کو حاصل　　وہی ایسے رشتے کی محکم بنا ہیں

ظاہر ہے خالق کائنات نے جس ہستی کی وجہ سے کائنات کی تخلیق کی انسان کو خلیفۃ الارض بنایا اور انسان کے عرفانِ ذات، عرفانِ حق، عرفانِ عشق و منصب کا وسیلہ اسی اپنے حبیب کو بنایا تو پھر ان سے محبت و عقیدت رکھے اور ان کے شعار کی پیروی کئے بغیر کامرانی و فلاح انسانی کیسے ممکن ہے کہ:

محمدؐ کی محبت شرط ٹھہری دین و ایماں کی　　بجز اس کے نہیں کوئی بھی صورت کام آئے گی

تفاخر بھی نہیں کچھ خاندانی کام آئے گا　　غریبوں اورمحتاجوں کی خدمت کام آئے گی

یوں مناظر عاشق ہرگانوی کے تخیلات ہماری تخئیل کو مہمیز، ہمارے احساس کو بیدار اور پندار کو چرکے لگا کر محاسبے پر مجبور کرتے ہیں۔ ایسے جذبہ و احساس کے فنی پیکروں کو محض خوش فکری کی سطح سے اٹھنے والی لہروں سے تعبیر کر کے نہیں گزرا جاسکتا۔ فی الواقع ع راہے بہ خلوت دل جانا نم آرزو ست کی زیریں لہریں شاعر کی نس نس میں دوڑتی نظر آرہی ہیں۔ بصورت دیگر تسلیم و رضا کی اس منزل پر پہنچنا ممکن نہیں کہ:

دل مرا واقف کچھ آداب محبت سے نہیں　　عاشقِ ناداں سہی کچھ اُس کو دانا کیجئے

اللہ! مناظرؔ کو دکھا شہرِ نبیؐ تو　　ڈھلنے لگا اشکوں میں مدینے کا تصور

جب نعت نبیؐ کی ہوتی ہے　　وہ داغ گنہ کے دھوتی ہے

جو یادِ خدا میں جاگتے ہیں　　کب ان کی قسمت سوتی ہے

ہوتی ہے معافی عصیاں کی　　جب آنکھ گنہ پہ روتی ہے

جہاں تک ہے رب کی رضا کا تعلق　　وہی ابتدا ہیں وہی انتہا ہیں

ہم کو بتلا دیا مقصدِ زندگی　　جس کو پانے کا بھی راستہ دے گئے

ڈاکٹر ہرگانوی کے دل میں جو سمائے، ان کی عقل نے جسے تسلیم کیا وہی اصل مقصد حیات انسانی ہے اور فی الحقیقت انسان کی کامرانی اور انسانیت کی فلاح کا صراط مستقیم بھی وہی ہے جو محسن انسانیت بتلا گئے لیکن فی الواقع اطاعت نفس، مقصود زندگی بن گئی ہے جس کے نتائج کو انسان کے ہی ایجاداتی کرشموں نے آئینہ کر رکھا ہے سوسکتی انسانیت اور ظلمت کا دوردورہ ہر آن پوری خلقت کے سامنے ہے باوجود اس کے نفس نے جو ڈگر پکڑ رکھی ہے اس پر پیچھے مڑ مڑ کر توبہ کرنے پر ہر کوئی گامزن ہے۔ اس صورت حال کا کرب و درد ان کی نعتوں میں بھی خوب ٹپکا ہے، مثلاً ایک آزاد نعت ملاحظہ ہو:

بحرظلمت میں یا محمدؐ / ہے آپؐ ہی کا بس اک سہارا / فیوضِ شبنم کی خنکیوں سے /
عذار گل ہے / لگی ہے پت جھڑ سے / آگ غم میں / اندھیرا بڑھتا ہی جارہا ہے /

جو آشکارا ہے یا پیمبر/ ہم عاصیوں کے تم ہی مسیحا/ تمہارے دم سے ہے ضوفشانی

زمانے کے سرد و گرم کا احساس تو سبھی کو ہوتا ہے مگر ان کے اثرات و مضمرات کے محسوسات کی تجسیم کاری سب کے بس کی نہیں ہوتی ۔ یہ تخلیق کار کے ہی جاگتے احساس کی مرہون منت ہوتی ہے۔ مناظر نے اس نعتیہ نظم میں اپنے زمانے کے حالات اور اس کے اثرات و مضمرات کی کربناک اور بصیرت افروز تجسیم کاری کی ہے اوران کے مداوا کے لئے محسن انسانیتؐ کے التفاتِ کرم کی جس طور آرزو کی ہے وہ جاگتے ہوئے احساس کی سراپا مظہر ہے۔

اس طرح کی عرفانِ ذات عشق اور عرفانِ تعلیقات معاشرہ پر مبنی احساسات کی دلکش و دلدوز تنویریں اور تصویریں مناظر عاشق ہرگانوی کی نعتوں میں بکھری پڑی ہیں۔ ان میں احساسات بظاہر شاعر کے ہیں مگر ہمارے احساسات بن کر دیدہ و دل میں ہلچل مچا دیتے ہیں۔ یوں ان کی نعتوں میں تازگی فکر، فنکارانہ حسن اور اسلوبیاتی تنوع دیدنی ہے جن میں عشقِ رسول کی سوچ آگیں طہارت شاعر کے دل کی آواز بنتی صاف نظر آتی ہے۔

پیش خدمت ہے **کتب خانہ** گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے 👇
https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
📱0307-2128068
@Stranger ❤️❤️❤️❤️❤️❤️❤️

ارشد مینا نگری کی تخلیقی بصیرت "ماں" کے آئینے میں

ماں جس سے زندگی کی نمود و شہود ہے۔ اس کی عظمت و رفعت، اس کی ہر ادا، ہر طرز، ہر عمل، ہر رویے، ہر احساس کی لہر، ہر رنگ، ہر روپ اور اس کے خلاف اولاد کے ناروا رویے کی جس طرح ارشد مینا نگری نے شعری تجسیم کی ہے وہ "خونِ جگر سے تربیت پاتی ہے جو سخنوری" کی تطبیق کرتی ہے۔ ماں ہوتی ہی ہے ایسی ہستی جسے شکرانِ نعمت اور اظہارِ عقیدت کے طور پر شاعر و فن کار نے ہر دور میں موضوعِ سخن بنایا ہے مگر یہاں ارشد مینا نگری کی سخن وری تمام شعرا کے مقابلے منفرد انداز میں ظاہر ہوئی ہے۔

ہر شاعر تخلیقی سطح پر انفرادی شناخت پانے کی جستجو میں رہتا ہے۔ ارشد مینا نگری کی جستجو بھی موضوعات اور شعری تجربات کے تنوع میں قرار پانے کو مچلتی رہی ہے۔ لہٰذا یہ زود گو، خوب گو اور موضوعات کا عدیم المثال سخن وری سے ملقب ہوئے۔ ان کا شعری مجموعہ "ماں" اسی جستجو کا ثمرہ ہے۔ ہر موضوع کو اپنانے کی خواہش جس قدر مبارک ہے اسی قدر ہر موضوع کو شعریت کے ساتھ برتنا دشوار بھی ہے۔ اس دشواری کو بیشتر شعرا آسان نہ کر سکے۔ اکثر خارجی اور بیانیہ شاعری کے جوش میں شعری گداز، دروں بینی اور صداقت کا دامن چھوڑ گئے۔ اگر موضوع کے سہارے شاعر آفاقی اور عام انسانی سچائیوں تک نہ پہنچ سکے تو یہ موضوع ادبی کے بجائے سطحی ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے جذبات بھی اسفل و اعلیٰ، سچے و جھوٹے، وقتی اور دیرپا ہوتے ہیں۔ بعض اوقات بلکہ بیشتر سامنے کے جذبات اور وقتی احساسات اصلی، سچے اور موثر معلوم ہوتے ہیں مگر عموماً واقعات کے اثرات اور خارجی عوامل سے حاصل کیے ہوئے خیالات جب جذبات بنتے ہیں تو وہ سطحی ہو جاتے ہیں۔ ان کے اصلی، کامل اور صادق کا عمل بڑی گہرائی میں اور دیر سے ہوتا ہے جہاں یہ تکمیل پا کر قابلِ اظہار بنتے ہیں۔

اس مجموعے میں ارشد مینا نگری کا حقیقی جذبہ بڑی گہرائی میں اتر کر اور دیرپا تخلیقی عمل سے گزر کر شعری پیکر میں ڈھلا ہے۔ کیوں کہ انھوں نے محض اظہارِ تشکر و عقیدت کے لیے "ماں" کو

موضوع شاعری بنایا ہے نہ شعری تجربے کے طور پر اس کو چھوا ہے بلکہ واقعہ یوں ہے کہ ''چکن گنیا'' نامی مرض کی جس وقت شناخت بھی نہیں ہو پائی تھی، اسی زمانے میں شاعر اس کا شکار ہو جاتا ہے۔ معقول علاج کے باوجود درد و کرب اور اضطراب میں افاقہ نہیں ہو پاتا ہے۔ بتدریج شدید نقاہت اور لاچاری کے سبب زندگی سے بے زاری کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ایسی ہی بے چین کیفیت کے درمیان شاعر کو اپنی ماں یاد آتی ہے جس نے بچپن میں یتیم ہوئے شاعر کو اس طرح کے حالات میں راحت بخشی اور زندگی کی بے شمار صعوبتوں کو جھیل کر اسے پروان چڑھایا۔ بس ماں کی یادوں کا سلسلہ بچپن سے شروع ہو کر اتنا دراز ہوتا ہے کہ ہفتوں بعد مرض سے افاقہ کے باوجود بھی وہ سلسلہ ٹوٹ نہیں پاتا۔ اس لیے وہ شاعر کا جذبہ بن کر تخلیقی عمل کے مرحلے میں داخل ہو جاتا ہے۔ اب مرض کے درد و کرب کی جگہ تخلیقی کرب و اضطراب لے لیتا ہے۔ وہ کرب و اضطراب کے کامل و صادق جذبے کی تکمیل کر کے جب اظہار کی شکل اختیار کرنے لگتا ہے تو نوع بہ نوع شکل اختیار کرتا چلا جاتا ہے۔ پھر تو جذبے کے وفور اور تخلیقی اپج کی فراوانی شاعر کو کسی ایک دو اصنافِ سخن پر قانع نہیں رہنے دیتی۔ ماں کی یادوں کا وہ سلسلہ جب ارشد مینا نگری کے جذبوں کی ترنگ بنتا ہے تو تیئیس اصنافِ سخن میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ اور یوں ہم نظم، ریختی نظم، غزل، غزل نما، دوہا غزل، گیت، ماجھی گیت، مرثیہ گیت، دوہا گیت، نوحہ گیت، لوری گیت، قطعہ، دوہا قطعہ، رباعی، ثلاثی، ماہیہ، دوہا، پنچ بجھی، پہیلی، کہہ مکرنی، ہائیکو اور سانیٹ مروجہ و غیر مروجہ اصنافِ سخن میں ماں کی گوناں گوں شبیہ اجاگر کرنے کی نادر کاوش سامنے آتی ہے جو میرے خیال میں اس مجموعے کو اردو شاعری میں طرۂ امتیاز بخشتی ہے۔

کسی ایک موضوع پر تخلیقی بنیاد اٹھانا کوئی نیا شعری رویہ نہیں ہے مگر کسی ایک موضوع کو اتنے وسیع تناظر میں دیکھنا اور اس طرح برتنا کہ تخلیق سے قوسِ قزح کے رنگ پھوٹ پڑیں، کوئی آسان کام نہیں ہے کیوں کہ اکثر ایک ہی موضوع پر شعر کہنے والے کے یہاں یکسانیت در آتی ہے لیکن ارشد کا کمال دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ لگتا ہے ان کا تخلیقی چشمہ ماں کے موضوع پر بے تحاشہ ابل پڑا ہے جو ندرتِ بیان سے معنیٰ و مفہوم کا جہان روشن کرتا چلا گیا ہے لہٰذا یہاں ماں کا کردار ذرّے سے کائنات بن کر نکھرتا، سنورتا دکھائی دیتا ہے اور ان کا کہا بجا معلوم ہوتا ہے کہ :

ترے ہر لفظ میں ارشدؔ ماں کے رنگوں کی معنویت ہے

آج اخلاقی وروحانی اقدار کی پامالی پر مادیت اور صارفیت کے فیضان سے اٹھتی اور سنورتی ترقی کو ترجیح نہیں بلکہ ایسی ترقی کو ہی انسان معراجِ زندگی سمجھنے لگا ہے اور ہر جذبہ وعمل مادی فائدے اور نقصان کی میزان پر تلنے لگا ہے۔ انسانی رشتوں اور محبتوں کا آفاقی تصور اور ماں کے احترام اور تقدس کی پاس داری کا ازلی جذبہ مفقود ہو کر اس ترقی کی بہار میں گم ہوتا جارہا ہے۔ ایسے میں :

پیار لٹا کر ہر پل ساری دنیا پر پیار نہ پائے ماں بے چاری دنیا میں

ممتا کا احساس تڑپ کر روتا ہے نفرت کیوں ہے اتنی، پیاری دنیا میں

کی صورتِ حال سب کے سامنے ہے۔ لہٰذا یہاں ارشد مینا نگری کا مشاہدہ جذبۂ صادق بن کر آیا ہے۔ ان جذبوں نے انھیں اتنا تڑپایا کہ بے ساختہ گریہ کناں ہو اٹھے :

صدیاں بیتیں داسی جیسی جیتی ہے ماں کی اب توقیر بڑھا دے یا اللہ

ماں کی ناقدری سے اب باز آجائیں سب کو یہ احساس دلا دے یا اللہ

ارشد نے مناجات ہی پر بس نہیں کیا ہے بلکہ آئینہ بھی دکھایا ہے۔ اوقات بتلائی ہے۔ ماں کی ناقدری کا انجام بتایا ہے اور تلقین بھی کی ہے۔ ایک جھلک دیکھیں :

زندگی کی نمود ہے ماں سے ہر کسی کا شہود ہے ماں سے

حشر کے روز حق ہمیں ارشدؔ ماں کے ہی نام سے پکارے گا

ماں کے دم سے تو ہیں دنیا کی سب رعنائیاں ماں کی ہر تکلیف کو راحت بنانا چاہیے

اس طرح ارشد کا یہ مجموعہ 'ماں' کے موضوع پر ایک مکمل صحیفہ بن گیا ہے؛ جس کے آگے آج کی مادی دنیا کے: سونا چاندی، ہیرا موتی، لعل و گہر کیا؟ واضح رہے کہ جذبات کی لہریں یوں ہی متشکل نہیں ہوتیں، نہ لفظوں کی فن کارانہ بنت سے شعری معجزہ کا ظہور ہوتا ہے بلکہ ''معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود۔''

اس مجموعے میں غالب حصہ غزلوں، نظموں اور گیتوں کا ہے۔ بقیہ اصنافِ شعری مقدار میں تو کم مگر معیار میں برتر ہیں۔ ہر ایک کے نمونے کے ساتھ اس چھوٹے سے مضمون میں مشکل ہے ورنہ بتاتا کہ شاعر نے کیسے کیسے گل کھلائے ہیں۔ لہٰذا ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے پیش لفظ

''ارشد مینانگری اور ماں کے روپ انیک'' کے اقتباس سے اپنی باتوں کی تکمیل کرتا ہوں :

''انکے خیالات کی خوش بولہر درلہر نازک اور پاکیزہ کیفیات میں پھیلتی ہے اور جذبات کے مدوجزر کو پیش کرتی ہے۔ ماں ان کے لیے صدائی صورت میں ہے، سبز اگتے لمحوں کے پیکر میں ہے اور سرگم کی شکل میں بھی ہے جہاں دل کی کسک اور خیال کی نازکی تہہ در تہہ صورت اختیار کرتی ہے۔ عقیدت اور محبت کا جذبہ جس طرح ارشد کے یہاں سامنے آتا ہے اس کی مثال دوسری جگہ نہیں ملتی۔ دراصل ان کے یہاں احساس کی گونج ہے۔ وہ انھیں دوسروں سے الگ کرتی ہے۔ ماں کا وجود شکل بدل بدل کر انکی شاعری کو رنگ وروپ عطا کرتا ہے۔ اس روپ میں شخصیت کی پوری تاریخ ہے۔''

ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''یہ مجموعہ ماں جیسی ہستی پر اس معانی میں بھی اولیت کا درجہ رکھتا ہے کہ اردو کی مروجہ اور غیر مروجہ بیشتر اصناف میں اشعار ہیں جن میں فلسفیانہ شگفتگی ہے اور اندازِ بیاں کی چابکدستی ہے۔ ساتھ ہی زندگی کے صحیح تناظر اور اس کی مختلف جہات کی تراش خراش ہے...... ماں کے مفہوم کا پیکر ان کے یہاں قدم بہ قدم داخلی آہنگ تک پھیلتا ہے اور پہچان کو نئی کائنات عطا کرتا ہے...... ارشد کے قبل ماں کی عرفانِ ذات کو اتنے وسیع کینوس پر کسی دوسرے شاعر نے نیا نقش نہیں دیا ہے اس لیے ان کی سوچ اور تخلیقی آگہی، تاریخی شعور اور امتیازی خصوصیت کی حامل ہے۔ میں اس مجموعے کو تجربات کا منبع کہوں گا، جس سے اردو کا دامن وسیع ضرور ہوا ہے۔''

''ماں'' پر ارشد میناںگری کے کلام کے اظہار میں تجربات کی جھلکیاں ہی نہیں بلکہ خوشگوار شعری اور ہیئتی تجربات ملتے ہیں۔ بیان واسالیب کی رعنائی اور غنائیت کی جولانی دیدنی ہے لہٰذا انکے فکر وفن میں جو سوز، جو سرور اور سرود ہے وہ یقیناً خونِ جگر کی تراوش کا نتیجہ ہے۔ یہ گراں قدر تخلیقی کاوش بہر طور پذیرائی کی مستحق ہے۔ افادی اعتبار سے یہ مجموعہ ہر ہاتھ، ہر گھر تک پہنچے تاکہ اس کا پیغام عام ہو اور لوگوں کی بصیرت کے دریچے وا ہو سکیں جس کی فی زمانہ شدید ضرورت ہے۔

❖❖❖

نواز دیوبندی کی غزلیہ شاعری میں عصری مسائل

ڈاکٹر نواز دیوبندی غزل کے شاعر ہیں۔ رومانیت، جذباتیت اور عورت ومحبت کے ساتھ عصری مسائل کے نرم ونازک اور بے حد اہم احساسات کا تحفہ اردو کو دیتے رہے ہیں۔ خودکلامی کی تکنیک کا حسین امتزاج ان کی غزلوں میں ملتا ہے، جو وقت کی علامت ہے، وقت کی کہانی ہے ساتھ ہی تہذیب کے عروج وزوال کا بیانیہ ہے، جسے فکری وفنی اعتبار بخشنے میں وہ کامیاب ہیں۔

غزل کے بارے میں کئی ناقدوں کی الگ الگ رائے ہے، لیکن بقول فراق گورکھپوری غزل Climax of Climaxes ہے۔ غزل کے لئے یہ خوبصورت جمالیاتی تعریف دوسروں سے مختلف ہے۔ غزل کی قدیم ترین تعریف سخن با زنان کردن اور سخن با معشوق گفتن تسلیم کی گئی تھی۔ پہلی تعریف اتنی بلیغ نہیں جتنی دوسری ہے، کیوں کہ معشوق کا تعین نہ کر کے غزل کی جہات کو بڑھا دیا گیا ہے۔ ولؔی سے میؔر تک یہ سلسلہ جاری رہا ہے :

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا
سو ٹھہرا ہے وہی اب فن ہمارا

لیکن غالب کے مزاج کے نوکیلے پن کو غزل کا ظرف تنگ معلوم ہوا کیوں کہ بقدرِ شوق نہ تھا اس لیے انھیں کچھ اور وسعتِ بیان کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اگر چہ غیب سے مضامین آتے تھے جو صریرِ خامہ نوائے سروش تھے۔ حالؔی خود غزل گو تھے لیکن مغرب کی چھائی ہوئی تہذیب کی چمک دمک بہرطور ان کی آنکھوں کو خیرگی دے گئی۔ تہذیبی جمالیات کی میراث ہیچ پوچ معلوم ہونے لگی اور انگریزی شاعری حاکم وقت کا ادب ہونے کی وجہ سے محل فضیلت میں آ گئی جب کہ غزل ناقص خیال آفرینی کی بے سروپائی کی آئینہ دار بن گئی۔ یہ روایت یہاں تک بڑھی کہ کلیم الدین احمد کے انتہا پسند نقائص بیں انتقاد نے غزل کو 'نیم وحشیانہ صنف شاعری' قرار دیا اور غالب کی "تنگنائے غزل"

کے سطحی مطالعہ رکھنے والوں کو اس تنگنائے سے آزاد کرانے کا شُقہ ہاتھ آیا۔ بیسویں صدی کے نصف اول سے اکیسویں صدی کی دوسری دہائی تک غزل کا معنی بدل گیا ہے۔ اب غزل میں ہر طرح کے خیالات پیش کیے جاتے ہیں۔

موجودہ صدی کے عالمی شہرت یافتہ شاعر اور ماہرِ تعلیم ڈاکٹر نواز دیوبندی کی شاعری میں روایت کا رنگ غالب ہے تاہم وہ جدیدیت کی نئی آن بان کو بھی قبول کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں اضطراب انگیز زمانے کے نشیب و فراز رنگ و خوشبو کے ساتھ ملتے ہیں۔ ان میں جمالیاتی احساس اور عصر حاضر کی گداختگی کی گہرائی کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ان کے پاس تجربے کی وسعت ہے، اسی لیے ان کے کلام میں نئے پن کی چمک نئی پرتوں کو دریافت کرتی ہیں۔ ان کے ہاں لاشعور کی تاریک گہرائیاں ضرور ہیں لیکن شکستہ پیکر منور پرچھائیاں رکھتا ہے۔ یہ تشکیلی کارفرمائی دیدۂ باطن کو وا کرنے پر ہی ممکن ہے جس کے اندر سے فضا آفرینی کی حقیقت اُگتی ہے اور برقی جلوؤں کی تنزیل سامنے آتی ہے۔ نواز دیوبندی (اصل نام محمد نواز خاں) کا وطن دیوبند ہے۔ ان کے دو شعری مجموعے ''پہلا آسمان'' اور ''پہلی بارش'' منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ ان کا نعتیہ مجموعہ ''السلام، السلام'' اور غزلوں کا مجموعہ ''تیرے آنے کی جب خبر مہکے'' (اردو اور دیوناگری خطوط میں) زیرِ اشاعت ہیں۔ انھوں نے ''سوانح علمائے دیوبند'' جیسی وقیع کتاب دو جلدوں میں ترتیب دی ہے جو پندرہ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ تقریباً پچیس اسکول اور کالجز ان کی نگرانی میں کارکرد ہیں۔ یوپی اردو اکاڈمی کے چیئرمین رہ چکے ہیں۔ اپنے دور میں آئی اے ایس کی کوچنگ کی ابتدا انھوں نے کی جس سے طلبا میں مسابقتی جذبہ بیدار ہوا۔ دنیا کے تقریباً انیس ممالک میں انھوں نے مشاعرے پڑھے ہیں۔ ان کی اصل شہرت مشاعرہ سے ہی ہے۔ عوام و خواص دونوں میں ان کی شاعری مقبول ہے۔ ان کی بعض غزلوں کو معروف غزل سنگر جگجیت سنگھ نے اپنی آواز دی ہے۔ ان کے اشعار پارلیمنٹ میں سیاست دانوں کی تقریروں میں بھی حوالے کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کریں :

مفلسی کا چراغ روشن تھا زندگی کٹ گئی اجالے میں

بڑی مشکل سے نکلے گی کوئی صورت تعلق کی — تمہیں رونا نہیں آتا ہمیں ہنسنا نہیں آتا

جب نئی کونپلوں کے سر ابھرے — زرد پتوں کی آبرو نہ رہی

گاؤں کی تہذیب کی اب پاسداری چھوڑ دی — شہر میں رہنے کی خاطر خاکساری چھوڑ دی

یہ آخر کس طرح کی بے حسی ہے — کہ ہم مقتل میں بھی سوئے ہوئے ہیں

اب بھی بہت غرور ہے اک ہاتھ پر اسے — اک ہاتھ حادثے میں گنوانے کے باوجود

رموزِ چشمِ گریاں سے جو شبنم کی ہوئے واقف — سحر ہونے سے پہلے وہ ستارے ڈوب جاتے ہیں

نواز دیوبندی کی شاعری میں روانی اور چاشنی نظر آتی ہے اور عصری عہد کی ترجمانی ملتی ہے۔ رواں اور چست درست اشعار ان کی شاعری کا جزوِ لاینفک ہیں۔ شعری رنگ و آہنگ کو حالات سے مربوط کر کے انھوں نے زندگی کے حقائق اور معاشرتی صورت حال کچھ اس طرح پیش کئے ہیں:

جب وہ جاگے تو سو گئے آنسو — کتنے خوددار ہوگئے آنسو

تذکرہ جب کہیں ہو رنگت کا — اس کو کالا گلاب لکھ دینا

کانٹوں کی اس بستی میں — پھولوں کا نذرانہ بھیج

میرے مولا مجھے عطا کر دے — اُس بلالی اذان کا صدقہ

یہ ہے اعجاز ان کی گفتگو کا — مخاطب ہوں تو پتھر بولتا ہے

اشارے سے کنایہ کاٹتا ہے — وہ چاقو سے لفافہ کاٹتا ہے

نواز دیوبندی کی فکری جہت فنی لحاظ سے رنگا رنگ ہے، جس میں چابک دستی ہے، غنائی لب و لہجہ میں حسیت کا اظہار ہے اور نئے موضوعات کے لئے نئے الفاظ اور نئے اسالیب کی جلوہ گری ہے۔ اس ضمن میں چند اشعار دیکھیں :

انجام اس کے ہاتھ ہے آغاز کر کے دیکھ — بھیگے ہوئے پروں سے ہی پرواز کر کے دیکھ

وہ حل کرتا ہے سب پرچے خوشی سے — اسے اردو کا پرچہ کاٹتا ہے

سیاست ہے عجب شطرنج اس میں — وزیروں کو پیادہ کاٹتا ہے

گنگناتا جارہا تھا اک فقیر — دھوپ رہتی ہے نہ سایہ دیر تک

بدنظر اٹھنے ہی والی تھی کسی کی جانب　　اپنی بیٹی کا خیال آیا تو دل کانپ گیا
بادشاہوں کا انتظار کریں　　اتنی فرصت کہاں فقیروں کو
تیرے آنے کی جب خبر مہکے　　تیری خوشبو سے سارا گھر مہکے
سچ بولنے کے طور طریقے نہیں رہے　　پتھر بہت ہیں شہر میں شیشے نہیں رہے

نواز دیوبندی کے شعری خصائص پر عظیم اختر کی رائے یوں ہے :

> ''......زندگی کو قریب سے دیکھنے اور بھوگنے کی وجہ سے ان کا مشاہدہ کافی گہرا ہے اور وہ عام آدمی کے جذبات واحساسات کو سیدھے سادے لفظوں کا جامہ پہنا کر خوبصورت شعر کے سانچے میں ڈھالنے کے گر سے بخوبی واقف ہیں۔اس گر کی وجہ سے وہ مشاعروں کے ایک کامیاب اور مقبول شاعر ہیں اور سامعین کے احساسات اور جذبات کو خوبصورت شعر کے سانچے میں ڈھلا ہوا دیکھ کر بے ساختہ داد دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔''

(''نواز دیوبندی: مشاعروں کا کامیاب شاعر اور تعلیم نسواں کا نقیب''
مطبوعہ روزنامہ ''اخبارِ مشرق'' کولکاتا ۲رستمبر ۲۰۱۸ء)

نواز دیوبندی نے اپنے شعری سرمائے میں حالاتِ حاضرہ پر گہری اور بصیرت افروز نظر سے کام لیا ہے۔ یہ شاعری نتیجہ خیزی اور معنیٰ خیزی کے پہلو پیدا کرتی ہے جس میں معاشرے کی سچائیاں کچھ اس طرح پیش کی گئی ہیں کہ دلیل کم نظری سے بلند و برتر ہو کر شعری کیفیات وسیع دائرے میں سامنے آتی ہیں۔ ان کی شاعری اور شخصیت عشق کے بانکپن سے بھی اپنے تحفظات سامنے لاتی ہیں۔

پیش خدمت ہے **کتب خانہ** گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے 👇
https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
0307-2128068 📱
@Stranger ❤️❤️❤️❤️❤️❤️❤️

عبرت بہرائچی: شاعرِ دُرِّ ناسفتہ

ڈاکٹر عبدالعزیز خاں اردو شاعری کے سدا بہار شاعر ہیں۔ ان میں مذاق شعری کا عنصر وراثتاً دادا ضامن علی خاں انیق بہرائچی جو میر انیس کے دور کے معروف شاعر تھے، سے منتقل ہوا تھا لہٰذا عبرت بہرائچی کی صورت میں عنفوان شباب ہی میں افق شاعری پر طلوع ہوئے۔ طرۂ کمال یہ ہے کہ بہتوں کی طرح اپنی تخلیقی کاوشوں کو کمال فن کے حصول کے بعد چھان پھٹک کر کلیات کی شکل میں پیش کرنے کی بجائے ابتدا سے ہی تسلسل کے ساتھ گلدستوں اور مجموعوں کی شکل میں پیش کرتے رہے۔ حمد، نعت، منقبت، قصیدہ، نظم، غزل، مسدس، مخمس، قطعہ، رباعی، ہائیکو وغیرہ بیشتر اصناف شعری پر مشق سخن کرتے ہوئے اٹھارہ شعری مجموعوں کی تخلیق کی۔ جن میں خوب سے خوب تر کی جستجو اور ادبی و فنی ارتقا کی جھلک واضح نظر آتی ہے۔ انہوں نے منظر عام سے کبھی کچھ مخفی نہیں رکھا۔ بقول عبرت:

تم نے جو کچھ کہا میں نے جو کچھ کہا
کر رہا ہوں وہی تو رقم آج تک

شاعری کے علاوہ ان کی جولانی طبع نے میدان نثر کو بھی پانی کیا ہے۔ نثری تصانیف میں ''فخر موجودات، عظیم تاریخ ساز، ہمارے معاصرین، آئین شاعری، نفوس رفتگاں، نامورانِ بہرائچ، اور 'کشت دیگراں'' قابل ذکر ہیں تو ادب اطفال میں اسلامی معلومات کے اضافے اور فروغ کے لیے ''نجوم رسالت'' دو حصوں میں ''روزہ کیا ہے؟''، آپ کیوں نہیں جانتے؟، آپ کیا جانتے ہیں؟ یہ بھی جاننا ضروری ہے، قرآن کریم کیا ہے؟ ''خضر منزل'' تین حصوں میں اور معلومات عامہ کے ضمن میں اردو کی بنیادی باتیں، خضر معلومات جیسی مفید تالیفات پیش کیں جو ہاتھوں ہاتھ لی گئیں۔

شعری مجموعوں میں 'وجہ لوح و قلم''، ''باعث کن فکاں''، ''صاحب اسریٰ''، ''عظیم کردار''،

''اخوت کا امین''، ''آبروئے ہر دو جہاں''، مجموعہ ہائے نعت''، ''آفتاب حریت مجموعۂ منقبت''، ''دگنگن اردو نظموں اور ہم ایک ہیں'' ہندی نظموں کا مجموعہ ''متاع زیست''، تحقیق و جستجو''، ''نشاط اردو''، ''موجِ فکر''، ''افکار و خیالات''، ''اوراقِ دل'' مجموعہ ہائے غزلیات اور ''درِ ناسفتہ'' وغیرہ غزلوں، اکیس رباعیوں، پچیس ہائیکو کا مجموعہ ہے۔ تقریباً پچپن برسوں کی جاں سوزی کے یہ ثمرات ہیں جو ہرگز نہ مٹنے دیں گے نام و نشانِ عبرت کے ضامن ہیں۔

ڈاکٹر عبرت کے رشحات قلم سے فطری معالج، دردمند دل اور تہذیب و تطہیر کی پابند زندگی کی جھلک نمایاں ہے۔ دنیائے شاعری میں کئی معالج و طبیب واقع ہوئے ہیں جن کی شاعری تفنن طبع کی خاطر معرض وجود میں آئی لیکن ڈاکٹر عبرت کے قلم پر ''شعر جب لکھنا کوئی، حاصل عبرت لکھنا'' کا جذبہ حاوی رہا۔ اس لئے ان کی شاعری میں ادبی لطافت اور جمالیاتی چاشنی کے ساتھ ساتھ تطہیر زندگی کے نکتے و نسخے بھی خوب ہیں، مشتے نمونہ از خروارے:

جن سے طاعت کی بات کرتے ہو　　ان کو احساس بندگی ہی نہیں

......

وہ ہے اپنے وجود کا دشمن　　سر میں جس کے غرور ہے بھائی

......

احساس بے زری کا جب سے اسے ہوا ہے　　انسان کوڑیوں میں ایمان بیچتا ہے

......

بے حیائی کہاں تلک پہنچی　　اہل مغرب سے یہ حیا پوچھے

......

گناہ کرنے سے پہلے عبرت　　کسے خیال اجل رہا ہے

......

خامشی خود کلام ہے بابا　　اس کا بھی اک مقام ہے بابا

معالج فسد کھولتا ہی نہیں مرہم بھی رکھتا ہے۔ ڈاکٹر عبرت درد آشنا ہیں اس لئے ان کی شاعری میں انسانی تہذیب و تمدن کا قیمتی سرمایہ بننے کے عناصر بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ بہت صحیح کہا ہے ڈاکٹر عالم سرحدی نے کہ: ''اظہار میں سچائی کا احساس جب روایت کی اہمیت کو شامل کر لے تو ذکر و فکر کی نئی عمارت دوسری عمارتوں میں اپنی حیثیت ممتاز بنا لیتی ہے۔''

عبرت کی شاعری میں طرۂ امتیاز کا یہ عنصر نمایاں ہے۔ یعنی ڈاکٹر عبرت متقدمین، متوسطین اور متاخرین ادب سے روشنی حاصل کرتے ہوئے جب آج کی شاعری کے نگارخانہ میں داخل ہوئے تو رنگا رنگ عکسوں کی بصیرت سے مرعوب نہیں ہوئے بلکہ اپنے فکری رویے کے بل پر کھڑا ہونے کا حوصلہ دکھایا۔ اس لئے ان کے کلام میں زندہ رہنے کی صلاحیت خوب ہے کیونکہ انہیں درک تھا کہ:

کسی میں ہوتی ہیں جب خوبیاں ہر اک سے الگ
اسی کی سارا زمانہ مثال دیتا ہے

ڈاکٹر عبرت اسلامی پس منظر رکھتے ہیں اس لئے ان کی شاعری کا معتد بہ حصہ اس کا عکاس ہے مگر ''بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر'' کے مصداق میدان غزل میں بھی ان کی افتادِ طبع نے خوب جلوے دکھائے ہیں۔ ملاحظہ ہوں چند نمونے:

اے عشق شاد باش کہ آج ان کو بار بار — مصروفِ احتیاط نظر دیکھتا ہوں میں

......

مزہ برسات کا چاہو تو ان آنکھوں میں آ بیٹھو — سفیدی ہے، سیاہی ہے، شفق ہے، ابرِ باراں ہے

اور جدت کا انداز دیکھئے:

وہاں سے آپ کو اغوا نہ کر سکے گا کوئی
حضور آپ تو میری نظر میں رہتے ہیں

ویسے آج کی غزلوں میں متقدمین کی سی چاشنی کی دین ہے جس میں یہ حال ہو گیا ہے کہ بقول عبرت:

نرغے میں نئی سوچ کے یہ آ گئی جب سے
گھٹتا ہی چلا جاتا ہے معیار غزل کا

نئی سوچ بدلتی تہذیب و معاشرت کی دین ہے جس میں ایسی صورت بھی ملتی ہے کہ بقولِ شاعر:

تری محفل میں آ کے یہ دیکھا — آدمی اپنا خود پتا پوچھے
ماسوا خیریت کے اے عبرت — دنیا والوں سے کوئی کیا پوچھے

ظاہر ہے شعر وفن عصری حسیت کا عکاس ہوتا ہے اور عصری تقاضے معیار و اقدار تک کو الٹ پلٹ دیا کرتے ہیں۔ تاہم روایت کا پاس اور ارفع اقدار کی اساس پر فن کا ڑھا جائے تو اس فن کی زندگی جاوداں ہو جاتی ہے اور ہر عہد میں وہ دل ونظر میں اتر جانے کی اہلیت رکھتا ہے۔ عبرتؔ کی غزلوں میں بھی ایسے جلوے بکھرے پڑے ہیں۔ ان کی ایک جھلک دیکھتے چلیں:

نشتریت ہی اس کی فطرت ہے ہاتھ کانٹوں کے پاس مت رکھو

......

قتل کرکے جو ہاتھ دھو آیا قتل کیسے ہوا وہی پوچھے

......

جو کام کر نہ پایا عزازیل عمر بھر عبرتؔ وہ کام آج کا انسان کر گیا

......

آشیاں کوئی بھی محفوظ نہیں اے عبرتؔ بجلیاں رقص کناں ہیں ابھی گلزار کے پاس

......

صحن گلشن میں آندھیوں کا نہیں دبدبہ برق کے سفیر کا ہے

......

ہے جس پہ برق کا پہرا تو آندھیاں نگراں چمن میں کیسا انوکھا یہ آشیانہ ہے

تہذیبی شکست وریخت کے پس پشت سفیران برق کی کارستانیاں ہی کارفرما ہیں۔ ذرا غور فرمائیں ان کے مضمرات پر کہ فضا سے دروں خانہ تک اور ظاہر سے باطن تک جو تماشائے رنگارنگ نظر آتا ہے اس میں سارا جہاں محو ہے، اس کے مضمرات سے بے پروا نتیجہ سامنے ہے۔ عبرتؔ نے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے کی اپنی شاعری کے ذریعہ جو کوشش کی ہے اس میں کامیاب نظر آتے ہیں کیوں کہ یہ:

ہم نفس کے نرغے میں بھی رہتے ہوئے عبرتؔ
زائل کبھی ایماں کی حرارت نہیں کرتے

آج کے دور میں یہ قابل ستائش جذبہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ جذبہ وخلوص ان کی شاعری کو ہمیشہ زندہ رکھے گا۔

❖❖❖

پیش خدمت ہے **کتب خانہ** گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے 👇
https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
0307-2128068 📱
@Stranger ❣️❣️❣️❣️❣️❣️❣️

احسان ثاقب: لفظوں کا کیمیا گر

احسان ثاقب (ولد: محمد یٰسین مرحوم) موضع مروئی، ضلع نوادہ، بہار میں ۱۸؍ اکتوبر ۱۹۴۲ء میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے درس وتدریس سے ۴۰ سال وابستہ رہنے کے بعد ہمدرد پرائمری اسکول اسلام پور، آسنسول سے ۱۸؍ اکتوبر ۲۰۰۲ء میں سبکدوش ہو کر ڈاک خانہ محلّہ گووند پور، ضلع نوادہ (بہار) میں بود و باش اختیار کر لی تھی۔ انھیں اصناف ِادب اور اصنافِ سخن دونوں پر قدرت حاصل ہے۔ موصوف ہفت روزہ 'محرم' اور ہفت روزہ 'ایشور اللہ' آسنسول کی ادارت سے وابستہ رہ چکے ہیں۔ ملک کے معروف رسائل وجرائد میں ان کی تخلیقات شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ''ریختی اور ذکر آسنسول'' (منظوم) زیرِ طبع ہے اور ایک کتابچہ ''عادل نامہ'' (منظوم) مطبوعہ ہے۔ ان دنوں شہر نوادہ (بہار) کی منظوم تاریخ لکھ رہے ہیں جو قسط وار ادبی جریدہ ''تمثیلِ نو'' دربھنگہ میں شائع ہو رہی ہے۔

ان کے اولین شعری مجموعہ ''لمبی چپ کا شور'' کی شروعات کے کچھ اوراق کھولے تو پہلے ہی مرحلہ میں احسان ثاقب کے شعری محاسن نے ہمیں اپنی طرف متوجہ کیا اور پورے مجموعۂ کلام کے حرف بحرف مطالعہ پر آمادہ کیا۔ فی زمانہ سامنے آنے والے شعری مجموعوں کے برعکس اس مجموعے میں شاعر نے اپنے جذبہ بکمال اور احساسِ جمال کے امتزاج سے اپنی تخلیقات کے ایسے گل بوٹے کھلائے ہیں جو قاری کو اپنی طرف پوری طرح راغب کرتے ہیں۔

احسان ثاقب قادر الکلام شاعر ہیں اس لئے ''لمبی چپ'' کے اندرون کا شور جس انداز اور سلیقے سے ہماری فکر ونظر کو مہمیز کرتا ہے وہ احسان ثاقب کی شناخت قائم کرتا نظر آتا ہے۔ یہ ان کے نصف صدی کی مشقِ سخن کا ثمرہ ہے جو طویل مدت تک فن کی بھٹی میں تپ کر معرضِ وجود میں آیا ہے۔ وہ چالیس سال دورانِ ملازمت آسنسول (مغربی بنگال) کی فضا میں اپنے فکر وفن کو سینچتے رہے۔ اکیسویں صدی کا سورج طلوع ہوتے ہی ملازمت سے سبکدوشی حاصل ہوگئی۔ اپنے وطن

گوبند پور ضلع نوادہ (بہار) آکر فراغت میسر ہوئی تو سخن سنجی میں استغراق بڑھا لیکن وہ اپنی شاعری کو تفننِ طبع ہی کا ثمرہ گردانتے رہے کہ ایک شعری گلدستہ "اکیسویں صدی کی غزلیں" مرتبہ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی میں ان کی مطبوعہ غزل نے ان کی سوچ کو مہمیز کیا۔ ایک ممتاز تنقید نگار اور معتبر فنکار کی نظر انتخاب نے ان کے اندر اپنے فن کے تئیں ایک نئی خود اعتمادی اور فکری جولانی پیدا کردی ہے۔ نتیجتاً ان کے اندر کا اصل فنکار جاگ اٹھا اور پھر انھوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اور اس طرح انھوں نے اپنے طویل تجربات و مشاہدات کو بڑے سلیقے سے شعری پیکروں میں ڈھال کر اسے "لمبی چپ کا شور" سے معنون کردیا ہے۔ انھوں نے تجرباتی شاعری بھی کی ہے۔ ان کی شاعری میں تخیل کے نئے پیکر دھنک احساس لفظوں میں پنہاں ہیں نیز گہری معنویت کے ساتھ جدت اور انفرادیت کو بھی انھوں نے پیشِ نظر رکھا ہے۔ ایمائیت اور اشاریت سے بھی کام لیا ہے اور جزئیات نگاری پر خصوصی توجہ دی ہے، اس لئے ان کی شاعری میں تازہ کاری کا احساس ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ آج کی جو شاعری ہے وہ اپنے ماقبل دور سے مختلف ہے۔ ظاہر ہے تمدنی و تہذیبی اقدار کے تغیر و تبدل، سیاسی و سماجی نظام کی تبدیلی اور سائنسی ترقی کے مضمرات سے انسانی افکار و اعمال کا متاثر ہونا لازمی ہے۔ شعر و ادب اپنے دور کا ترجمان و عکاس ہوتا ہے۔ شاعر و فنکار اپنی تخلیقات کو اپنے تجربات و مشاہدات اور جذبات و احساسات کے اظہار کا وسیلہ بناتا ہے۔ لہٰذا آج کی شاعری میں نئی دنیا کے مطالبات، نئی سائنسی نتائج، سماج کے بدلتے رجحانات، فکری ساخت، اقتصادی دباؤ، حیاتیاتی اثرات، تہذیبی اقدار کی شکست و ریخت، فطرت انسانی کی آفاقی اور ناقابل تردید صداقتوں سے گریز کے پہلو، آدرشوں کے فقدان، ثقافتی انتشار، تاریخی جبریت اور فکری فشار اور ان سب عوامل سے پیدا منطقی نتائج کا ہی غلبہ نظر آتا ہے لیکن جب ان منطقی نتائج کو شاعر و فنکار جمالیاتی حظ اور فنکارانہ ہنرمندی کے ساتھ بروئے کار لاکر بہ اندازِ دیگر اظہار کرتا ہے تو وہ شعر و فن کے سانچے میں ڈھل کر قلب و نظر کو متاثر کرتے ہیں اور قاری کو اس کی قدر شناسی پر مجبور کرتے ہیں۔ اس مجموعہ کو دیکھ کر کچھ ایسی ہی کیفیتوں کی سرشاری ابھرتی ہے۔ آج کے دور میں تجربوں کا عمل تمام تر شعبۂ حیات و کاروبار پر محیط ہے۔ خود احسان ثاقبؔ اس کے مؤید ہیں:

قصۂ ماضی نہ ہرگز بھول کر دہرایئے　　تجربوں میں ڈھونڈیئے پروازِ نو کی اک لکیر

ایک بے محابا تجربے کے جو مضمرات سامنے آرہے ہیں اس نے منفی اور مخرب اثرات کو زیادہ ہوا دی ہے۔ ان اثرات کے مختلف پہلوؤں کو ثاقبؔ نے مختلف شعری پیمانوں میں اجاگر کیا ہے۔ اسی طرح شعر و ادب کا جو حال ہے وہ ان ہی کے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیں:

جب سے ہوئے ہیں دوستو! آدابِ فن تمام　　یہ شاعری تو روز بدلتی ہے اپنے روپ

شاعر اس نئے رجحان کی شدت سے نفی کرتے ہیں اور تجدید کے متمنی نظر آتے ہیں، کہتے ہیں:

نہ وہ آزاد رہتے ہیں نہ زیرِ دام آتے ہیں　　نئے رجحان کے پنچھی خلوصِ فن سے ہیں آگے

یہاں انہوں نے اپنے مخلصانہ و فنکارانہ تجربے کی جو نظیر پیش کی ہے وہ قابل توجہ ہے۔ اس مجموعہ میں گرچہ غزل کا حصہ غالب ہے لیکن غزلیہ حصہ سے قبل تجرباتی اصناف شعری کو بالقصد پیش کیا گیا ہے، جن میں سورٹھا غزل، سورٹھا غزل مثلث، ہندی ادب کا پرتو، سمیا پورتی، کرجان دوہا غزل، کرجان غزالہ، غزل مثلث، ہمشیرہ غزل، دوہا غزل، غزالہ، آزاد غزل، غزل نما، کرجان ہائیکو، کرجان ماہیے، ترائیلے، دوہا گیت، لعلّن اور چہارن، کہہ مکرنیاں، تلخیاں اور مکرولی کے نمونے شامل ہیں جو ان کے خلوصِ فن اور وفور جذبہ کے غماز ہے۔ ان میں شاعر کے اخلاص تجربہ، فنی رچاؤ، الفاظ کی کیمیا گری اور ہندی سبھاؤ کا حسن کارفرما نظر آتا ہے۔ شاعر کے شاعرانہ عمل میں داخلی قوتوں پر مرکوز جزئیات و تفصیلات کی پیشکش میں کچھ نہ کچھ نیا پن ملتا ہے۔ David Daiches نے لکھا ہے کہ:

"زبان ایک فنی واسطے کے طور پر دو پہلو رکھتی ہے۔ ایک ہیئتی اور دوسرا استحضاری۔ جس طرح مصوری میں رنگ اور شکل، تجربے کی دنیا کے کسی واقعے یا کسی حالت کا پرتو پیش کرتے ہیں اسی طرح شاعری بھی کرتی ہے لیکن محاکاتی عمل کے علاوہ وہ اپنی تخلیق کی ہوئی ایک نئی ہیئت بھی پیش کرتی ہے جو تجربے کو ایک نیا روپ بخش دیتی ہے۔"

ایسی ہی کوششیں احسان ثاقبؔ کے یہاں ملتی ہیں جو دنیائے شاعری میں انکی شناخت کا ضامن ہے۔ اسی طرح غزلوں کے اکثر اشعار تخیل کے نئے پیکر سمیٹے، دھنک احساس لفظوں میں پنہاں نظر آتے ہیں:

نئے فیشن کی دیکھیں بے نیازی　　بھرے بازار میں تن بولتا ہے

الفاظ کی کیمیا گری کی دوسری مثال دیکھیں۔ ایک لفظ ہے 'سلسلہ' جسے مروجہ غزل کے مزاج کے مطابق انہوں نے نئی معنویت دی ہے:

اس قدر مربوط تھا قلب ونظر کا سلسلہ　　ہونٹ دریا پر رہا اور تشنگی باقی رہی

اس لفظ کا رخ انہوں نے کیسے بدلا ہے وہ بھی دیکھیں:

ابھر آئے گا سطحِ آب پر ہر ایک منظر　　پسِ حکمت زمیں پر آئینہ پھینکا گیا ہے

اب دیکھئے کہ ہجرت کے منطقی نتیجہ کو مناسب الفاظ میں انہوں نے کس خوبصورتی سے پیش کیا ہے:

آیئے،ہم لوٹ جائیں اپنے محور کی طرف　　کام دے گی کب تلک مانگی ادھاری زندگی

''لمبی چپ کا شور میں'' ایسی متعدد مثالیں ملتی ہیں جو احسان ثاقب کو اپنے ہم عصروں میں منفرد و معتبر کرتی ہیں۔ یہاں شاعر کے فکروفن کا تجزیہ و محاکمہ مقصود نہیں ہے بلکہ تاثرات رقم کرنا ہے،اس لئے اہلِ ذوق وفن کو مائلِ مطالعہ کرنے کے لئے اس مجموعہ کلام کی غزلوں کے چند اشعار نموتاً پیش ہیں :

ایک دن لوگ سمجھ جائیں گے فطرت کا مزاج　　جُل کی پُرجوش ترنگ، دیکھنا تھَل تک ہوگی

......

وہاں محفوظ ہے غیرت کی چادر　　جہاں ہر موڑ پر نر جاگتا ہے

......

ایک رہزن کا راہبر ہونا　　کتنا آساں ہے معتبر ہونا

......

اب اس سے بڑھ کے محبت کی بات کیا ہوگی　　گناہ آپ کریں ، وہ ثواب لکھتا ہے

مجھے خوشی ہے کہ اپنے اس پہلے مجموعے سے احسان ثاقب ایک کہنہ مشق شاعر کی حیثیت سے ادبی منظرنامہ پر آئے ہیں اور ناقدینِ ادب ان کی طرف متوجہ ہو چکے ہیں۔ نئی اصنافِ سخن میں ان کے تجربے نیا ذائقہ رکھتے ہیں جس کے سبب اردو ادب کی دنیا میں ان کی پذیرائی ہورہی ہے۔

❖❖❖

پیش خدمت ہے کتب خانہ گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے
https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
0307-2128068
@Stranger

سجاد شاکری کا "رقصِ الہام"

سیّد سجاد شاکری استاد شاعر ہیں۔ شاکر کلکتوی کے شاگردِ خاص رہ چکے ہیں۔ تمام مروجہ اصناف پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ غزل ان کی پسندیدہ صنفِ سخن ہے مگر قصیدہ بھی خوب لکھتے ہیں جن میں تصوف کا رنگ گہرا نظر آتا ہے۔ ان کی غزلوں کا دوسرا دیوان "رقصِ الہام" ۱۷۶ر صفحات پر مشتمل ہے، جس میں ۱۲۹؍غزلوں کے علاوہ سجاد شاکری کے فن پر جناب قیصر شمیم، اکبر حسین اکبر، ضمیر یوسف، فراغ روہوی، نسیم فائق، آچاریہ جمال احمد جمال، ارشاد آرزو، نیرا عظمی، کوثر پروین کوثر، فہیم انور، سراج الدین نیر اور مشتاق ہاشمی کی تہنیتی نظمیں/ قطعات/ رباعیات بھی شامل ہیں۔ موصوف کو ۲۰۱۷ء میں مغربی بنگال اردو اکاڈمی کا پہلا شاکر کلکتوی ایوارڈ بھی دیا گیا ہے۔ شاکر کلکتوی کی جانشینی کے سلسلے میں ان کا یہ شعر ملاحظہ کریں جس میں تعلّی کی جھلک بھی موجود ہے :

سجّاد حمد ، نعت ، قصیدہ ، غزل لکھوں
شاکر کی جانشینی کا حقدار میں ہوں صرف

"رقصِ الہام" میں کسی واقعہ کا سطحی اظہار نہیں ہے بلکہ اس کی گہرائی میں ڈوب کر وہ اس کی تہہ میں کام کرنے والے سماجی اور نفسیاتی عوامل اور محرکات کو بروئے کار لاتے ہیں اور فنی وسائل کا استعمال پوری ایمان داری کے ساتھ کرتے ہیں۔ اس میں نفسیات کا مطالعہ بھی ہے، واقعات کی کیفیت بھی ہے۔ سجاد شاکری آج کے تیزی سے بدلتے ہوئے رجحان میں خوش فکری اور خودنوائی کو پسند کرتے ہوئے جمالیات کے تصور میں درد اور رومان کی کیفیتوں کو اپنی غزلوں میں پیش کرتے ہیں جس میں زبان اور شاعرانہ آہنگ کی ہم آہنگی دیکھی جا سکتی ہے۔ وہ تغیر پذیر معاشرے میں متحرک رہنا پسند کرتے ہیں جس کی تصویر کشی ان کے درج ذیل اشعار سے ہوتی ہے :

دیکھا ہے میں نے رات یہ منظر عجیب سا — میرے لیے ہے چاند پہ بستر عجیب سا

ارتقا ہی ارتقا قسمت میں ہے   ہو گئی تو ہو گئی دنیا حریص

....

آؤ خدا کی شان میں کچھ گفتگو کریں   کیا جنگِ نفس کیلئے تیار میں ہوں صرف

....

میری تقدیر پہ شاخوں کو ہنسی آتی ہے   کوئی پتھر نہیں پہنچا ہے ثمر کے نزدیک

سجاد شاکری کی غزلوں میں روایت کا احترام، تہذیب کی پاسداری اور فنِ شاعری کی نغمگی ملتی ہے۔ زندگی اور فن کے اتصال سے سچ کی تعبیر موجود ہے جو تخلیقی توانائی سے مزین ہے۔ وہ غزلوں میں رنگ برنگے پھولوں سے بھی کیف وسرور کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں دلکشی بھی ہے نیز سلاست کے ساتھ ساتھ سادگی اور رعنائی بھی ہے۔ انھوں نے اپنے جذبات و خیالات بڑے سادہ انداز میں پیش کیے ہیں۔ ان کی اس آئینہ داری میں شمعِ محبت واخوت کے ساتھ چراغوں کا اجالا نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

معروف ادیب ڈاکٹر سنجر ہلال بھارتی اس دیوان کے مقدمہ میں لکھتے ہیں :

''ان کے کلام میں بہ یک وقت کئی چیزیں ایک ساتھ جمع ہوگئی ہیں۔ وہ تصوف کی وادیوں سے گزرتے ہیں تو عجز وانکسار کے ساتھ چلتے ہیں۔ کہیں فکر وفلسفہ کی گہرائی ملتی ہے تو کہیں تغزل کی کارفرمائی، کہیں وارفتگی وسرمستی ملتی ہے تو کہیں آلائشِ روزگار سے نبرد آزمائی، کہیں تکرارِ لفظی کا غیر مختتم سلسلہ ہے تو کہیں دیگر صنعتوں کے رچاؤ کا مرحلہ۔ سہلِ ممتنع نے ان کے فکری کینوس کو مزید وسیع کیا ہے اور کیوں نہ ہو کہ حضرتِ سجاد شاکری شاعری کو قوتِ پرواز سے تعبیر کرتے ہیں اور اسے بزرگوں کی دعا کا ثمرہ مانتے ہیں۔......''   (ص:۲۰)

مذکورہ بالا رائے کی روشنی میں چند اشعار دیکھیں :

چاند زمیں پر آجائے گا میرا عقیدہ ہے سجاد   اگلے برس کے بارے میں تو کہتی ہے تقویم الگ

....

ان پرندوں میں کچھ سیاست ہے   خود کو جو صیدِ دام کرتے ہیں

وہ آ کے لیتے ہیں میری جبین کے بوسے ہر ایک شب مجھے کرتا ہے خواب شرمندہ

......

دوستوں کے ہاتھ سے اکثر ہوا ہے چور چور میرے دل کا آئینہ ، میری وفا کا آئینہ

سجاد شاکری کے اشعار کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسانی اقدار کی زندہ اور تابندہ عکاسی وہ کرتے ہیں جس کی معنویت اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ فنی چابک دستی ان کے ہاں انتہائی پختگی کے ساتھ ملتی ہے جس کی خوشبو سرور بخشتی ہے۔ ان کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے راقم الحروف (ڈاکٹر امام اعظم) کی زیرِ اشاعت کتاب ''یہی کولکا تا ہے!'' (مختصر منظوم تاریخ) میں نثری نظم کا ایک حصہ شامل ہے جو اُن کی شاعرانہ عظمت کی دلیل ہے :

سلسلۂ مجددیہ کے سجادہ نشیں/ اور تصوّف کے حامل/ سجاد شاکری/ اس لئے بھی ایک اہم نام ہے کہ/ ان کی مدح وستائش کی زبان/ مطالعۂ فکر کی دعوت دیتی ہے/ مدحت سازی اور بصیرت نوازی کی بنیاد پر/ تخلیقی اور مجاہدانہ کوششیں تحسین آفریں ہیں/ نعت، حمد، صوفیانہ قصائد زبان کی طہارت کے ساتھ/ لسانی، تمدنی اور معلوماتی نصب العین کے پیشِ نظر/ وحدت الوجودی اور/ وحدت الشہودی کے گوشے بھی کھلتے ہیں/ شاعر ہونے کی ایک سند غزل نویسی بھی ہے/ شاکر کلکتوی کے عزیز شاگرد سجاد شاکری نے/ قابل لحاظ تعداد میں غزلیں بھی لکھی ہیں/ اس صنف میں بھی ان کی مشاطگی بھی ظاہر ہے/ غزل ایک ہمہ جہت صنف ہے/ ہر شاعر کی ہوتی ہے یہ پسندیدہ/ جن میں نکلتے ہیں کہنے لکھنے کے بہت سے راستے/ سجاد شاکری کی بھی فکر انگیزی بکھری ہوئی ہر طرف/ منفرد لب و لہجے کے اس شاعر کے ذہن کا/ دروازہ کھلا ہوا ہے ابھی/ جس سے ابھی کئی رنگ اور پھوٹیں گے/ قلم رواں ہو تو ہمیشہ نیا رنگ دکھاتا ہے/ ہاں وہی جو پہلے کلکتہ تھا/ اب کولکاتا ہے!

❖❖❖

پیش خدمت ہے کتب خانہ گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے 👇
https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
📱0307-2128068
@Stranger ❤️❤️❤️❤️❤️❤️❤️

قمر رئیس بہرائچی کی غزل گوئی

غزل سے مشق سخن کا آغاز کرنا، اردو شعراء کی روایت رہی ہے۔ کیونکہ غزل کی اساس کا رومانی تصور، طبیعت کی موزونیت اور جمالیاتی حس کو مشق سخن پر آمادہ کرتا ہے۔ دوسرے شاعری کی دیگر اصناف کے مقابلے ایک خیال کو غزل کے ایک شعر یعنی محض دو مصرعوں میں موزوں کر دینا آسان ہوتا ہے۔ شاعری، آئی ٹی آئی کر کے کاریگری، بی ٹیک کر کے انجینئرنگ، ایم بی بی ایس کر کے ڈاکٹری کرنے جیسا ہنر و فن نہیں ہے کہ علم عروض و بلاغت کی سند حاصل کر کے ہی کوئی شاعری کر سکتا ہے بلکہ یہاں تو معاملہ یہ ہے کہ جس نے زبان و بیان کی شُد بُد اور طبیعت موزوں پائی مشق سخن شروع کر دیا۔ اس لئے صنف غزل پہلا تختۂ مشق بنا کرتی ہے لیکن جس نے کوچۂ محبوب سمجھ کر اس راہ میں قدم ڈالا وہ زیادہ دور تک نہیں چل پاتا کہ شاعری محض تفنن طبع اور دل لگی کا وسیلہ نہیں ہوتی۔ یہ ایسا فن ہے جو دراکی، تخلیقی اپج، تجربات و مشاہدات کی گہرائی و گیرائی، اظہار ذات کی تڑپ اور مستقل ریاضت کا متقاضی ہوتا ہے جو ان تقاضوں پر اترتا ہے اس کے لئے یہ کوچۂ شاعری ثابت ہوتی ہے۔ قمر رئیس کا یہ غزلیہ مجموعہ کوچۂ شاعری میں حوصلہ مندانہ قدم فرسائی کا غماز ہے۔

قمر رئیس بہرائچی کی غزلیں فنکارانہ اظہار کے موزوں نقوش ہیں مگر یہ شاعر کی تخلیقی اپج اور اظہارِ ذات کی تڑپ کا پتہ ضرور دیتی ہیں۔ مثلاً یہ اشعار دیکھیں:

دہلیز زندگی پہ جو دستک کسی نے دی ۔۔۔ محفوظ تھا جو سر میں وہ سودا نکل گیا

......

کوئی ضرور مرے دل میں رہتا ہے پیہم ۔۔۔ ہر ایک سانس میں تیزی ہے تیغِ قاتل سی

......

کرتی ہے ساری دنیا تری چاندنی سے عشق ۔۔۔ کیا بات ہے قمر تو کسی کا نہیں ہوا

دروں بینی غزل کا وصف خاص ہے۔ شاعر کے تجربات و مشاہدات میں جتنی گہرائی و گیرائی

ہوتی ہے یہ وصف شعر میں اتنا ہی کھلتا ہے۔قمر رئیس بہرائچی کے یہاں بھی اس کی جھلک مل جاتی ہے۔مثلاً:

مصاحبوں میں حریفوں کے جو بھی رہتا ہے ۔۔۔ وہ اپنے آپ کو خود زیرِ دام کرتا ہے

....

ملے جو وقت تو آئینہ دیکھئے کچھ دیر ۔۔۔ جناب آپ کا فتویٰ بدل بھی سکتا ہے

....

کسی کے ہاتھ میں سکّے کبھی نہیں رکتے ۔۔۔ مثالِ سانس یہ دن رات چلتے رہتے ہیں

....

سامانِ زندگی کی ہے کیوں کر ہوس تمہیں ۔۔۔ انساں تو خالی ہاتھ ہی دنیا سے جاتا ہے

زمانے کے ساتھ قدریں بھی بدلتی رہتی ہیں۔تاہم ہمیشہ تہذیبی ارتقاع کا مدار مثبت قدروں پر رہا ہے لیکن آج جن قدروں کا سکّہ چل نکلا ہے قمر رئیس بہرائچی اس سے دل گرفتہ ہیں۔کہتے ہیں:

جب قدر زمانے میں لگی جھوٹ کی ہونے ۔۔۔ سچ بولنے کی لوگ جسارت نہیں کرتے

....

پہلے تو احتجاج کے قائل تھے سب مگر ۔۔۔ جب وقت آیا دل سے یہ جذبہ نکل گیا

....

ہر شخص آج ورطۂ حیرت میں ہے قمر ۔۔۔ سکّے تھے کھوٹ، پھر بھی وہ کس طرح چل گئے

نفسا نفسی، مفاد پرستی، جبریت و مادیت پرستی غلبہ پاکر ہر نقشِ وفا کو مٹاتی جارہی ہے۔ان لوازمات خبیثہ پر ترقی کے منازل طے ہوتے ہیں اور ارفع تہذیبی قدریں پامال کی جارہی ہیں۔ یہ رجحان عام ہوتا جارہا ہے اور تہذیبی اقدار کے پاسدار ہاتھ مل رہے ہیں کہ بے بس ہیں بقول قمر بہرائچی:

عہد حاضر میں کوئی گلشن تو کیا ۔۔۔ آپ اپنا گھر بچاکر دیکھئے

....

ہاتھ ملتے ہوئے دنیا سے چلا جاؤں گا ۔۔۔ شاخ سے ٹوٹ کے جینا نہیں آیا مجھ کو

....

منزل پکارتی رہی مجھ کو قمر رئیس ۔۔۔ باہر میں اپنے آپ سے آنے میں رہ گیا

لیکن اس نوع کے اشعار عصری تقاضے اور رویے سے شاعر کی دل گرفتگی کی غمازی کرتے

ہیں۔قنوطیت کی نہیں کہ ان کے یہاں ان نقوش وفا کا تصور جاگزیں ہے جن کی بابت خالق کائنات نے علامہ اقبالؔ کی زبان سے کہلوایا تھا:

کی محمدؐ سے وفا تونے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

لہٰذا قمر رئیس بہرائچی کا ایقان کہ:

ہمارے واسطے کافی ہے ان کا نقشِ وفا
زمانے بھر کی قیادت سے ہم کو کیا لینا

قابلِ قدر اور حوصلہ بخش ہے، اور یہ احساس کہ:

سر آج اپنے تن پہ نہیں ہے تو کیا ہوا
برسوں تمہارے قد کے برابر رہے ہیں ہم

ماضی سے مستقبل سنوارنے کے عمل کو تحریک دیتے ہیں۔

متذکرہ بالا اشعار قمر رئیس بہرائچی کی غزلوں میں کوندتے رنگارنگ جلووں کی مثل ہیں جو ان کی غزل گوئی کے امکانات کا تعین کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ غزلیں شاعری کی منزلِ اولیں طے کرتی نظر آتی ہیں۔ دراکی اور تخلیقی اُپج کی فراوانی تو ودیعت الٰہی ہوتی ہے لیکن ریاضت سے لگاؤ، خوب سے خوب تر کی جستجو اور فن کا ڑھنے کے ہنر کی تڑپ اپنے بس میں ضرور ہوتی ہے جو شاعرانہ کمال کی منزلیں طے کراتی ہے۔ براہ راست خیالات و جذبات کو موزوں کرنے اور چبائے ہوئے لقمے پروسنے سے غزل میں تاثیریت نہیں آتی۔ وہ شعر ہی کیا جو دل میں نہ اترے؟ وہ تجربہ کیا جو ہر کسی کو آپ بیتی نہ لگے؟ وہ فن کیا جس سے حیرت ناک جلوے نہ جھلکیں؟ لہٰذا میں آخری بات کہنے کے لئے خود قمر رئیس بہرائچی کے قول سے ہی رجوع کرتا ہوں:

دلوں کو جیتنا آساں نہیں قمرؔ صاحب
کوئی کمال، ہنر میں رہے تو اچھا ہے

❖❖❖

پیش خدمت ہے کتب خانہ گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے 👇
https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
📱0307-2128068
@Stranger ❤️❤️❤️❤️❤️❤️❤️

بدرمحمدی کی شاعری میں رمزیت

بدرمحمدی (اصل نام: ڈاکٹر بدرالزماں) معروف شاعروادیب ہیں۔ان کی شاعری میں روایت کی خوشبواور عصری وسماجی شعور کی دلکشی ملتی ہے۔انھوں نے علم وعرفان اوراخلاقی مضامین کوبھی تازہ کاری کے ساتھ برتا ہے اسی لئے ان کی شاعری میں اظہار کے موتی نظر آتے ہیں۔ گہرے مشاہدے کی مصوری بھی وہ خوب کرتے ہیں۔ پہلے مجموعۂ غزل ''بنتِ فنون کا رشتہ'' (۲۰۱۱ء) کے بعدان کی غزلوں کا دوسرا مجموعہ''خوشبو کے حوالے'' (۲۰۱۷ء) ۱۱۱غزلوں پر مشتمل ہے۔جس میں ایک حمد باری تعالی اورایک نعت پاک بھی تبرکاً شامل ہیں۔ان کے علاوہ ''امعانِ نظر'' کے نام سے ۲۴منتخب تبصروں کاایک مجموعہ ۲۰۱۵ء میں شائع ہو چکا ہے۔

غزل کہنی جہاں آسان ہے وہیں مشکل بھی ہے۔آسانی تواس کی ہیئت عطا کرتی ہے اور مشکل خیالات ومضامین کودروں بینی وتغزل عطا کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔لگتا ہے شاعر کی طبع موزوں اورریاضت فوقیت رکھتی ہے۔اس لئے کہ ان کے یہاں غزل کا برتاؤ مناسب طریقے سے ہوتا ہے۔شاعر جو کچھ دیکھتا ہے،محسوس کرتا ہے اُسے شعری پیکر میں ڈھالنے کا ہنر رکھتا ہے کہ عصری حسیت کے جلوے جابجا نظر آتے ہیں۔اس میں حسن کے غمزے،وارداتِ قلبی اورخودی کا اظہار بھی ہے۔اشعار میں ایہام کم سلاست وروانی زیادہ ہے۔مجموعہ ''خوشبو کے حوالے'' شاعر کے صاف ستھرے تخلیقی جوہر کا پتہ دیتا ہے۔اس مجموعے میں نفسیاتی،شعری اورلسانی عمل کی علامتوں کوفطرت اورمظاہرقدرت کے ساتھ خارجی دنیا سے اخذ کرکے جس طرح سورج اور جگنو کی روشنی پھیلائی گئی ہے اس سے سوچ کوایک نئی راہ ملتی ہے۔

زیرِنظر کتاب میں کلامِ شاعر کے علاوہ اکابرِادب کی گراں قدر آراءاورمضامین شامل ہیں جو بدرمحمدی کی شاعری کواعتبار بخشتی ہیں۔ چنداہم اقتباسات ذیل میں درج ہیں ۔ پروفیسر مظفر

حنفی کتاب اور صاحبِ کتاب کا تعارف کچھ اس طرح کراتے ہیں :

''اہلِ زبان کہلانے کے زعم میں مبتلا لکھنے والوں کو شعری مجموعہ ''خوشبو کے حوالے'' کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے جس میں بہار کی ایک غیر معروف بستی چاند پور، فتح پور کے بدر محمدی کی ایک سو گیارہ غزلیں شامل ہیں۔ یہ غزلیں اپنی تازگی، ندرت، طرزِ ادا، طرفگیِ خیال اور علوئے فکر کے اعتبار سے کسی بھی اہلِ زبان غزل گو کی تخلیقات کے مقابل رکھی جاسکتی ہیں۔ اس شعری مجموعے کا ہر شعر اپنی شناخت و مزاج کے لحاظ سے اعلان کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے کہ اس کے شاعر نے اس کی تخلیق میں پسینہ بھی بہایا ہے اور خون بھی کھپایا ہے۔''

(فلیپ پر رائے کتاب ''خوشبو کے حوالے'')

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی موصوف کی شاعری کے متعلق رقم طراز ہیں :

''بدر محمدی کے یہاں Symbolic Transference کا اظہار واضح اور شدید ہے اور داخلی ربط پوری طرح رچا بسا ہوا ہے۔ عام طور پر اندرونی مطالعے سے اقدار کا رشتہ حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اس طرح کی غزلیں اپنے معاصر سماج کے بارے میں کیا کہتی ہیں اور اپنی ذاتی شخصیت کے لئے وہ سماج کن باتوں کا معتقد ہے۔ اسی طرح سے Quality of life جیسے فقرے سامنے آتے ہیں۔ یہ مشکوک اس لئے ہیں کیوں کہ لوگ اکثر سوچتے ہیں کہ آدمی کے پاس مختلف رجحانات کا تجزیہ کرنے کے لئے ایک کسوٹی ہے۔ بدر محمدی نے ذاتی تجربے سے یہ دریافت کرنے کی کوشش کی ہے کہ زندگی کا مزاج، احساس یا Fabric غزلوں میں یا شاعری میں کس طرح گتھا ہوا ہے۔ انھوں نے مخصوص سادگی اور سیدھی سادی ترکیبوں میں پھول اور پتھر کے سمندر موجزن کئے ہیں۔''

(مضمون ''بدر محمدی کی غزلوں میں اظہار کی نئی صورت'' ص:۲۴-۲۵)

بزرگ شاعروادیب قیصر شمیم کی رائے کتاب کی پشت پراس طرح درج ہے :

''خوشبو کے حوالے'' بدر محمدی کی غزلوں کا تازہ مجموعہ ہے، جس پر کسی طرح کی فرسودگی یا کہنگی کا الزام عائد نہیں کیا جاسکتا ہے۔ بدر کا رشتہ مستحسن شعری روایات سے برقرار ہے، مگر انھوں نے کوئی گھسی پٹی راہ اختیار نہیں کی ہے۔ تقلید سے گریز کرتے ہوئے انھوں نے اپنے لئے ایک راہ منتخب کی ہے جس کا تعلق ماضی سے کم اور حال سے زیادہ ہے۔......''

پروفیسر علیم اللہ حالی کہتے ہیں :

''......بدر محمدی اپنی شاعری میں ذاتی اور نجی محسوسات کو سادگی کے ساتھ شعر کا پیکر عطا کرتے ہیں۔ ان کی غزلیں اپنے مزاج اور تیور کے لحاظ سے دوسرے ہم عصر شاعروں سے الگ ہیں اور قاری کو ان کے اختصاص کی یاد دلاتی ہیں۔''

(مضمون ''میری جوسنو'' ص:۱۵)

ظہیر صدیقی کا ماننا ہے :

''بدر اپنے دبستانِ سخن کے محض پیروکار نہیں، مبلغ بھی ہیں اور ان کی غزلیں ان کی متبع ہیں۔ بدر محمدی کی غزلوں میں جذبہ و احساس کی کمی نہیں لیکن وہ ''فکر'' کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔......وہ فکر اور فن کے رشتے کو ناگزیر سمجھتے ہیں، لیکن فکر کو فنا فی فن دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک فکر اور فن کے مابین رشتہ جسم اور روح کا نہیں، جسم اور کھال کا بھی نہیں بلکہ جسم اور لباس میں جو رشتہ ہے، وہی رشتہ فکر اور فن میں ہے۔'' (مضمون ''آمیزۂ فکر و فن'' ص:۱۸)

کتاب کے عنوان کے متعلق پروفیسر علی احمد فاطمی کا خیال کچھ اس طرح ہے :

''بدر محمدی کے اس شعری مجموعہ کا عنوان ''خوشبو کے حوالے'' سے ضرور ہے اور عنوان کچھ اسی قسم کے ہوتے ہیں لیکن شعر کے بطن اور متن میں اتر کر دیکھئے تو آپ کو فکر کی خوشبو نظر آئے گی۔ خیالات کا عطر یہ خیالات بھی رواروی کے نہیں

بلکہ زندگی کے تضادات کے حوالے سے نکل کر آتے ہیں۔"

(مضمون "فکر و خیال کا شاعر: بدر محمدی" ص: ۳۰-۳۱)

بدر محمدی کی شاعری کے حسن اور نازک خیالی کی تحسین کرتے ہوئے ڈاکٹر نذیر فتح پوری یوں گویا ہیں:

"مجموعۂ غزل "خوشبو کے حوالے" اپنے اندر کئی طرح کے معانی رکھتا ہے۔ ایک تو یہ کہ شاعر نے اپنے آپ کو خوشبو کے حوالے کر دیا ہے۔ اب وہ جہاں جائے گا، خوشبو لٹائے گا، فضاؤں کو مہکائے گا، ذوقِ مطالعہ رکھنے والے ذہنوں کو معطر کرے گا، چمنستان تخیل اس کے ساتھ ہوگا، جس میں پھول ہوں گے، کلیاں ہوں گی، بھونرے ہوں گے، تتلیاں ہوں گی۔ یہ سارا فطری حسن وہ تقسیم کر جائے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر اس کی غزل کی تخلیق خوشبو کے بطن سے ہوئی ہے تو یہ بھی معنوی اعتبار سے اہم ہے۔ خوشبو کے استعارے سے قاری چاہے جو مطلب اخذ کرے، ہر حال میں خوشبو اسے ہی میسر آئے گی۔ کثافت کے ماحول میں خوشبو لٹانا ایک قلندرانہ عمل ہے۔ ایک نیکی ہے۔ بدر محمد نے اپنے تخلیقی عمل سے ایسی ہی نیکی کا کام کیا ہے۔ خدا کرے یہ نیکی گھر گھر پہنچے، وادی کو معطر کرے، ذہنوں کو مہکائے اور روحوں کو سکون پہنچائے۔"

(فلیپ پر رائے کتاب "خوشبو کے حوالے")

پروفیسر کوثر مظہری شاعر کی شعری انفرادیت کے متعلق لکھتے ہیں:

"آج کی شعری فیشن زدگی میں بدر محمدی نے اپنی تخلیقی ہنر مندی کو کلاسیکی شعری روایت سے ہم آہنگ کیا ہے۔ انھیں پتہ ہے کہ اسی ڈگر پر چلنے سے فن کار اپنی منزل پر پہنچ سکتا ہے اور اگر ایسا نہیں بھی ہوا تو کم از کم تخلیقی قدر و قیمت پر آفت نہیں آئے گی۔"

(مضمون "گفتگو خوشبو کے حوالے سے" ص: ۳۲)

صاحبِ کتاب خود اپنے متعلق گویا ہیں :

''شاعر اپنی زبان کی لطافت، رنگینی اور رعنائی کی وجہ سے جانا جاتا ہے۔ کسی شاعر کا کلام ہی اس کا تعارف ہوتا ہے۔ میری شاعری کیا ہے، کیا نہیں؟ یہ سب میرے شعروں میں درج ہے۔ میری سخن طرازی لائق داد ہے تو مجھے داد ملے اور قابلِ قبول نہیں ہے تو مشورے دیئے جائیں، مناسب تنقید کی جائے۔ میں جو ہوں اس کی ستائش نہیں چاہتا بلکہ سزاوارِ داد بن کر داد وصول کرنے کا آرزومند ہوں۔......'' (مضمون ''خوشبوئے اول'' ص:۱۰)

کتاب ''خوشبو کے حوالے'' سے چند منتخب اشعار ملاحظہ ہوں جن سے بدر محمدی کی شعری وسعتوں کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے :

میں چلوں تو امیر ہوجاؤں
یوں کرے پیچھا کارواں میرا

دل میں مرے ہیں خواہشیں موجود اس طرح
جیسے کسی مکان میں بچوں کی خامشی

آمدِ شعر ہے اے بدر ٹھہر جاؤ ذرا
فکر کی ہے یہ گھڑی پیڑ کے نیچے بیٹھو

سچ ایک بار بول کے نقصان بھی اٹھا
ہر بار جھوٹ بول کے مت فائدہ نکال

یہاں سے دور کہیں وہ نکل گئی ہوگی
ہوا تو رہتی ہے آوارگی کی دنیا میں

روز روز آتے ہیں پتھر لینے میری خیریت
پیڑ جو آنگن میں ہے اس پر ثمر باقی رہے

اوروں سے مل کے بچتا ہے کچھ وقت ہی کہاں
ہوتی ہے خود سے میری ملاقات ہی نہیں

شعر و سخن کی بدر پہ ہے یوں سوار دھن
اپنی نہیں ہے فکر اسے، فکر و فن کی ہے

اک تہی دست سے کیا کیا تنِ فانی مانگے
سایۂ زیست میں ہے نقل مکانی مانگے

گرد و گماں ہوائے یقیں بیٹھنے لگی
بیٹھے نہ آسماں کہ زمیں بیٹھنے لگی

ہے کور چشم فلک وہ کسی کو کیا دیکھے
ہم آنکھ والے تماشے فلک کے دیکھتے ہیں

اے بدر تیرے شعر کا لہجہ ہے دلنشیں
ہر بار میرے دل میں کہیں بیٹھنے لگی

ہو نہیں پائی رسائی منزلِ مقصود تک
بدر ایسا خط تھا میں جس پر پتہ لکھا نہ تھا

استادِ سخن کی نہیں اے بدر ضرورت
ہو سامنے جو میر کا دیوان بہت ہے

لب ، حلق ، زباں اور نہ تالو کے حوالے
ہر لفظ مرے شعر کا اردو کے حوالے

سارے جہاں کو اپنا شناسا کئے ہے وہ
اردو ہے اس کا نام، تماشہ کئے ہے وہ

اسلوبِ معطر ہے اُسے بدر میسر
گلہائے ہنر سے جو دے خوشبو کے حوالے

تخلیقی دوامیت کا حصول خونِ جگر کے بغیر ممکن نہیں۔ خود احتسابی کا عمل ایک مشکل ترین عمل ہے، جس سے بڑے فن کار ہی عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ بدر محمدی کی شاعری میں مطالعۂ کائنات کے ساتھ مطالعۂ ذات بھی وسیع تر تناظر میں ہوا ہے۔ ان کی شاعری کا مزاج عاشقانہ ہے لیکن وہ عشق ومحبت کی اس روایت سے وابستہ ہیں جو فکری وعملی طور پر عالمِ انسانیت کیلئے محبت کا پیغام کائنات کے ذرّے ذرّے میں بسا دینا چاہتے ہیں۔ تخلیقی عمل میں موصوف رمز وایما اور اساطیر سے کام لیتے ہیں اور فکر وفن کے حسین انضمام میں انھیں کامل یقین ہے جسے وہ برتتے بھی ہیں ساتھ ہی لطافت کے بیان میں اپنی نظیر آپ ہیں۔ وہ جذبۂ دل کو ابھارنا جانتے ہیں، معرفت ووجدان کے بحر میں غوطہ بھی لگاتے ہیں۔ مناظرِ قدرت کا سماں دکھاتے بھی ہیں اور بے خود ہو کر قارئین کو متوجہ کرنا جانتے ہیں کہ عمرانیات کی گونا گوں اور بوقلموں دنیا ان کی شاعری میں آباد ہے۔

❖❖❖

پیش خدمت ہے کتب خانہ گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے
https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
0307-2128068
@Stranger

ظفر فاروقی: گنگا جمنی تہذیب کے پیکر

والد بزرگوار جناب محمد ظفر المنان ظفر فاروقی (عرف گیندا) ' سابق پولس آفیسر' (ولادت ۲۰ر جولائی ۱۹۳۵ء) کا انتقال پر ملال ۱۳ر رمضان المبارک ۱۴۳۱ھ بمطابق ۲۴ر اگست ۲۰۱۰ء بوقت ساڑھے بارہ بجے دن رہائش گاہ ''کاشانۂ فاروقی'' محلّہ گنگوارہ، دربھنگہ (بہار) میں ہوا اور اگلے روز (۲۵ر اگست) صبح دس بجے حضرت بہادر شاہؒ کے سرہانے گنگوارہ میں دفن ہوئے۔ نمازِ جنازہ ان کے ماموں زاد بھائی اور ہم زلف مولوی منصور حسن (امیر تبلیغی جماعت، سمستی پور) نے مرحوم کی وصیت کے مطابق پڑھائی۔

ان پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے کہ بعض لوگوں کی زندگی اور ان کے کارنامے نقش لازوال بن جاتے ہیں۔ ظفر المنان ظفر فاروقی بھی ایک ایسے ہی گنج ہائے گراں مایہ تھے جنہوں نے اپنے کارناموں سے لوگوں کے دلوں میں محبت اور شفقت کے نہ جانے کتنے چراغ روشن کیے ہیں۔ موت برحق ہے لیکن مرنے والوں کی یاد باقی رہتی ہے اور انسان جو کارنامے زندگی میں انجام دیتا ہے وہ فراموش نہیں کیے جا سکتے۔ پولس سروس میں اس طرح زندگی گذارنا کہ خلق خدا عقیدت مند ہو جائے ایک پولس مین کے کردار کا نادر الوجود پہلو ہے مگر یہ مرحوم محمد ظفر المنان ظفر فاروقی کا طرۂ امتیاز تھا ورنہ ضلع نوادہ (بہار) کے ایک قادر الکلام شاعر احسان ثاقب عقیدت کے نذرانے یوں نہ پیش کرتے:

بس ایک حکم ہوا اور چھوڑ دی دنیا — وفا پرست تھے اتنے جناب فاروقی
بھرم تو رکھنا تھا اُن کو رخِ محبت کا — گئے تو کھول گئے ایک باب فاروقی

......

یہ راز سمجھیں کہ رب نے انہیں بلایا کب — عظیم تھے تو انہیں عظمتِ وفا بھی ملی
اٹھایا پاک مہینے میں اُن کو اللہ نے — نصیب والے تھے توقیرِ کبریا بھی ملی

......

یہ سچ ہے،ہم سے بہت دور ہو گئے ہیں وہ
مگر وہ چھوڑ گئے ہیں متاعِ آئندہ
ذرا بھی گر ہمیں اُن سے کوئی محبت تھی
تو اُن کے طرزِ عمل کو بنائیں تابندہ

......

حیات وموت میں ایسا بھی ایک پہلو ہے
جہاں پہ ہوش کا موسم ٹھہر سا جاتا ہے
دل و دماغ پر انجان سا کوئی لمحہ
کہ دیکھتا تو نہیں بس گذر سا جاتا ہے

......

زمیں کا نقش مٹائے گا آسماں کب تک
بدن تو مرتا ہے نقشِ خودی نہیں مرتا
یہ انتقال محض اک اصول فطرت ہے
جو کام زندہ ہو تو آدمی نہیں مرتا

(مطبوعہ ''قومی تنظیم'' پٹنہ ۳۱/اگست ۲۰۱۰ء)

والد صاحب ساری زندگی دنیا و دین کی ذمہ داریوں کو بحسن خوبی نبھاتے رہے۔ انہوں نے انصاف اور انسانیت کے اصولوں کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ ایک ذمہ دار باپ جس نے اپنے تمام بچوں کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام کیا اور انہیں کامیابیوں کی منزل تک پہنچا کر اپنی محنت کا ثمر پایا۔ ان کی اولاد ڈاکٹر سید اعجاز حسن 'امام اعظم'، سید حلیم آلِ احمر اعظم، سید ظفر الاسلام ہاشمی، شہلا فاروقی اور سید خرم شہاب الدین بھی کامیاب و کامران زندگی گزار رہے ہیں، وہیں ایک پولس آفیسر کی حیثیت سے وہ 'جہاں جہاں بھی گئے آفتاب لے کے گئے'۔ انہوں نے بلا تفریق مذہب وملت اپنی ڈیوٹی کے ساتھ جہاں انصاف کیا وہیں عوام کو ظالموں سے بچائے رکھنے میں پورے تدبر کے ساتھ کام کیا، جس کے چرچے ان کی زندگی میں ان کے ٹرانسفر کے بعد بھی ہوتے رہے۔ راقم اگر اپنے دیدہ شنیدہ مشاہدات رقم کرے تو لوگ اسے فرزندانہ تعلی قرار دیں گے۔ اس لئے ایک مضمون ''کچھ ایسا بھی ہوا'' سے ایک صاحب قلم جناب تشنہ اعجاز (خیر آباد، بگہا، مغربی چمپارن) کے مشاہدات سے روشناس کراتا ہوں۔ تشنہ صاحب چھٹیوں کے موقع پر ہمالہ کی ترائی 'دون' میں گھوم رہے تھے۔ وہاں انہوں نے دھان روپتی ہوئی مقامی تھارو قبیلہ کی دوشیزاؤں اور عورتوں کو ایک لوک گیت گاتے ہوئے سنا جس کے بول تھے:

ایلیں پھاروکی بوا دیسوا میں ہمار ہو　　ہمرے نگریا سے بھاگل ایکدم انہار ہو
میّا بہنیا گھومیں لی چارو اوریا　　اب گربین پر کری نا کوئی اتیاچار ہو
ایلیں پھاروکی بوا دیسوا میں ہمار ہو

تشنہ صاحب رقم طراز ہیں:

''میں نے جب اس لوک گیت کا مفہوم جاننا چاہا تو معلوم ہوا کہ علاقہ 'دون' میں کوئی پولس اسٹیشن نیا نیا کھلا ہے۔ یہیں ایک پولس آفیسر فاروقی صاحب آئے تھے۔ انہوں نے آتے ہی پورے علاقے میں امن اور انصاف کا چراغ روشن کر دیا تھا۔ غنڈوں کے لئے قہر اور بے گناہ لوگوں کے لئے مددگار تھے۔ مشرقی یوپی کا ایک جھولا چھاپ ڈاکٹر کچھ دنوں پہلے یہاں آیا تھا۔ علاقے میں کافی دھاک جما لیا تھا۔ ڈاکٹر ضلع دیوریا موجودہ ضلع کوشی نگر کا رہنے والا تھا۔ تھارو لڑکیوں کا جنسی استحصال کیا کرتا تھا اور علاقے کے دبنگ کاشتکاروں کا ان سے بستر بھی گرم کرواتا تھا۔ ایک بار ضلع کوشی نگر کے کسی دیہات سے ایک معصوم خوبصورت مسلم دوشیزہ کو سبز باغ دکھا کر لے آیا اور عرصہ تک اسے بستر کی زینت بنائے رکھا۔ یہی نہیں دوسرے امیر اور دبنگ لوگوں کو بھی اس سے مستفیض کروانے لگا تھا کہ فاروقی صاحب نہ جانے کیسے پورے دل بل کے ساتھ آگئے۔ اس لڑکی کو قبضے میں کیا پھر جب علاجِ فاروقی شروع ہوا تو پورا علاقہ شانت ہو گیا۔ ڈاکٹر کو اس کے کئے کی خوب سزا دی۔ لڑکی کے والد کو بلوایا۔ انہیں بے پردگی، آزادانہ خلط ملط اور دنیا کے نشیب و فراز سمجھایا۔ لڑکی اپنی غلطی پر نادم ہوئی اور فاروقی صاحب کو سلام کرتے ہوئے اپنے گھر چلی گئی جبکہ وہ آوارہ صفت ڈاکٹر یہاں سے ایسا غائب ہوا کہ بعد میں کبھی اس علاقے میں نہیں دیکھا گیا۔ اب لڑکیوں کی ماں بہنوں کو کہیں کوئی خطرہ نہیں ہے ہر طرف امن وسکون ہے۔ اب یہ بے خوف کھیتوں، کھلیانوں اور جنگلوں میں خشک لکڑیاں چننے جاتی ہیں۔ انہیں اب کوئی نہیں چھیڑتا ہے۔ یہ سب فاروقی صاحب کی محنت سے ہوا۔ دیہاتوں میں ماں بہنیں ان پر اپنی زبانوں میں گیت جوڑے گاتی رہتی ہیں اور ان کو یاد کرتی رہتی ہیں۔ میں یہ سن کر متعجب ہو گیا۔ مجھے بھی شوق ہوا کہ میں بھی فاروقی صاحب سے ملوں۔ نرکٹیا گنج میں جامع مسجد کے نیچے ایک مشہور قدیمی اور دیسی

یونانی دوا خانے میں بیٹھا ہوا تھا۔ میرے چھوٹے بہنوئی حکیم اختر حسین گھائل مطب میں موجود تھے۔ان سے باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک ٹریکٹر ٹرالی جامع مسجد کے پاس آ کر رکا۔ اس میں اینٹیں لدی ہوئی تھیں۔ کچھ مزدور اترے اور اینٹیں اٹھا اٹھا کر مسجد کے جنوبی حصے میں رکھنے لگے۔ پھر میری چشمِ حیرت نے یہ نظارہ بھی دیکھا کہ اس چلچلاتی اور تیز دھوپ میں پولس وردی میں ایک صاحب تشریف لائے۔ چہرے پر مناسب سی داڑھی بھی تھی ساتھ میں ایک لڑکا بھی تھا۔ اینٹیں اپنے سر پر اٹھا اٹھا کر دونوں جامع مسجد کے جنوبی حصے میں رکھنے لگے۔ میں نے معلوم کیا تو پتہ چلا کہ یہی فاروقی صاحب ہیں اور یہ ان کے چھوٹے صاحبزادے ہیں۔ پھر ایک واقعہ ایسا ہوا جس کا چرچہ ہر خاص و عام کی زبان پر کافی دنوں تک رہا۔ آج بھی لوگ باگ ذکر کیا کرتے ہیں۔ موضع رامپور تو تو ہیا، ڈومریا اسٹیٹ کے متصل ہی ہے۔ یہاں ایک حاجی صاحب آٹے اور دھان کوٹنے کی مشین لگانے کے لئے زمین پر مٹی گروا رہے تھے۔ علاقے کے فرعون صفت ارباب کو حاجی صاحب کا یہ عمل ناگوار گذرا کہ بغیر ہم لوگوں کے دربار میں حاضری دیئے یہ حاجی من مانی کر رہا ہے۔ ایک ہریجن کو پڑھا سکھا کر حاجی صاحب کی زمین پر ایک جھونپڑی ڈلوا دی۔ اس پر تناؤ کا ماحول بن گیا۔ حاجی صاحب نے وہ جھونپڑی اجاڑ دی کہ یہ زمین میری ہے دوسرا کیوں زبردستی قابض ہوگا۔ فرعون صفت افراد نے ایک من گڑھت اور فرضی معاملہ بنالیا۔ پھر ایس پی صاحب کو جھوٹی باتیں بتا کر انہیں ورغلایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایس پی صاحب تشریف لے آئے وہ بھی ہریجن تھے۔ وہ معائنہ کے لئے تشریف لے گئے۔ اچانک ایس پی کو آتے دیکھ کر حاجی صاحب بھاگے۔ ایس پی بھی دوڑنے لگا اور ساتھ ساتھ فاروقی صاحب کو بھی لیا۔ اس نے فاروقی صاحب کو حکم دیا کہ اس کے پیروں پر فائر کیجئے۔ فاروقی صاحب خاموش رہے۔ پھر وہ زور سے بولا کہ میں کہہ رہا ہوں کہ اس کے پیر پر فائر کیجئے۔ فاروقی صاحب نے یکا یک سر سے اپنا کیپ اتار لیا اور بولے ''فاروقی اور اس پر فائرنگ جو دربارِ رسولؐ سے لوٹا ہو۔ سر! میں نوکری چھوڑ سکتا ہوں لیکن یہ نہیں ہوسکتا۔'' ایس پی دم بخود رہ گیا۔ جب ایس پی نے صحیح تفتیش کی اور عام لوگوں سے حقیقت کا علم ہوا تو وہ کافی نادم ہوا اور اس کی نگاہوں میں فاروقی صاحب کی قدر و منزلت بڑھ گئی۔ اسی نرکٹیا گنج کے محلہ شیو گنج میں

ایک مشہور قومی کارکن اور بزنس مین عبدالرشید صاحب صدیقی ہیں جو نہایت درد بھرے انداز میں کہتے ہیں کہ بھائی بہت سے پولس آفیسر آئے مگر فاروقی صاحب جیسا کوئی نہیں آیا۔ انہیں سے یہ بھی علم ہوا کہ نرکٹیا گنج سے چھ میل کے فاصلے پر ایک بستی ہے جسے منگلا پور۔ وہاں کوئی مسجد نہیں تھی۔ ہم لوگوں نے مشورہ کر کے اپنی زمین پر ایک جھونپڑی بنا ڈالی۔ اذان اور نماز شروع کرنی چاہی تو وہاں کے فرقہ پرست اور دبنگ زمین دار مرنے مارنے پر تل گئے۔ ایک دن میں نے فجر کی اذان دی تو مجھے جان سے مارنے کے لئے دوڑ پڑے۔ میں اپنی جان کسی طرح بچا کر نرکٹیا گنج پہنچا۔ جب یہ بات لوگوں کو معلوم ہوئی تو سب نے پولس اسٹیشن جا کر فاروقی صاحب سے ملنے کو کہا۔ رشید صاحب تھانے گئے۔ فاروقی صاحب سے ملے اور پوری کہانی سنائی۔ انھوں نے فرمایا کہ تم گھر جاؤ میں ظہر کے وقت آؤں گا۔ یہ کسی طرح اپنی جان بچا کر گھر پہنچے۔ ٹھیک نمازِ ظہر کے وقت ایک نہایت دلکش اذان کی آواز بستی کے لوگوں کو سنائی پڑی۔ جب لوگ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ایک پولس آفیسر خاکی وردی میں نہایت سکون سے اذان دے رہا ہے۔ پولس کی گاڑی سڑک کے کنارے کھڑی ہے۔ پولس والے خاموش بیٹھے ہیں۔ وہ آفیسر سنتوں کے بعد خود امامت کرتا ہے اور نماز کے بعد وہ تمام لوگوں کو سمجھاتا ہے۔ غیر مسلم اس کی باتوں سے کافی متاثر ہوتے ہیں۔ تب کا دن ہے اور آج کا دن۔ اب ماشاءاللہ ایک شاندار مسجد بھی ہے اور مکتب بھی۔ بچے تعلیم بھی حاصل کرتے ہیں۔ ایسے نہ جانے کتنے واقعات ہیں جو فاروقی صاحب سے منسوب ہیں۔ لوگ محبت بھرے انداز میں فاروقی صاحب کو یاد کرتے ہیں اور دعائیں دیتے ہیں۔ سلام اے فاروقی صاحب آپ کو سلام۔ ایک روز مجھے فون پر ایک صاحب نے بتایا کہ آپ بگہا صدر ہسپتال تشریف لائیے۔ سمری دون کے مشہور کاشتکار بھولا میاں کو ماؤوادیوں نے نہایت بے دردی سے ذبح کر دیا ہے۔ ان کی لاش پوسٹ مارٹم کے لئے آ رہی ہے ان کے ساتھ ایک آدمی اور مارا گیا ہے۔ آپ جلد پہنچئے۔ میں ضروری کام چھوڑ کر بگہا صدر ہسپتال حاضر ہوا تو لاشیں ہسپتال میں لائی جا چکی تھیں۔ لاشوں سے کافی بدبو آ رہی تھی۔ پتہ چلا کہ بھولا میاں بغل کی بستی سے لوٹ رہے تھے کہ انہیں بلر یادو کے بھائی کے ساتھ ماؤوادیوں نے پکڑ لیا جو پہلے سے جنگل میں گھات لگائے بیٹھے تھے اور

نہایت بے دردی سے قتل کر دیا۔ اس سے کچھ دن قبل بلریا دو کا ماؤ نوازوں نے اسی طرح نہایت بے دردی سے ان کے کھیت پر جہاں وہ کھیتی کرا رہے تھے قتل کر دیا تھا۔ پوسٹ مارٹم کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ صدر ہسپتال کے سامنے ایک پیڑ کے نزدیک کافی لوگ موجود تھے۔ جس میں سمری دون اور ڈمری دون کے لوگ تھے یہ آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ فاروقی بابو نے صحیح کہا تھا۔ میں نے پوچھا کہ اس درد وغم کے ماحول میں فاروقی صاحب کا ذکر کیا معنی رکھتا ہے تو ہارون خاں صاحب مرحوم کے صاحبزادے شمس الہدیٰ خاں نے بتایا کہ جب اس علاقے کے ڈمری دون میں فاروقی صاحب پولس آفیسر ہو کر آئے تو چہار جانب ان کا گزر ہوتا تھا۔ علاقے کے تمام حالات پر ان کی نظر رہتی تھی۔ وہ کاشت کاروں کو سمجھاتے تھے۔ ادھر کا مزاج بن گیا تھا کہ بیشتر کاشتکار اپنی کھیتی کے لئے اور رہنے کے لئے ڈیرا بنا کر رہتے تھے۔ کوئی کھر اور کھرئی کا عمدہ بنگلا بنوا کر رہتا تھا تو کچھ پختہ مکان اینٹ سیمنٹ سے تیار کرا کے۔ ان سب کی دیکھ ریکھ کے لئے ایک رکھیل ضرور ہوا کرتی تھی۔ اور بھی کئی جگہ کے کاشتکار بھی اپنی رکھیلوں کے ساتھ وقت بتاتے ہیں۔ جن کاشتکاروں کی رکھیلیں تھارو قبیلے کی لڑکیاں ہوتیں وہ بیحد فائدے میں رہتے تھے۔ پورے گھر کی صفائی ستھرائی، جھاڑ پونچھ کے علاوہ عمدہ کھانا بنانا، بستر نہایت صاف ستھرا اور مالک کی خواہشوں کی تکمیل میں مکمل خود سپردگی۔ فاروقی بابو سمجھاتے تھے کہ تم لوگ اس فعل قبیح سے توبہ کر لو۔ آج یہ سیدھے سادھے آدیواسی تھارو، دھانگر جتنے بے ضرر اور سیدھے نظر آ رہے ہیں یہ کل تمہارے لئے عذاب بن جائیں گے۔ آج تھاروؤں کی یہ معصوم اور بے ضرر لڑکیاں اپنے سارے ناز و انداز بھول چکی ہیں۔ سو دو سو کی تعداد میں فوجی وردی میں AK47 لٹکائے جنگلوں میں گھوم رہی ہیں۔ کتنے زمینداروں کا صفایا کر چکی ہیں اور گھروں کو ڈائنامائٹ سے اڑا چکی ہیں۔ ہائے رے فاروقی بابو آپ کہاں ہیں لوگ یہ کہتے پھر رہے ہیں۔"

(مطبوعہ "تمثیل نو"، دربھنگہ شمارہ جولائی تا دسمبر ۲۰۰۶ء)

معروف افسانہ نگار مشتاق احمد نوری نے تشنہ اعجاز کا مضمون پڑھ کر راقم کے نام ایک مکتوب میں ان تاثرات کا اظہار کیا ہے:

''تشنہ اعجاز کی تحریر پڑھ کر حیرت بھری مسرت ہوئی۔ بہار کے توسط سے ان سے مراسم رہے ہیں لیکن وہ تو چھپے رستم نکلے اور ایک پولس آفیسر کو انہوں نے ایک صوفی بزرگ کی طرح دریافت کیا۔ آج کے پولس آفیسرس کو ان سے سبق لینا چاہئے۔ آپ قابل مبارکباد ہیں کہ وہ وراثت آپ کے اندر ہے اور اس ورثہ کو قائم رکھنا ہے۔''

(مطبوعہ: ''تمثیل نو'' دربھنگہ، شمارہ جنوری تا ستمبر ۲۰۰۷ء)

معروف افسانہ نگار فیض الحسن اپنے تعزیتی مکتوب مرقومہ ۲۸ راگست ۲۰۱۰ء میں لکھتے ہیں:

''محترم فاروقی صاحب کو مرحوم لکھتے ہوئے میرا قلم کانپ رہا ہے...... موصوف پکے مومن تھے۔ ہر جگہ ان کی مومنانہ شان نمایاں تھی۔ جب تک وہ شکار پور تھانہ (نرکٹیا گنج) میں تعینات تھے ان کے نام سے جرائم پیشہ لوگ گھبراتے تھے۔ کبھی کبھار فرصت کے لمحات میں وہ حکیم اختر حسین گھائل کے مطب میں آجاتے تھے۔ دلچسپ باتیں ہوتی تھیں۔ وہ ایک مکمل عالم تھے۔ اپنے فرائض کی ادائیگی میں کبھی انفرادیت کو جدا نہیں کرتے تھے۔ یہی ان کے کردار کی خوبی تھی۔ واقعی ان کی کمی برسوں محسوس کی جائے گی۔''

والد صاحب کے اندر یہ نیک جذبہ اس لئے موجزن تھا کہ ان کی پرورش میں صوفیوں کا خاص فیض رہا ہے۔ جب وہ منی گاچھی تھانہ میں تعینات تھے تو اس حلقے کے ایک گاؤں رام نگر سے خاص لگاؤ ہو گیا تھا۔ اس گاؤں میں مقیم معروف ادیب ڈاکٹر ایم صلاح الدین (استاذ، مدرسہ اصلاحیہ، نام نگر، بنٹولیہ، دربھنگہ) اپنے مضمون ''ادب و تہذیب اور علم و عرفان کا مرکز: گنگوارہ'' میں جذبات کی ترجمانی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''جناب محمد ظفر المنان ظفر فاروقی سابق پولس آفیسر کی شخصیت بڑی باغ و بہار اور مرنجا مرنج ہے۔ بڑے وضع دار انسان ہیں۔ پولس سروس میں بھی اپنے پورے مذہبی وقار کے ساتھ رہے اور اپنی ایمانداری کی وجہ سے ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ جہاں بھی رہے مظلوموں کی آواز بنے رہے۔ ان کا یہ مقولہ بڑا

مشہور ہوا : "If you want to see the god on earth, you
see the officer-incharge of a Police station." اپنی
پولس ڈائری ہمیشہ انگریزی میں لکھی لیکن اردو زبان وادب سے خاصا شغف
رکھتے ہیں۔ موزوں اشعار کا برجستہ و برمحل استعمال کرتے ہیں۔ مذہب کا بھی
اچھا مطالعہ ہے۔ ۳۱ جولائی ۱۹۹۳ء کو ریام تھانہ (ضلع دربھنگہ) سے سبکدوشی
کے بعد مطالعہ اور مہمان نوازی کو اپنا مشغلہ بنالیا ہے۔"

(مطبوعہ "تمثیل نو" دربھنگہ، جولائی تا دسمبر ۲۰۰۶ء ص:۱۱۸)

ان کی مہمان نوازی پر ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری مرحوم (کٹک) نے سفر نامہ "دربھنگہ: یادوں
کے جلتے بجھتے چراغ" میں کس انداز سے خامہ فرسائی کی ہے، ملاحظہ ہو:

"پروفیسر عبدالواسع صاحب اور ناچیز نے ڈاکٹر امام اعظم کے ڈی.لٹ. کا وائیوا
جنوری ۲۰۰۱ء میں لیا۔ مبارک باد دی گئی اور سارے لوگوں کو کاروں پر گنگوارہ
"کاشانۂ فاروقی" لے جایا گیا۔ ڈاکٹر امام اعظم کے والد محترم جناب محمد ظفر المنان
ظفر فاروقی خاصے چاق و چوبند نظر آرہے تھے۔ کبر سنی کے باوجود ریٹائرڈ پولس
آفیسر ہونے کی پاسداری کررہے تھے۔ چڑھی ہوئی آستین، پینٹ ارسی ہوئی
قمیص اور سگریٹ پینے کا خاص انداز۔ سردیوں کی دوپہر چھت پر پھیلی دھوپ
میں مرغن غذا اور مرغ و ماہی نے لذت کام و دہن میں فراوانی پیدا کی!"

(مطبوعہ "تمثیل نو" دربھنگہ، جولائی تا دسمبر ۲۰۰۶ء)

والد محترم جانتے تھے کہ آزادی کے بعد ملت کے لوگ انتہائی پسماندگی میں زندگی گذار
رہے ہیں۔ تعلیم سے بے بہرہ ہیں اقتصادی طور پر بدحال ہیں اور ان کے ساتھ انصاف نہیں ہوتا۔
اس لئے انہوں نے اپنا فرض سمجھا کہ مجبوروں، محکوموں اور کمزوروں کی حتی الوسع مدد کی جائے۔ انہیں
انصاف ملے۔ اس سلسلے میں وہ معتوب بھی ہوئے لیکن پایۂ استقلال میں لغزش نہیں آنے دی۔
انہیں اردو رسائل و جرائد پڑھنے کا بے انتہا شوق تھا۔ ادبی مجلسوں اور مشاعروں میں عمر

کے آخری ایام میں بھی صحت کی معذوری کے باوجود شرکت کرتے تھے۔ اپنے تہذیب وتمدن کو محفوظ رکھنے کے لئے تلقین بھی کرتے تھے اور گھر کا ماحول بھی اس تہذیب کے دائرے میں رکھتے تھے۔ جب راقم الحروف نے تعلیمی اور تدریسی سرگرمیوں میں اپنا مقام بنایا اور ادبی جریدہ "تمثیل نو" نکالا تو انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے ان کے خواب کو تعبیر مل گئی ہو اور جب وہ نیا رسالہ یا نیا شمارہ دیکھتے تھے تو ان کی خوشی کی انتہا نہیں رہتی تھی۔ کیوں کہ زبان کی خدمت کو وہ اپنے کلچر کو بچائے رکھنے کا ایک زبردست وسیلہ مانتے تھے۔ ایک بے حد ایماندار اور با اصول پولس آفیسر تھے اور وہ ہمیشہ اپنی ذاتی زندگی اور اپنی ڈیوٹی میں ایک دیندار ملی جذبے سے سرشار مجاہد کے طور پر نظر آئے۔ ایسا کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ اپنی ملازمت کے دوران وہ جہاں جہاں تعینات رہے ان کے انتقال کے بعد تقریباً ہر حلقے سے تعزیتی مکتوب اور خراجِ عقیدت کی نشستوں کی خبریں آئیں۔

معروف ادیب انوارالحسن وسطوی نے اپنے مکتوب (مرقومہ ۲۶ راگست ۲۰۱۰ء) میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے:

> "آپ کے والد گرامی محترم ایم زیڈ ایم زیڈ فاروقی کے انتقال کی خبر پڑھ کر دلی صدمہ پہنچا ہے۔ آپ کے والد گرامی بہت خوش قسمت تھے کہ اللہ تبارک تعالیٰ نے رمضان المبارک جیسے مقدس مہینے میں انہیں اپنے پاس بلایا، وہ بھی مغفرت کے عشرے میں۔ ایسی موت کی تمنا تو بہت لوگ کرتے ہیں لیکن یہ موقع اور یہ سعادت سب کی قسمت میں کہاں۔ یقیناً اللہ تعالیٰ کو ان کی نیکی پسند آئی ہے تبھی انہیں یہ اعزاز نصیب ہوا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ جل شانہٗ ان کی نیکیوں کو شرفِ قبولیت بخشے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین...... فاروقی صاحب کے انتقال کو میں اپنے گھر اور اپنے خاندان کا سانحہ سمجھتا ہوں۔ ایک دفعہ (۱۹۹۴ء) آپ نے مجھے بتایا تھا کہ اخبار میں جب کبھی اس ناچیز کی کوئی تحریر شائع ہوتی ہے تو وہ اسے ضرور پڑھتے ہیں اور لوگوں کو یہ بتاتے ہیں کہ ضرور یہ ہم لوگوں کے رشتہ دار ہوں گے کیونکہ یہ

وسطوی ہیں اور یہ حسن وسطی ہیں۔ بالمشافہ ملاقات نہ ہونے کے باوجود انہیں مجھ سے اتنی محبت تھی۔ اب جب ان کا انتقال ہو چکا ہے تو مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ میں نے کبھی ان سے شرفِ ملاقات کیوں نہیں حاصل کی۔ اسے اب میں اپنی محرومی سمجھتا ہوں۔ ان کی محبت کا قرض میں کیسے ادا کروں بس میں اب سوائے مغفرت کی دعا کے اور کیا کر سکتا ہوں۔''

معروف محقق وادیب ڈاکٹر شاہد اقبال (گیا) نے اپنے تاثرات (مرقومہ ۲۵؍اگست ۲۰۱۰ء) ان لفظوں میں بیان کئے ہیں:

''آج صبح صبح آپ کے والد محترم کے وصال کی خبر روزنامہ ''قومی تنظیم'' پٹنہ میں پڑھی۔ آپ پر ایک بڑا سانحہ گزر گیا، دل لرز کر رہ جاتا ہے۔ پارا (۲۹) آیت نمبر: ۲ (ترجمہ: جس نے موت اور حیات کو پیدا کیا تا کہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں سے کون شخص عمل میں زیادہ اچھا ہے وہ زبردست بخشنے والا ہے) کو پڑھ کر آپ کے لئے صبر وقرار کی دعاء کرتا ہوں اور ساتھ ہی خدائے لم یزل سے یہ دعا بھی ہے کہ وہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔''

علامہ شاہ قتیل داناپوریؒ سے والد بزرگوار کے تعلقات چھپرہ سے تھے۔ پھر جب والد صاحب کا تبادلہ آرہ (بھوجپور) ہوا تو ان کے فرزند پروفیسر شاہ طلحہ رضوی برق سے تعلقات استوار ہوئے اور آرہ کے کئی مشاعروں میں بھی شرکت کی۔ پروفیسر طلحہ رضوی برق دربھنگہ اپنے خویش پروفیسر رئیس انور کے یہاں آتے تو راقم الحروف سے بھی ملاقات ہوتی اور موصوف میرے والد صاحب کی خیریت ضرور پوچھتے اور ان کے کاموں کی ستائش کرتے۔ ان کی رحلت پر انہیں بے حد صدمہ ہوا جس کا اظہار روزنامہ ''قومی تنظیم'' پٹنہ مرقومہ ۱۴؍ ستمبر ۲۰۱۰ء میں بعنوان ''قطعہ تاریخ'' کیا ہے:

کیسی کیسی شکلیں نظر میں　　کتنی نازک کتنی حسیں ہیں
رشکِ حور و پری و غلماں　　مہر و شان و ماہ جبیں ہیں
وقتِ موعود آگیا جس دم　　بند لبانِ چنان و چنیں ہیں

روحیں پہنچیں عالمِ بالا　جسمِ خاکی زیرِ زمیں ہیں
پوچھو حیات و موت کا رشتہ　اُن سے جو لوگ اہلِ یقیں ہیں
زندگی خود ہے مرگ کا پرتو　دونوں ہی یک حجلہ نشیں ہیں
قیصر و کسریٰ اور کئے و جم　دیکھو تو وہ آج کہیں ہیں؟
عبرت عبرت عبرت عبرت　آسماں کتنے زیرِ زمیں ہیں
آنکھوں سے اٹھتا ہے پردہ　ہم بھی گویا باز پسیں ہیں
وَا اَسفَا ظفرالمنان آہ　کل تک تھے وہ آج نہیں ہیں
دوست، محبّ، اقران و اعزّہ　غم سے نڈھال اور اندوہگیں ہیں
صبر امام اعظم کو خدا دے　ان کے گئے پر سبھی غمگیں ہیں
کیا لکھوں تاریخِ رحلت　لگتا ہے وہ اب بھی یہیں ہیں
برقؔ سروشِ غیب یہ بولا　خاتمِ ذہن و دل کے نگیں ہیں
ظفر المنان فاروقی　جلوہ طرازِ خلدِ بریں ہیں

۱۷۴۹　+۲۶۱=۲۰۱۰ء

اسی طرح پروفیسر ثوبان فاروقی مرحوم (سابق صدر شعبۂ اُردو، آراین کالج، حاجی پور) نے راقم سے تعزیت کرتے ہوئے لکھا ہے:

"......گیندا بھائی کے انتقال پر ملال کی خبر بچوں کے ذریعہ ملی، بڑا قلق ہوا۔ اللہ مرحوم کی قبر کو نور سے بھر دے آمین ......تاریخ گوئی مستقل ایک فن ہے جس میں مجھے قطعی دستگاہ نہیں، پھر بھی کہہ گیا ہوں، شاید اس میں مرحوم کی روحانیت کا کچھ دخل ہو۔ قطعہ کی صورت یوں ہے:

یہ چرچا عالم بالا کے ہر گوشے میں تھا جاری　کہ ہوگئی اس مہینے اک بڑے انسان کی رحلت
خدا مرحوم کے پسماندگاں پر رحم فرمائے　بنی ہے آبلہ دل کا ظفر منّان کی رحلت"

(مطبوعہ روزنامہ "قومی تنظیم" پٹنہ، مورخہ ۱۶؍ستمبر ۲۰۱۰ء)

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی (وظیفہ یاب پروفیسر، شعبۂ اردو، تلکا مانجھی یونیورسٹی بھاگلپور) کئی بار دربھنگہ آچکے ہیں اور ان کا قیام عموماً میرے یہاں ہی ہوتا رہا ہے۔ میری نگرانی میں پی ایچ. ڈی. کا دوسرا وائیوا تھا جس کے ممتحن ڈاکٹر ہرگانوی تھے۔ جب وہ تشریف لائے تو رات کے قیام کے دوران اور صبح میں ناشتہ کے ٹیبل پر والد بزرگوار سے ان کی تفصیلی باتیں ہوئی تھیں اور وہ یقیناً ان سے متاثر ہوئے ہوں گے ورنہ ان کے انتقال کے بعد ان کی نوک قلم پر ایسے کرب آمیز اشعار نہیں آتے جو صحیح معنوں میں شخصیت اور مزاج کے عکاس ہیں :

گلشن میں غم ہے شور ہے وحشت ہے یاس ہے
عاشق کی فکر کا ابھی پنچھی اداس ہے

بادِ نسیم ظفر[1] سے رخصت ہوا خرام
کرتے تھے آندھیوں کا ہمیشہ ہی احترام

آنسو قلم کے بھیج رہا ہوں امام[2] کو
شبنم شکستہ حال ہے کرنیں ہیں تیز گام

القاب خیریت کے لبوں پر ہے خامشی
لفظیں لہو لہان ہیں مضمون تشنہ کام

مرجھا گئے ہیں صبح کی اب چہرگی کے پھول
بکھرے پڑے ہوئے ہیں شگوفوں کے ٹوٹے جام

گلشن میں غم ہے شور ہے وحشت ہے یاس ہے
عاشق کی فکر کا ابھی پنچھی اداس ہے

(مطبوعہ قومی تنظیم، پٹنہ، ۹/ اکتوبر ۲۰۱۰ء)

پروفیسر سید صابر حسن (شعبۂ اردو، بی. آر. اے. بہار یونیورسٹی، مظفر پور) نے اپنے مکتوب مرقومہ ۵/ ستمبر ۲۰۱۰ء میں راقم الحروف سے اس طرح سے تعزیت کی ہے:

> ''اخبار' پندار' میں آپ کے والد کے سانحہ ارتحال پر آپ کی ایک نظم میری نظروں سے گذری جو کہ سراسر آپ کے درد وغم اور آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی ہے۔ پڑھ کر طبیعت پریشان ہو اٹھی۔ ایک مربی، سرپرست اور شفیق باپ کے اچانک اٹھ جانے سے آپ حضرات کو ضرور ایک خلا محسوس ہو رہا ہوگا۔ خصوصی طور پر آپ کو ان کی کمی کا احساس ہوگا کیوں کہ ان کی موجودگی کی وجہ سے آپ کے علم وادب کا سفر جس ذوق وشوق مستقل مزاجی اور تیز گامی کے ساتھ جاری تھا اس میں یقیناً

[1] ظفر فاروقی مرحوم، [2] ڈاکٹر امام اعظم

خلل واقع ہوا ہوگا، پھر بھی باپ کی تربیت اور ان کی رہنمائی جو آپ کے ساتھ ہو چکی وہ انشاء اللہ ہمیشہ آپ کی زندگی کے دیگر امور میں آپ کی معاون اور آپ کے ادبی سفر میں آپ کی شریک سفر رہے گی۔''

ڈاکٹر ایم .اے .ضیاء مرحوم (سابق صدر شعبۂ اردو، گیا کالج، گیا) اپنے مکتوب مورخہ ۲ر ستمبر ۲۰۱۰ء میں اپنی تعزیت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''ادیب، شاعر، فنکار، آفیسر ہونا بڑی بات نہیں۔ بڑی بات یہ ہے کہ کسی شخص کی زندگی سے سماج اور معاشرہ کو کیا کچھ حاصل ہوتا ہے۔ فاروقی صاحب کی زندگی میں وہ انسانی ہمدردی کے تمام پہلو نمایاں ہیں جسے دیکھ کر ہر انسان متاثر ہوا اور میں بھی جب ان سے ملا تھا تو مجھے احساس ہوا کہ وہ دردمند انسان ہیں اور صرف اپنے دائرہ میں محدود رہنا نہیں چاہتے بلکہ سماج کے کام آنے میں انہیں بے پناہ سکون ملتا تھا جس کا ذکر وہ بڑی دلچسپی کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ میں انہیں فراموش نہیں کر سکتا کیوں کہ وہ مجھے بھی شفقت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اپنی رائے جو میرے لئے مفید ہوتی تھی دیتے تھے۔ اللہ انہیں غریق رحمت کرے۔ آمین۔''

جناب تشنہ اعجاز (مولانا حفظ الرحمٰن، خیر آباد، بگہا، مغربی چمپارن) ۱۱ر ستمبر ۲۰۱۰ء کے مکتوب میں اظہار تعزیت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کانپور بچی کے یہاں مقیم تھا کہ میرے بڑے صاحبزادہ سید ضیاء الرحمٰن عرفی نے بذریعہ فون مجھے مطلع کیا کہ آپ کا فون آیا تھا اور آپ نے میرا پتہ کیا، حال پوچھا اور ساتھ ساتھ یہ غم آلود خبر بھی آپ کے توسط سے ملی کہ آپ کے والد فاروقی صاحب قبلہ رحلت فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ حق مغفرت کرے۔ فاروقی صاحب قبلہ جنہیں مرحوم کہتے کلیجہ میں چوٹ سی لگتی ہے، وہ اس لائق تھے ہی کہ رمضان شریف کے مبارک مہینے میں وہ بھی مغفرت کے عشرہ میں داعی اجل کو لبیک کہیں۔ سب کو چھوڑ کر رحمت الٰہی کے آغوش میں چلے گئے۔ وہ صحیح حق پرست

تھے۔جن جگہوں پر وہ ڈیوٹی پر تعینات تھے اس علاقے کے لوگوں کو یہ جانکاہ خبر جب ملی تو سب لوگ سوگوار ہو گئے۔ان کی ایمانداری، سچائی، ہمدردی اور انصاف کو یاد کرنے لگے۔لوگوں کے اس اظہار افسوس پر مجھے فارغ بخاری کا ایک مشہور شعر یاد آ گیا: یاد آئیں گے زمانے کو مثالوں کے لیے/ جیسے بوسیدہ کتابیں ہوں حوالوں کے لیے۔اللہ تبارک وتعالی نے اس مبارک ماہ میں ان کو بلا لیا۔یہ کم خوش بختی کی بات ہے۔میری پہلی ملاقات جب مرحوم فاروقی صاحب نرکٹیا گنج میں تھے تو میرے چھوٹے بہنوئی حکیم اختر صاحب کے دواخانے میں جو جامع مسجد کے نیچے ہے وہیں ہوئی۔فاروقی صاحب جب عصر کی نماز پڑھ کر نکلتے تو دواخانے میں تشریف فرما ہوئے۔وہیں تعارف ہوا۔بڑے تپاک سے ملے اور خانقاہ کی خیریت پوچھی۔قبلہ والد مرحوم سے اپنی عقیدت ومحبت کا اظہار کیا۔ میں اس زمانے میں زیر تعلیم تھا۔چند مفید مشورے بھی دیئے۔ادھر آپ کے چھوٹے بھائی (سیّد خرم شہاب الدین) کی شادی جو مظفر پور میں ہوئی اس میں آنے کی تاکید بذریعہ فون پر کیا۔طبیعت کی خرابی اور موسم برسات کی شدت اپنے شباب پر تھی چاہ کر بھی نہ جا سکا۔ہائے فاروقی صاحب۔آپ نے کیسے کیسے کارہائے انصاف انجام دیئے۔آپ جہاں بھی رہے اپنے ایمان کو زمانے کی آلودگیوں سے بچائے رکھا۔اللہ تعالی آپ سب کو صبر جمیل عطا فرمائے اور ان کی سیرت پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین ثم آمین۔''

مولوی مشکور حسن علی نگری مرحوم (سابق،استاد مدرسہ حسینیہ، پکریا، کوشیشوراستھان، دربھنگہ) نے ایک شعری نشست میں والد محترم پر یہ نظم پڑھی:

گئے دارِ فانی سے دارالبقاء — تھے اعظم کے والد جو گیندا چچا

مقدر کے تھے وہ یقیناً دھنی — ملا دن بھی اُن کو تو رمضان کا

لب و لہجہ میں تھی عجب دلکشی — طریقہ نرالا تھا گفتار کا

خلوص و محبت کے پیکر تھے وہ سخن داں ، سخن ور تھے مردِ خدا
ظرافت طبیعت میں بھرپور تھی ذہانت کا تھا ان کے ڈنکا بجا
مقدر تھا چکھنا مزا موت کا مرے وقت پر خوب اچھا ہوا
خداوندا دے اُن کو جنت میں جا ملے ٹھنڈی ٹھنڈی بہشتی ہوا

مورخہ ۱۳/اکتوبر ۲۰۱۰ء کو مفتیِ اعظم ہالینڈ حضرت عبدالواجد نیر قادری (مرحوم) ان کی رحلت پر اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

''مجاہد ذیشان، انصاف و دیانت کی پہچان، اپنے اسلاف کی بربان جناب محمد ظفر المنان ظفر فاروقیؒ کا وصال پرملال نہ صرف اہل خاندان کیلئے وجہِ ابتلاء و امتحان ہے بلکہ ہزاروں ہزار ستم زدہ اور دُکھیا دلوں کیلئے غم و اضطراب کا طوفان ہے۔ لیکن جناب مرحوم محمد ظفر المنان ظفر فاروقی کی تاریخ رحلت اور ماہِ وصال کی عظمتوں برکتوں کو دیکھ کر اطمینان و سکون ملتا ہے کہ مولی کریم نے ان پر خاص رحم و کرم فرمایا کہ ماہ رحمت اور تاریخ مغفرت (۱۳/رمضان المبارک) میں انہیں اپنے جوارِ قدس میں بلا کر نہال فرمایا۔

سرورِ کائنات علیہ التحیۃ والتسلیمات کا ارشادِ گرامی ہے کہ:

''جو مسلمان رمضان المبارک میں مرتا ہے وہ سوالات قبر سے محفوظ رہتا ہے''
اور جو سوالات قبر سے محفوظ رہا وہ عذابِ قبر سے بھی محفوظ رہے گا۔ اور قبر منزل آخرت کی پہلی سیڑھی ہے۔ جس کی پہلی سیڑھی امن و امان سے گزر گئی انشاء اللہ تعالیٰ آخرت کے آئندہ امتحانات بھی بخیر و خوبی گذر جائیں گے۔''

موصوف مزید فرماتے ہیں:

''زندگی کے آخری برسوں میں جبکہ مرحوم محمد ظفر المنان ظفر فاروقی ریٹائرڈ ہو چکے تھے تو میں نے دیکھا تھا کہ وہ نماز جمعہ سے بہت پہلے شاہی جامع مسجد قلعہ گھاٹ دربھنگہ کی صف اول میں اپنی جگہ بنا کر بیٹھ جاتے اور سرّی ذکر میں مشغول ہو جاتے

تھے۔ جب علماء کی تقریریں ہوتیں تو متوجہ ہوکر غور وفکر سے سنا کرتے۔ نماز جماعت کے بعد صلوٰۃ سلام میں شریک ہوتے۔ تقریر کے بعض جملوں کی وضاحت علماء سے چاہتے۔ پھر امام وعلماء اور مصلّیوں سے مصافحہ کے بعد مسجد سے نکلتے۔ احادیث مبارکہ میں سعید وشقی کی پہچان یہی بتلائی گئی ہے کہ جو فطری وجبلی طور پر سعید ہوتا ہے وہ مرنے سے قبل نیکی وسعادت کی راہ پر گامزن ہو جاتا ہے اور جو شقی ہوتا ہے وہ مرنے سے قبل نیکی کی راہ سے دور اور شقاوت سے قریب ہو جاتا ہے۔ لیکن ممدوح موصوف جناب محمد ظفر المنان ظفر فاروقی اپنے دور ملازمت اور ریٹائرڈ ہونے کے بعد بھی نیکیوں میں سبقت کرتے اور ستم زدوں کی حتی الامکان مدد کرتے رہے گویا ان کی زندگی پولس لائن میں رہتے ہوئے بھی آدمیت سے بھرپور اور انسانیت کا مجسمہ تھی۔ میری دعا ہے کہ مولیٰ تبارک و تعالیٰ انہیں اپنے جوار رحمت ومغفرت میں جگہ دے اور ان کے تمام پسماندگان کو صبر جمیل عنایت فرمائے۔ آمین۔"

مدرسہ قدرتیہ شکری کے سابق پرنسپل ڈاکٹر عالمگیر شبنم اپنے تاثرات مکتوب مرقومہ ۸/ اکتوبر ۲۰۱۰ میں اس طرح پیش کرتے ہیں:

"ایک حدیث: موت العالم موت العالم. مذکورہ حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ ایک عالم کی موت پورے کائنات کی موت کے مترادف ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایک اعلیٰ انسان کی موت بھی پورے معاشرہ کا خسارہ ہے۔ مرحوم محمد ظفر المنان ظفر فاروقی کی موت کو بھی اس تناظر میں دیکھنا چاہئے۔ مرحوم نہایت اعلیٰ اخلاق کے حامل تھے سخاوت ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ملت کا بے پناہ درد ان کے سینہ میں موجزن تھا جن دنوں وہ 'وینی' (پوسا روڈ) وستی پور تھانہ میں بحیثیت پولیس آفیسر تعینات تھے میں نے بارہا ان کو دیکھا کہ وہ ملت کے دو افراد کو لڑتے دیکھنا قطعی پسند نہیں کرتے تھے اور دونوں کو بلا کر صلح وصفائی کرادیا

کرتے تھے۔ ملت کے افراد کے درمیان وہ اس بات کی تلقین کرتے رہتے تھے کہ مسلمانوں کو اپنے مسائل کو آپس میں سلجھالینا چاہئے۔ ملت کا پیسہ کورٹ، کچہری کی نذر ہو وہ اس کو قطعی برداشت نہیں کرتے تھے۔ ادب سے ان کو بے پناہ لگاؤ تھا۔ غالباً ۱۹۸۳ء میں مدرسہ اسلامیہ شاہ پور بگھونی (ضلع سمستی پور) میں ایک مقامی مشاعرہ کی صدارت کر رہا تھا۔ اس وقت وہ 'وینی' (پوسا روڈ) میں بحیثیت پولیس آفیسر تعینات تھے۔ جب ان کو مشاعرہ کی خبر ملی وہ مشاعرہ گاہ پورے یونیفارم میں پہنچے اور سرگوشی میں مجھ سے فرمایا کہ میں اپنا کلام سنانا چاہتا ہوں۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ شوق سے اپنا کلام پیش فرمائیں۔ پھر وہ شیروانی اور پاجامہ پہن کر اسٹیج پر تشریف لائے اور اپنی دوغزلیں پیش کیں جن کو سامعین نے بہت پسند کیا۔ مرحوم موصوف اب اس دنیا میں نہیں رہے مگر ان کی نیکیاں ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ ان کے بڑے فرزند ڈاکٹر امام اعظم (ریجنل ڈائریکٹر مانو، دربھنگہ) بالکل ان کی کاپی ہیں۔ مجھے پوری امید ہے کہ وہ ہمیشہ ان کو ایصال ثواب کرتے رہیں گے۔ دعاء گو ہوں کہ اللہ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عنایت فرمائے۔ اور پسماندگان کو صبر جمیل۔ ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین آباد۔"

بزرگ شاعر و ادیب علقمہ شبلی (کولکاتا) اپنے مکتوب مرقومہ ۲۹ر ستمبر ۲۰۱۰ء میں اظہار تعزیت کرتے ہیں:

"پرسوں کے "قومی تنظیم" پٹنہ میں آپ کا مضمون دیکھا جس سے پتہ چلا کہ آپ کے والد محترم جناب محمد ظفر المنان ظفر فاروقی اب دنیا میں نہیں رہے اور آپ لوگوں کو داغِ مفارقت دے گئے۔ والد کا سایہ سر پر بہت غنیمت ہوتا ہے اور زندگی میں ہر گام پر ان سے تقویت اور رہنمائی ملتی ہے۔ ان کا رخصت ہو جانا ایک بڑا سانحہ ہوتا ہے مگر ہم مشیت ایزدی کے سامنے مجبور محض ہیں۔ خدا مرحوم

کو اپنی رحمتوں سے نوازے اور آپ لوگوں کو صبر جمیل کے ساتھ ساتھ ان کے
نقوش قدم پر چلنے کا حوصلہ دے۔''

جناب سیف رحمانی (سابق پی.آر.آئی. پوسٹل، دربھنگہ مقیم اسلام نگر رسول پور، دربھنگہ) اپنے مکتوب مورخہ ۲۰/اکتوبر ۲۰۱۰ء میں اظہار تعزیت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جمال ہاشمی نے آپ کے والد محترم کے سانحۂ ارتحال کی روح فرسا خبر دی۔ میں گھر تھا۔ اللہ انہیں غریق رحمت کرے اور کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ آمین ع پیڑ پتوں سے بچھڑ جائے تو کیا رہ جائے گا۔ میں آپ کے غم کو شدت سے محسوس کر رہا ہوں۔ بانٹ تو سکتا نہیں تسکینی جملوں کا ایسی حالتوں میں فقدان ہو جاتا ہے۔ اپنی کم مائیگیٔ الفاظ پہ نادم ہوں۔''

ڈاکٹر مسلم شہزاد مرحوم (بزم کہکشاں، نرکٹیا گنج، مغربی چمپارن) مورخہ ۹/نومبر ۲۰۱۰ء کو 'یادش بخیر' کے عنوان سے تعزیت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''گذشتہ ۱۳/رمضان کو میں کسی دینی کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھا کہ اچانک موبائل بج اٹھا۔ کان سے لگایا تو برادرم فیض الحسن فیض نے یہ جاں سوز اور جانکاہ خبر دی کہ محترم فاروقی صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ رگ رگ میں صدمے کی ایک لہر سی دوڑ گئی اور آنکھوں میں آنسوؤں کی اک موج سی تیر گئی۔ حیف صد حیف! کہ دیارِ انسانیت کا وہ روشن چراغ گل ہو گیا جس کی بے ریا اور بے لوث روشنی سے گوشہ گوشہ اجاگر تھا۔ موت بلاشک برحق ہے اور سب کی موت ہونا طے ہے مگر کچھ موت ایسی بھی ہوتی ہے جو اپنے پیچھے مرنے والے کا نیک نام چھوڑ جاتی ہے جو تا قیامت خاص و عام کی زبان پر بار بار آتا رہتا ہے۔ کچھ اس طرح کی موت فاروقی صاحب کی بھی تھی اور شاید اسی طرح کی موت کے بارے میں غالب نے کہا ہے:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

مرحوم سے میرے اچھے مراسم تھے۔ جب ان کی تقرری نرکٹیا گنج تھانے میں تھی رمضان کے بعد میں اس پرانے مراسم کو نشاۃ ثانیہ کرنے کو سوچ رہا تھا کہ یہ سانحہ ہوگیا۔ اب عالم یہ ہے کہ قلم کانپ رہا ہے، کاغذ بھیگ رہا ہے، خراج عقیدت کے الفاظ کہاں سے لاؤں۔ بس خدا سے دعا ہے مرحوم کی قبر کو سدا اپنے نور سے پرنور رکھے اور انہیں جنت الفردوس عطا کرے:

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گذر گیا　　　کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے"

معروف افسانہ نگار اور ادیب ڈاکٹر مجیر احمد آزاد (محلّہ: فیض اللہ خاں، حامد کالونی، پوسٹ: لال باغ، دربھنگہ-۸۴۶۰۰۴، بہار) ان کی رحلت پر اظہارِ تعزیت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"میں محترم محمد ظفر المنان ظفر فاروقی (مرحوم) سے کئی دفعہ ملا ہوں۔ جب بھی ڈاکٹر امام اعظم صاحب سے ملنے ان کے گھر (گنگوارہ) گیا، ان کے والد محترم جناب فاروقی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اکثر ان کو مطالعے میں منہمک پایا، کبھی مکان کے باہر احاطے میں کرسی پہ بیٹھے ہوئے تو کبھی کمرے میں۔ وہ ملنسار، خلیق اور نرم گفتار تھے۔ پولیس محکمے میں طویل ملازمت کے باوجود گفتگو میں شائستگی اور آداب واطوار کے دھنی تھے۔ میں ان کے مطالعے کے طریقے سے متاثر تھا۔ وہ رسائل کو پڑھتے ہوئے جگہ جگہ نشان لگا دیتے تھے۔ قابل گرفت باتوں کی نشاندہی کرتے اور اچھی تحریر کی دل کھول کر داد دیتے تھے۔ میرے پاس ان کے مطالعے میں رہ چکا "تمثیل نو" دربھنگہ کا ایک شمارہ موجود ہے جو ان کی اس عادت کا ثبوت ہے۔ ذاتی طور پر مجھے عزیز رکھتے تھے۔ میری مطبوعہ تحریروں (بطور خاص "تمثیل نو" میں شائع) کو پسند فرماتے اور ہمت افزائی کیا کرتے تھے ساتھ ہی ساتھ زیادہ سے زیادہ مطالعے کی ترغیب دیتے۔ انہیں اردو کے نمائندہ شعراء کے بہت سے اشعار یاد تھے۔ ان کو شاعری سے بھی دلچسپی تھی۔ قوم وملت کے ہمدرد تھے اور عملی طور پر مسلمانوں کی بہبودگی چاہتے تھے۔ اللہ ان کی خطاؤں کو درگزر کرے اور کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آمین!

یہاں ان کے لائق و فائق فرزند ارجمند ڈاکٹر امام اعظم کی اپنے والد محترم سے محبت، فرماں برداری اور حسن سلوک کا ذکر نہیں کرنا ناانصافی ہوگی۔ انہوں نے والد صاحب کی آخری سانس تک خدمت کی۔ اللہ ان کو اجر دے۔ آمین!''

ڈاکٹر سرور کریم (صدر، شعبۂ اردو، آر این اے آر کالج، سمستی پور) اپنی تنقیدی و تحقیقی کتاب ''دربھنگہ کا ادبی منظرنامہ: ڈاکٹر امام اعظم کی ادبی و صحافتی خدمات کے حوالے سے'' میں والد بزرگوار کا ذکر اس طرح سے کرتے ہیں:

''محمد ظفر المنان ظفر فاروقی عمر بھر اپنے اصولوں پر قائم رہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس علاقے میں بھی رہے، وہاں کے سماجی ٹھیکے داروں اور سیاسی مافیاؤں کیلئے ان کی ذات نفع بخش ثابت نہیں ہوتی تھی جس کا اثر ان کے افسران اور ماتحتوں پر بھی پڑتا تھا۔ ایسے لوگ اپنے رسوخ کا استعمال ان کے خلاف کیا کرتے تھے۔ لہٰذا ان کا تبادلہ مقررہ معیاد سے قبل ہی ہو جایا کرتا تھا۔ اپنی ملازمت کے سلسلے میں وہ مختلف جگہوں پر پوسٹیڈ رہے اور ہر جگہ انہوں نے اپنی امتیازی شناخت قائم کی۔'' (ص:۱۴۵ مطبوعہ ۲۰۱۶ء)

استاد شاعر اور ادیب حلیم صابر نے رباعیات کے ذریعہ والد بزرگوار کو اس طرح خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

ذی قدر و ذیشان ظفرؔ فاروقی تھے نیک خو انسان ظفرؔ فاروقی
کرتے تھے احترام ہر مذہب کا تھے ایسے مسلمان ظفرؔ فاروقی

......

تھے آپ مساوات و اخوت کے امیں تھا بغض و تعصب کا اثر ان میں نہیں
شاعر بھی تھے وہ اور پولیس افسر بھی اک نیکو سیرت مردِ خندہ جبیں

......

قانون پہ رکھتے تھے نظر فاروقی مجرم کی بھی لیتے تھے خبر فاروقی
وہ اک پولس افسر کے علاوہ صابرؔ تھے شاعرِ خوش فکر ظفرؔ فاروقی

نوجوان شاعر اور ادیب ڈاکٹر احمد معراج اپنے قطعہ میں انھیں اس طرح خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں:

پولس افسر بھی تھے شاعر بھی تھے وہ | تھے دونوں خوبیوں کے آپ پیکر
ظفرؔ فاروقی تھے اک ایسے انساں | کرے انسانیت بھی ناز جن پر

والد بزرگوار کا شعر و ادب سے والہانہ لگاؤ اس بات کا غماز ہے کہ انھوں نے اپنی ملازمت کے دوران مختلف موقعوں پر شعری محفلوں میں کلام پیش کیا نیز دربھنگہ سے نکلنے والے ہندی فولڈر ''تمثیل'' میں بھی ان کی چند غزلیں شائع ہوئیں۔ ان کی دستیاب غزلیں (بشمول ۳ رطرحی غزلیں) نموتاً ملاحظہ ہوں :

(۱) طرحی غزل (بر مصرعۂ خواجہ حیدر علی آتش)

تسلسل خواب کا ٹوٹا کہاں ہے | کسی کافر نے سب لوٹا کہاں ہے
نہیں پہنچا ہے کوئی مے کدہ تک | ابھی جام و سبو ٹوٹا کہاں ہے
سلگتی ریت پر اے چلنے والو! | تمہارا کارواں چھوٹا کہاں ہے
دریچے کھول کر باہر نہ جھانکو | فضا فرعون ہے، موسیٰ کہاں ہے

ظفرؔ بھی حسنِ ذاتی کا ہے قائل
''قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے''

....

(۲) طرحی غزل (بر مصرعۂ خواجہ حیدر علی آتش)

نصیب اپنا ابھی پھوٹا کہاں ہے | ترا دامن ابھی چھوٹا کہاں ہے
پرستارِ تکلف سے یہ کہہ دو | ''قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے''
صلہ کیوں کر ملے گا عاشقی کا | شکستہ دل ہوا، ٹوٹا کہاں ہے
جو صادق ہیں خدا کے نیک بندے | انھیں ہم نے کہا جھوٹا کہاں ہے

ظفرؔ خود لٹ گیا ہے عاشقی میں
کسی معشوق نے لوٹا کہاں ہے

(۳) طرحی غزل

''حیا آتی ہے ہم کو بھی حیا سے'' وہ سمجھیں یا نہیں سمجھیں بلا سے
ہمیشہ موت سے جو کھیلتے ہیں انھیں آخر لگے ڈر کیوں قضا سے
کرم کر گیا ہے دستِ اکرم بھلا مانگیں گے اب ہم کیا خدا سے
ہے اپنی زندگی اس کی امانت نہیں راہِ مفر اس کی رضا سے

ظفریابی ملی ہے اس ظفؔر کو
جو روشن دل ہوا اس کی ضیا سے

....

(۴) غزل

بڑھ کر اسے خود میں نے سینے سے لگایا ہے پیغام محبت کا جس نے بھی سنایا ہے
غیروں پہ نہ اپنوں پر الزام لگایا ہے خود اپنی ہی مرضی سے گھر اپنا جلایا ہے
مخلص نظر آتا ہے دنیا میں کہاں کوئی ملتے ہوئے ہنس ہنس کر ہر شخص کو پایا ہے
جو آگ لگائی تھی اک شوخ ستم گر نے اس جلتے ہوئے دل کو اشکوں سے بجھایا ہے
کس طرح بچائے گا ناموسِ وفا کوئی جب اپنے ہی سر پر خود ابلیس کا سایا ہے

ہر آن محبت میں اس نے ہی دیا دھوکا
جس کو بھی ظفؔر اپنا ہمراز بنایا ہے

....

(۵) غزل

روٹھے ہوئے لوگوں کو منانے کے لیے آ الفت کے چراغوں کو جلانے کے لیے آ
ہم ایک ہیں ہم ایک رہیں گے یہ بتا دے نفرت کے اندھیروں کو مٹانے کے لیے آ
میں نے تو کئی خواب یہاں دیکھے ہیں لیکن ان خوابوں کو سچ کر کے دکھانے کے لیے آ
جن باتوں نے ہم دونوں کو کچھ دور کیا تھا ان باتوں کو اک بار بھلانے کے لیے آ
غم ہی کے سبب گھر میں اداسی ہے مرے اب خوشیوں کے لیے ہنسنے ہنسانے کے لیے آ

ہے موسمِ گل اس میں بھی کیوں تشنہ لبی ہو　　　محفل ہے جواں پینے پلانے کے لیے آ

تیرے ہی لیے عمر گذاری ہے ظفؔر نے
ارماں ہے کہ سینے سے لگانے کے لیے آ

....

غزل (۶)

(بموقع ٹرافک ہفتہ ۲۴ رتا ۳۰ ردسمبر ۱۹۸۷ء بمقام دربھنگہ
مطبوعہ ہندی فولڈر "تمثیل" دربھنگہ شمارہ:۶)

آپ ہیں پرساشن کے گورو، آپ بڑے انسان لگے
آپ کے اندر کام کی دھن ہے، ہر مشکل آسان لگے

موٹر بائک پر چلنا ہو تو ہیلمٹ سر پر رکھو
جو بھی اتنی بات نہ سمجھے وہ مجھ کو نادان لگے

راہوں میں اوروِدھ کھڑے کرنا بھی جرم ہے اے لوگو
بیچ شہر میں سڑکوں پر نہ اب کوئی دوکان لگے

جب سے سڑکوں کے نیموں کا پالن کرنے آیا ہے
شہر کے حاکم کا ہم کو فرمان بھی اک احسان لگے

شہر میں سکھ اور چین کے دن ہیں، رات میں ہے آرام ظفؔر
غنڈہ گردوں کے سب اڈے سونے اور ویران لگے

میرے والد ۱۹۸۳ء میں ٹاؤن تھانہ سمستی پور میں تعینات تھے۔ اس دوران دولت مشترکہ ممالک کے سربراہان کی کانفرنس نئی دہلی کے وگیان بھون میں ۳۰ رنومبر ۱۹۸۳ء کو منعقد ہوئی جس میں ملک بھر کے ہر صوبے سے سینئر پولس افسروں کو نامزد کر کے بھیجا گیا تھا۔ ان افسران میں محمد ظفر المنان ظفر فاروقی مرحوم بھی شامل تھے۔ اس کانفرنس اور سفرِ دہلی کے حوالے سے انھوں نے ایک نظم بھی کہی جو اس طرح ہے:

سربراہانِ مملکت کانفرنس

عزائم نیک تر ہوں تو مسرت اس کو کہتے ہیں
صداقت اس کو کہتے ہیں، محبت اس کو کہتے ہیں
ہر اک آغاز کا بہتر بجا انجام ہوتا ہے
مکمل اک لگن سے زندگی میں کام ہوتا ہے
نہیں لازم کسی عنوان اپنے کام میں غفلت
اسی باعث تو ہوتی ہے فضیلت اور کچھ عظمت
خوشا جب سربراہانِ وطن دہلی میں آئے تھے
ترقی کی شعائیں دل میں اپنے ساتھ لائے تھے
نئی کچھ منزلیں دیکھی ہیں ہم نے شادکامی سے
دعائیں افسروں کی رنگ لائیں کامیابی سے
چلے تھے اپنے صوبے سے جمعیت ساتھ میں لے کر
پولس افسر مہرباں تھے، تھا ان کے ساتھ میں لشکر
ہراک صوبے سے اک دستہ پولس والوں کا آیا تھا
نظام الدینؒ میں سرکار نے خیمہ لگایا تھا
ہماری ڈیوٹی اور کام سے سب افسرِ بالا
بہت ہی مطمئن اور شادماں تھے شکر ہے اس کا
ہمارے نظم میں تھی افسروں کی ایک دانائی
کوئی خامی، کوئی بے ضابطگی ہرگز نہیں پائی
خوشا دہلی میں خیموں کا بہت اچھا سلیقہ تھا
تناول اور رہائش کا بڑا بہتر قرینہ تھا
نومبر کا مہینہ، سن تراسی کام آیا ہے
یقیناً ملک پر اپنے یہ اک قدرت کا سایہ ہے
بسوں کے واسطے ہم کو دیے تھے پاس رکھنے کو
سہولت تھی بجا دہلی میں ہر اک سمت چلنے کو
ہراک کے پاس پہ تصویر چسپاں تھی مسافر کی
بلاتخصیص ہر اک ماتحت اور اس کے افسر کی
ملازم مستعد، ہر آدمی کا حوصلہ پختہ
شفاخانہ بہت ہی خوب تھا، پھر اک کچن اچھا
ہم اپنا فرض پورا کرکے بے شک شادماں لوٹے
خوشی ہے پھر وطن کو آج اپنے کامراں لوٹے

مسافت ہم کو دہلی کی یقیناً راس آئی ہے
کیا ہے فرض پورا، دل کی حسرت رنگ لائی ہے

ان کے شعری اظہارات ہمیں متاثر کرتے ہیں۔ خاص طور پر ان کی تہنیتی نظمیں اپنے پن کا احساس دلاتی ہیں۔ یہاں شعری پیکر دل کو چھوتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے قطعات اور تہنیتی نظمیں :

پائے برکت

مرے اعظم اِ رہے سلامت تو
اوج پہ ہو ترا مقدر بھی
اور دلہن کی پائے برکت سے
مثلِ گلزار ہو مرا گھر بھی

(تہنیتی نظموں کا مجموعہ ''آرزو کے گلاب'' مرتب: ایم اے ضیا ۲۸؍دسمبر ۱۹۸۸ء ص:۶)

مبارک آبگینوں کا یہ شہرِ جلوہ سامانی نسیمِ صبح لائی ہے جو یہ جلوؤں کی تابانی
مبارک ہو شگئیؔ ۲ شاہراہِ آرزو تجھ کو ''زہے یہ عزت افزائی، زہے تشریف ارزانی''
(تہنیتی نظموں کا گلدستہ ''حیاتِ نو'' مرتب: حسن آرزو ص:۲)

....

سہرا

اے مرے لختِ جگر، اے ہاشمی ۳ نورِ نظر ہے دعا تازہ رہیں سہرے کے گل بھی عمر بھر
آرزو تھی ایک دن نوشہ بنا دیکھوں گا میں فرض اپنا اس طرح اک دن ادا کردوں گا میں
احمدِ مرسلؐ کی سنّت بھی ادا ہوجائے گی اور خوش بختی بھی سہرے پر فدا ہوجائے گی
زندگی کا یہ سفر خوابوں سے بھی رنگین ہو ہر دعا مقبول ہو، ہر لب پہ بس آمین ہو
راحلہ ۴ جیسی تجھے اک ہم سفر بھی مل گئی اے عطا ۵ بھائی تمنا کی کلی بھی کھل گئی
دادی ماں خلدِ بریں سے دیکھ کر مسرور ہیں اور امی جان بھی خوشیوں سے اب مخمور ہیں
ایسے لمحے زندگی میں ہاشمی ملتے نہیں جس جگہ خود آسماں چوما کرے آکر زمیں
اوج پر تقدیر ہے اور بام پر ہے آرزو اب فرشتے بھی بلائیں لے رہے ہیں باوضو
میرا عالم ہے کہ سہرا چومتا ہوں بار بار وجد کا عالم یہ ہے میں جھومتا ہوں بار بار
سربسجدہ ہوں خدا کی کبریائی دیکھ کر محوِ حیرت ہوں خدا کی یہ خدائی دیکھ کر

اے ظفرؔ سب کو مبارک ہو یہ شادی کا سماں
ہے بزرگوں کی عنایت اور خدا بھی مہرباں

(تہنیتی نظموں کا مجموعہ ''نیا سفر نخلِ نرگس'' مرتب: ڈاکٹر امام اعظم ۲۶ مارچ ۲۰۰۰ء ص:۱۳)

....

خوشیوں کے لمحے

ترے سر پہ سہرا سلامت رہے دعا ہے مری تری زندگی مثلِ جنت رہے دعا ہے مری
اے خرم ۶، نفیسہ بھی شریکِ حیات تری بن گئی ہمیشہ دلوں میں محبت رہے، دعا ہے مری
مری آرزو آج پوری ہوئی خدا کا ہے شکر نہ دل میں کوئی تیری حسرت رہے، دعا ہے مری

یہ سہرے کے پھولوں کی نازک لڑی یہ منظر حسیں نگاہوں کی ٹھنڈک کی صورت رہے، دعا ہے مری
یہ خوشیوں کے لمحے رہیں عمر بھر ہے یہ آرزو تری زندگی پرمسرت رہے ، دعا ہے مری
یہ شادی کا جوڑا، یہ گجرے کے پھول نشانی بنے یہی تازگی ، یہ ملاحت رہے ، دعا ہے مری
خوشی کی یہ گھڑیاں رہیں دائمی ظفرؔ کر دعا
ترے سر پہ والد کی شفقت رہے، دعا ہے مری
(تہنیتی نظموں کا مجموعہ ''رنگِ گلہائے چمن'' مرتب: ڈاکٹر امام اعظم ۷ا/اکتوبر ۲۰۰۷ء)

خوشی کی گھڑی

یہ شادی کا دن لے کر آیا خوشی ہے نیا اک سفر ہے ، نئی زندگی ہے
فراز ۸؎ اب تجھے ہم سفر مل گئی ہے یہ ساعت بڑی ہے، خوشی کی گھڑی ہے
فرازِ حسیں کے ہے سر پہ جو سہرا وہ الیاس ۹؎ مرحوم کی روشنی ہے
مبارک ہو اے فاطمی ۱۰؎! جشنِ شادی دعائے محبت کی اک اک لڑی ہے
سلامت رہیں لب پہ بس یہ دعا ہے نبیؐ کی ہے سنت ، کہ اک بندگی ہے
اے راشد ۱۱؎ میاں! کھل گیا ہے مقدر تری فاطمہ ۱۲؎ آج دلہن بنی ہے
ظفرؔ ہاتھ اپنے دعا کو اٹھائیں
لو رحمت خدا کی برسنے لگی ہے

(تہنیتی نظموں کا مجموعہ ''نغمات کی موجیں'' مرتب: ڈاکٹر امام اعظم ۶/نومبر ۲۰۰۸ء، ص:۱۳)

محترمہ نرمل کور(آئی پی ایس ۔ ایس پی، دربھنگہ) کے تبادلہ کے موقع پر ۱۹۸۸ء میں دی گئی الوداعی تقریب میں والدمرحوم نے درج ذیل سپاس نامہ پیش کیا تھا۔ ملاحظہ کیجئے:

الوداع

اے فاروقی میں کہ کیسے الوداع کہہ دوں، بہت غم ہے وداعی کی خبر سے شہر میں ہر آنکھ پرنم ہے
تھی ان کی ذات اصول وفرض کی منہ بولتی تصویر بدل ڈالی تھی جس نے ان پولیس والوں کی ہی تقدیر
کوئی حاکم بھی ایسا میری نظروں سے نہیں گذرا کبھی نے قدر کی جن کی وہ چاہے ہو بڑا چھوٹا

اے نرمل کور! کوئی آپ کو کیسے بھلائے گا	عمل انصاف کا پہلو ہمیشہ یاد آئے گا
پولیس والوں کے دل میں آپ نے جو گھر بنایا ہے	جو پرساشن کا سیدھا مارگ ہم سب کو دکھایا ہے
اسی رستے پہ چل کر کامیابی ہم بھی پائیں گے	جو درشن آپ نے ہم کو دیے ہیں، یاد آئیں گے
کسی کو بھی شکایت آپ سے شاید رہی ہوگی	یقیں ہے آپ کی تعریف دشمن نے بھی کی ہوگی
حکومت بھی تھی خوش اور شہر کا ہر آدمی تھا خوش	ہر اک کے کام آپ آئیں اس سے ہر کوئی تھا خوش
وہ موقع زلزلہ کا ہو کہ ہو سیلاب کا موقع	ہو چاہے مسئلہ قانون کا یا آپسی جھگڑا
ہر اک موقع پہ بے خوف وخطر میدان میں آئیں	شجاعت کا لبادہ اوڑھ کر میدان میں آئیں
جدائی کی گھڑی آئی ہے یہ دل اپنا پریشاں ہے	گناؤں کیا کہ کتنا آپ کا ہم سب پہ احساں ہے

مگر جاتے ہوئے دے دیجیے اپنا بھی آشیرواد
نئی منزل مبارک ہو، نیا عہدہ مبارک باد

والدِ محترم کی رحلت پر سینکڑوں کی تعداد میں ملک اور بیرونِ ملک سے ہر مکتبۂ فکر کے معززین و اکابرین نے تعزیت کرتے ہوئے اپنے رنج وغم کا اظہار کیا۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جن سے میرے والد صاحب کی دیرینہ شناسائی تھی اور بیشتر ایسے بھی تھے جن سے ان کا صرف غائبانہ تعارف تھا۔ مضمون کا اختتام میں اپنی نظم ''والدِ محترم کی یاد میں'' سے کرنا چاہتا ہوں جو میرے دوسرے شعری مجموعہ ''نیلم کی آواز'' (مطبوعہ ۲۰۱۴ء) میں شامل ہے:

والد کے انتقال پہ روتا رہا ہوں میں
دامن کو آنسوؤں سے بھگوتا رہا ہوں میں

مجھ سے جدا وہ ہو گئے لیکن یہ ہے ضرور	اب بھی مری نگاہ میں ہے ان کا روئے نور
والد کی شفقتوں کا ہوا سایہ مجھ سے دور

مجھ کو یقین ہوتا نہیں وہ گذر گئے	لگتا نہیں ہے مجھ کو کہ وہ چھوڑ کر گئے
میری نگاہ سے وہ فقط پردہ کر گئے

دشوار راستوں سے گزرنے کے واسطے	بحرِ الم سے مجھ کو ابھرنے کے واسطے
آئے ہیں تعزیت سبھی کرنے کے واسطے

دنیا کے اس نظام میں لگتا نہیں ہے دل　　اب تو کسی مقام میں لگتا نہیں ہے دل
اب کوئی پل بھی کام میں لگتا نہیں ہے دل

دنیا میں ہر عروج کو ہے ایک دن زوال　　ہر دامنِ خوشی سے ہے لپٹا ہوا ملال
ہر زندگی کے سامنے ہے موت کا سوال

گذرے ہوئے پلوں کو نہیں نیند آئے گی　　خوابیدہ مرحلوں کو نہیں نیند آئے گی
خوش رنگ سلسلوں کو نہیں نیند آئے گی

والد کی خوبیوں کو بیاں کیسے میں کروں　　اب جمع ان کے نقش ونشاں کیسے میں کروں
لوگو! بیان دردِ نہاں کیسے میں کروں

وہ تھے تو زندگی کے مسائل سے دور تھا　　خود اپنی ذات ہی کے میں نشہ میں چور تھا
سایہ پدر کا تھا مجھے حاصل سرور تھا

ماہِ صیام گذرا نہیں وہ گذر گئے　　میں نے جو خواب دیکھے تھے وہ سب بکھر گئے
مجھ کو تو کیا زمانہ کو غمگین کر گئے

ان کے بغیر دیکھوں گا جب بھی ہلالِ عید　　آئے گی یاد ماضی کی ساری مثالِ عید
کچھ اور بھی رلائے گا مجھ کو خیالِ عید

والد کے انتقال پہ روتا رہا ہوں میں
دامن کو آنسوؤں سے بھگوتا رہا ہوں میں

حواشی : ۱ ڈاکٹر امام اعظم (نوشہ)، ۲ حسن مثنیٰ (نوشہ)، ۳ سید ظفر اسلام ہاشمی (نوشہ)، ۴ راحلہ نوشابہ (دلہن)، ۵ ڈاکٹر عطا کریم شوکت (دلہن کے والد)، ۶ سید خرم شہاب الدین (نوشہ)، ۷ نفیسہ مہر (دلہن)، ۸ ڈاکٹر فراز فاطمی (نوشہ)، ۹ محمد الیاس اشرف (نوشہ کے دادا)، ۱۰ محمد علی اشرف فاطمی (نوشہ کے والد)، ۱۱ محمد راشد علی شیخ (دلہن کے والد)، ۱۲ ڈاکٹر فاطمہ راشد شیخ (دلہن)

❖❖❖

پیش خدمت ہے کتب خانہ گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے
https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
0307-2128068
@Stranger

اکیسویں صدی میں آزاد غزل گو شاعرات

آزاد غزل کا نام آتے ہی کچھ لوگوں کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور کچھ لوگ مراقبے میں چلے جاتے ہیں۔ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ 'آزاد غزل' اچھوت صنف سخن ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ آزاد غزل کا پرچم مظہر امام کیوں لے کر چل رہے تھے۔ ایسی بات نہیں کہ کسی کو مظہر امام سے ذاتی دشمنی ہے۔ بات اصل یہ ہے کہ تجربے کے لئے ہمارے اردو تنقید نگاروں کے یہاں گنجائش ہی نہیں ہے حالانکہ ادب کا کوئی فارم جامد اور اٹل ہو ہی نہیں سکتا۔ ہیئتی تبدیلیاں ادب کے لئے ناگزیر ہیں۔

تجربے سے انکار کرنا تجربے کو قبول نہ کرنا دونوں ایسی باتیں ہیں جس میں ایک بات مشترک ضد کی ہے کیوں کہ بعض لوگ روایت کی اس قدر قید و بند میں زندگی گزارتے ہیں کہ اس میں کوئی تبدیلی خواہ اچھی ہی کیوں نہ ہو برداشت نہیں کرتے۔ 'آزاد غزل' کا مسئلہ محض تجربہ نہیں بلکہ اس کی ایک روایت ہے۔ جس نے اردو شاعری سے اپنا رشتہ کسی طور بھی رکھا ہو اور بالخصوص غزل سے اس کا تعلق رہا ہو، انہوں نے بھرتی کے الفاظ اپنے شعر میں ضرور شامل کئے ہیں۔ اس طرح مفہوم کی ادائیگی میں تشنگی باقی رہ گئی ہے۔ اس غرض سے بھی مصرعوں کو الفاظ کے مختلف زاویوں سے برتنے کی کوشش کی گئی ہے۔ عملی طور پر جو شخص بھی غزل کی تخلیقی کاوشوں میں شامل رہا ہے اس کو اندازہ ہوگا کہ جب کوئی خیال شاعر کے ذہن میں کلبلاتا ہے تو اس کو ادا کرنے میں کبھی تو بحر کی جامد شکل ان افکار کو سمونے میں ناکام رہتی ہے اور کبھی اس بحر کی جامد حالت خواہ مخواہ کا یہ تقاضہ کرتی ہے کہ اس کی ساخت کے مطابق کچھ الفاظ غیر ضروری طور پر شامل کر دئے جائیں۔ غالبؔ نے بھی تنگنائے غزل کا شکوہ اسی لئے کیا تھا۔

قدماء کی غزلوں کی اوریجنل شکل اگر ان کی ڈائری میں یا جس جگہ وہ اپنی غزلیں رف کاغذ پر لکھتے رہے ہیں اس کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اردو کا کوئی غزل گو شاعر ایسا

نہیں ہے۔جس نے اشعار میں تبدیلیاں نہیں کی ہوں،محض اس لئے نہیں کہ اس کے حسن میں اضافہ ہو جائے اور محض اس لئے بھی نہیں کہ اس میں کوئی فنی خامی موجود تھی بلکہ تبدیلی اس لئے کرتے رہے ہیں کہ کہیں تو آدھے شعر میں ہی مفہوم ادا ہو گیا ہے۔کہیں تین چوتھائی شعر میں مفہوم ادا ہو گیا ہے اور کہیں پورے شعر میں بھی مفہوم ادا نہیں ہو سکا ہے۔اور ظاہر ہے افہام و تفہیم کا مسئلہ شاعر کے لئے اہم ہوتا ہے۔اور شاعر یہ بھی کوشش کرتا ہے کہ شعری حسن بھی کہیں مجروح نہ ہو۔یہ دشواریاں روز ازل سے ہیں اس دشواری کو عبور کرنے کا ایک ہی راستہ آزاد غزل کی صورت ہے۔ورنہ گنجلک، بوجھل اور غیر دلکش اشعار غزلوں میں آتے رہیں گے۔یہ بھی عام طور پر سننے کو ملتا ہے کہ فلاں شعر حاصل غزل ہے۔یہ بھی اس لئے ہے کہ تمام اشعار میں درستگی افہام و تفہیم کی خوبی نہیں ہوتی۔جو کسی ایک شعر میں پیدا ہو جاتی ہے۔اگر کوئی باشعور ذہن اس الزام سے بری ہونا چاہے کہ اس کی غزلوں کے تمام اشعار میں ایک شعر ہی نہیں بلکہ تمام اشعار اپنی دلکشی رکھتے ہیں تو اس کے لئے واحد راستہ آزاد غزل کا ہے۔

یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ ہیئتی تجربے کے لحاظ سے آزاد غزل زیادہ جرأت مندانہ اختراع ہے۔

اکیسویں صدی میں بھی آزاد غزل ترقی پذیر رہی ہے۔اس کی مثالیں آزاد غزل گو شاعرات کے یہاں بھی بآسانی دیکھی جا سکتی ہیں۔شاعرات نے بھی اس صنفِ سخن میں اپنی جولانیاں دکھائیں اور اسے مقبول عام بنانے میں اہم رول ادا کیا۔بیسویں صدی میں زرینہ ثانی (ناگپور) آزاد غزل گو شاعرات میں ایک اہم نام تھا لیکن اکیسویں صدی کے مختلف رسائل میں جن خواتین کی آزاد غزلیں شائع ہوتی رہی ہیں، ان میں رفیعہ شبنم عابدی، نینا جوگن، شہناز مسرت، سلمٰی جاوید، فرحت نواز، سیّدہ نسرین نقاش، حلیمہ جاوید، شہزادی روبینہ شاہین وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

نینا جوگن ایک معروف ادیبہ اور شاعرہ ہیں۔ایک عرصے سے ان کی تخلیقات منظرِ عام پر آتی رہی ہیں۔کئی کتابوں کی مصنفہ ہیں۔انھوں نے اپنے شعری مجموعہ ''تمہارے نام'' میں کئی آزاد غزلیں شامل کی ہیں۔ان کی آزاد غزل کے تین اشعار ملاحظہ ہوں :

اگرچہ سانحے تھے بہت

مگر مجھے تری یادوں کے رت جگے تھے بہت

رکے تو برسرِ منزل تھے ہم ہی ہم

چلے تو قافلے تھے بہت

نہ مل سکے تو یہ کوتاہیِ طلب جوگن

ان سے ملنے کے راستے تھے بہت

زندگی کو حقیقی انداز سے دیکھنے کا نینا جوگن کا اپنا انداز ہے۔ غم آلود فضا میں وہ سانس لیتی نظر آتی ہیں۔ قرب کی گرمی کو ان کی آزاد غزلوں میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔

شہناز مسرت (پٹنہ) معروف شاعرہ اور ادیبہ ہیں۔ انھوں نے بھی آزاد غزلیں کہی ہیں۔ رسائل کے علاوہ ان کے مجموعہ میں بھی آزاد غزلیں ملتی ہیں۔ چار اشعار اس طرح ہیں:

دیکھتی ہوں ان دنوں ایسے ہی خواب

گلشنِ فکرِ سخن میں کھل اٹھے جیسے گلاب

بھولنا ہے غم کا کوئی اقتباس

پڑھ مسرت کی کتاب

....

زندگی کیا ہے اک سہلِ ہنگام ہے

موت ٹھہراؤ کا نام ہے

میں وفائیں کروں، تو جفائیں کرے

یہ مرا کام ہے، وہ ترا کام ہے

شہناز مسرت ذاتی اصولوں کو آزاد غزلوں میں پیشِ نظر رکھتی ہیں، واقعہ اور تجربہ کو اظہار کا پیرایہ دیتی ہیں جن میں نفسیاتی تقاضے بھی ہوتے ہیں۔

رفیعہ شبنم عابدی (ممبئی) کی حیثیت معتبر شاعرہ و ادیبہ کی ہے۔ ان کی تخلیقات رسائل و

جرائد میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔کئی کتابیں طبع ہوچکی ہیں۔انھوں نے بھی آزادغزلیں کہی ہیں۔ ان کے شعراس طرح ہیں :

جاگتی آنکھ جب بے خبر ہوگئی
یہ تصور کی وادی جو صدیوں سے آباد تھی ،اک کھنڈر ہوگئی
اس کی شیریں یادوں کے ساغربھی تشکیک کے سخت پتھر سے ٹکرا گئے
زندگی تلخ تھی، تلخ تر ہوگئی
روح تو زندگی کے بکھیڑوں سے نا آشنا تھی مگر یہ ستم ہوگیا
اب تو اس کوبھی سارے جہاں کی خبر ہوگئی

رفیعہ شبنم عابدی ذات کو سمجھنے کے لئے خارجی ترغیبات سے کام لیتی ہیں۔ان کی انفعالیت میں جمالیات اور معصومیت کودخل ہے۔الفاظ کوبرتنے کا ہنر انھیں معلوم ہے۔

شہزادی روبینہ شاہین (سری نگر) بھی خوبصورت لکھنے والی شاعرہ اورادیبہ ہیں۔ان کی تخلیقات معیاری رسائل وجرائد میں شائع ہوکر ادبی حلقوں میں پزیرائی حاصل کررہی ہیں۔ انھوں نے آزادغزلیں بھی کہی ہیں۔ان کی آزادغزل کے دوشعراس طرح ہیں :

میرے ہونٹوں پہ اک لمس زندہ رہا
یادِ پیہم ستاتی رہی
زخم شاہین ماضی کے بھرتے نہیں،قافلے روز دل میں اترتے نہیں
پھر یہ پاگل ہوا پردۂ درمرا کیوں ہلاتی رہی

شہزادی روبینہ شاہین کا تانیثی شعور بیدار نظر آتا ہے۔وہ وقت کے بہاؤ پر چلنا جانتی ہیں اور حال کو پانے کے لیے یاد کا منظرنامہ سامنے رکھتی ہیں۔وہ چویشن کی آئرنی کونمایاں کرنا جانتی ہیں۔

سیّدہ نسرین نقاش (سری نگر) معروف شاعرہ اورادیبہ ہیں۔ان کی تخلیقات برِصغیر ہندو پاک کے رسائل وجرائد میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔انھوں نے ایک رسالہ ''صدا انٹرنیشنل'' بھی

نکالا تھا اور شاعری کی تمام اصناف میں طبع آزمائی کرتی رہی ہیں۔ انھوں نے خاصی تعداد میں آزادغزلیں کہی ہیں۔ ان کے تین اشعار ملاحظہ ہوں :

اپنی یادوں کا مرے دل میں گذر ہونے دو
عمر اب یوں ہی بسر ہونے دو
جم گئی ہے مرے آئینۂ احساس پہ ماحول کی گرد
کسی آندھی، کسی طوفاں کا گزر ہونے دو
کھینچ کر پھینکو میری سمت یوں ہی طنز کے تیر
خونِ دل، خونِ جگر ہونے دو

سیّدہ نسرین نقاش معاصر حالات کو بیان کرنے کے لیے طنزیہ الفاظ کی شعریت کو پیشِ نظر رکھتی ہیں۔ ان کی آزادغزلوں میں فنی تعامل تکنیک کو پراثر بناتی ہے۔

نئے عہد کی تخلیقیت سے بھرپور اکیسویں صدی کی یہ آزادغزل گو شاعرات انسانی رشتوں کی رفاقت کو عصری حسیت اور فنی ذہانت سے پیش کرتی ہیں اور فکر آلود و فکر انگیز حالات و مسائل کی سچائی کو اپنا موضوع بناتی ہیں۔

پیش خدمت ہے **کتب خانہ** گروپ کی طرف سے
ایک اور کتاب ۔
پیش نظر کتاب فیس بک گروپ کتب خانہ میں
بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے 👇
https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
میر ظہیر عباس روستمانی
0307-2128068 📱
@Stranger ❤️❤️❤️❤️❤️❤️❤️

عبدالحلیم شرر اور ''فردوسِ بریں''

ناول اردو کی ایک اہم صنفِ نثر ہے۔ اردو کے اولین ناول نگاروں میں ڈپٹی نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار، مرزا ہادی رسوا وغیرہ کے علاوہ عبدالحلیم شرر لکھنوی بھی تھے جنھوں نے کئی تاریخی اور خیالی ناول لکھے۔ ''فردوسِ بریں'' ان کا ایک اہم ناول ہے جسے انھوں نے اپنے قیامِ حیدرآباد کے زمانے میں لکھا۔ ناول ''فردوسِ بریں'' کے تنقیدی مطالعہ کے لئے اس کے زمانۂ تحریر کے علاوہ پلاٹ، کردار نگاری اور مکالمہ نگاری وغیرہ کا تجزیہ اس اکائی میں شامل کیا گیا ہے۔

عبدالحلیم شرر کی پیدائش 10 جنوری 1860ء کو لکھنؤ میں ہوئی اور انتقال 16 دسمبر 1926ء کو لکھنؤ میں ہی ہوا۔ ان کے والد حکیم تفضّل حسین آخری تاجدارِ اودھ واجد علی شاہ اختر کے ملازم تھے۔ جب شرر پندرہ سال کے تھے تو ان کے نانا منشی قمر الدین نے اپنی جگہ پر منشی السلطان کے دفتر میں ملازمت دلوادی۔ اس دفتر میں ایک دلچسپ مشغلہ یہ ہاتھ آیا کہ بادشاہ کے نام محلات اور بیگمات جو خطوط بھیجا کرتیں وہ بادشاہ کے ملاحظہ کے بعد اسی دفتر ''بیت الاجرا'' میں محفوظ رکھے جاتے۔ یہ خط عموماً عاشقانہ انداز سے رنگین عبارت میں لکھے جاتے تھے۔ ان خطوط کو شرر نے پڑھنا شروع کیا۔ ہر خط میں جداگانہ جدت طرازی اور تازگی تھی۔ شرر کی انشاپردازی کا پہلا نصاب یہی خطوط تھے۔ وہ ذہن جو خالص مذہبی تعلیم حاصل کر رہا تھا، عربی اور فارسی کے مطالعے میں محو تھا، ان خطوط کے مطالعے نے اس میں شوخ عناصر بھر دیئے۔ عمر کا تقاضہ ان کو شہزادوں کی صحبت میں لے گیا۔ شرر وہاں کے ماحول سے بھی متاثر ہوئے۔

محمد بن عبدالوہاب نجدی کی ''کتاب التوحید'' جب انہیں دستیاب ہوئی تو شرر نے اس کا ترجمہ کیا جسے مولوی تلطف حسین نے شائع کیا۔ تصنیف وتالیف کی دنیا میں ان کا یہی پہلا قدم تھا۔ منشی امجد علی کسمنڈوی کی تحریک پر اخبار میں مضامین لکھنے لگے۔ ان ہی کی تجویز پر شرر تخلص اختیار

کیا تھا۔ 1884ء سے وہ ناول لکھنے لگے۔ اس وقت منشی نثار حسین رسالہ ''پیامِ یار'' نکالتے تھے۔ انہوں نے شرر کو ناول لکھنے کا مشورہ دیا اور ان کا پہلا ناول ''دلچسپ'' انہوں نے ہی چھاپا۔

شررؔ نے تاریخی ناول لکھنے کا آغاز 1888ء میں ''ملک العزیز ورجنا'' سے کیا اور یہ حقیقت ہے کہ شررؔ ہر چند کہ اردو کے قدآور نثر نگار تھے اور انھوں نے نثر کی مختلف اصناف پر طبع آزمائی کی مگر بحیثیت ناول نگار انھیں سب سے زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ مقبول ہونے کا فن جانتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے تاریخی ناول نگاری کی طرف اپنی توجہ مبذول کی اور ایسے عام فہم انداز میں تاریخی واقعات خصوصاً اسلامی تاریخ کے حقائق کو ناول کے اسلوب میں پیش کیا جو عام قاری کے ذہن و دماغ میں بآسانی گھر کر لیتا تھا۔ ساتھ میں اپنی خوبصورت انشاء پردازی کی شیرینی میں ''عاشقانہ رنگ'' کا قوام ملا کر اسے دوآتشہ بنا دیتے تھے۔ شررؔ کی ناول نگاری کے متعلق وقار عظیم رقم طراز ہیں :

> ''......شررؔ نے جو بہت سے ناول لکھے ان میں سے زیادہ تاریخی ہیں اور بقول شخصے ''اسلامی تاریخی'' ہیں۔ دوسرے یہ کہ یہ ''اسلامی تاریخی'' ناول تاریخی ہونے کے علاوہ ''عاشقانہ'' ہیں۔ یہ دونوں باتیں عوام کے من بھاتے موضوع ہیں اور ان موضوعات کو شررؔ نے اپنی شاعرانہ انشاپردازی سے عوام کا من بھاتا کھاجا بنا دیا ہے۔''

(مضمون ''فردوسِ بریں'' کتاب ''اردو کی چند مشہور کتابیں-۱'' ساحل احمد ص88-87)

عبدالحلیم شررؔ کے اہم ناولوں میں سے ایک ''فردوسِ بریں'' بھی ہے جسے فنی اعتبار سے کامیاب کہا جا سکتا ہے۔ پلاٹ نگاری، مکالمہ نگاری اور کردار نگاری ہر اعتبار سے یہ ناول اپنی مثال آپ ہے۔ پروفیسر قمر رئیس نے اس ناول کے بارے میں لکھا ہے:

> ''(فردوس بریں کو) اردو کے تمام تاریخی ناولوں میں نمایاں مقبولیت حاصل ہوئی اور کم و بیش تمام نقادوں نے اس کے پلاٹ کی دلکشی اور کردار نگاری کو سراہا۔ اس ناول کی منظر نگاری اور ماحول کشی میں شررؔ کی صناعی درجۂ کمال پر نظر آتی ہے۔ اس کے تمام کردار منفرد اور جاندار ہیں اور اس کے پلاٹ کی تعمیر انتہائی فطری اور متوازن

ڈھنگ سے ہوئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تمام تخلیقی صلاحیتوں اور
تاریخی شعور نے اپنے مکمل اظہار کے لئے اسی ناول کا انتخاب کیا ہے۔''

(تعارف ص:۷)

شرر نے 1857ء کے تقریباً 3 دہائیوں کے بعد تاریخی ناول لکھنے کا سلسلہ تقریباً اس وقت شروع کیا جب علی گڑھ تحریک اپنے عروج پر تھی۔ علی گڑھ تحریک کا مقصد انگریز حکمرانوں کی نظر میں معتوب ٹھہرے مسلمانوں میں زندگی کی نئی رمق ڈالنا تھا۔ اسی طرح شرر نے بھی تاریخی ناول اس طرح لکھے کہ پڑھنے والوں کے دلوں میں نیا جوش اور تازگی پیدا ہو۔ شرر نے ناول لکھتے وقت اس بات کا ضرور خیال رکھا کہ قارئین ان کے ناولوں کو فرصت کے اوقات میں دل بہلانے کا وسیلہ بنائیں اور یہ ناول کسی بھی طرح قارئین کے ذہن وقلب پر بوجھ نہ بنیں بلکہ روح افزا ثابت ہو اور حسن و عشق کا قوام ملائے بغیر روح کو تازگی پہنچانا ان کے نزدیک ناممکن تھا اس لیے انھوں نے تاریخی ناولوں میں بلکہ اسلامی تاریخی ناولوں میں بھی پلاٹ سے مربوط ایسے کردار شامل کیے جو قارئین کی دلچسپی کا باعث بنے۔ شرر کے تقریباً تمام تاریخی ناول اسی مقصد کی برآوری کرتے نظر آتے ہیں۔

''فردوسِ بریں'' کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں بھی وہ تمام خوبیاں نظر آتی ہیں جو تاریخی ناول کے ذیل میں سطورِ بالا میں درج ہیں۔ ''فردوس بریں'' کا اصل موضوع فرقۂ باطنیہ کی سازشوں کا طوفان بلاخیز ہے جو ملت اسلامیہ کے لئے ایک عظیم فتنہ کی شکل میں سامنے آیا۔ ناول کے تنقیدی جائزہ کے لیے پلاٹ نگاری، کردار نگاری اور مکالمہ نگاری کا فرداً فرداً جائزہ لینا ضروری ہے۔ ''فردوسِ بریں'' ناول نگاری کے فن کے تقاضوں پر کھرا اترتا ہے۔ وقار عظیم لکھتے ہیں :

''فردوسِ بریں کو ہم خواہ برا ناول نہ کہہ سکیں، لیکن اس لحاظ سے اچھا ضرور کہتے ہیں کہ ناول نگار سے فن جتنے تقاضے کرتا ہے، انھیں اس نے بے چون و چرا بڑے خلوص اور بڑی وفاداری سے پورا کیا ہے۔......''

(مضمون ''فردوسِ بریں'' کتاب ''اردو کی چند مشہور کتابیں-۱'' ساحل احمد ص 97)

''فردوسِ بریں'' کا پلاٹ گٹھا ہوا ہے۔ فنی بصیرت اور تخلیقی صلاحیت کا ثبوت اس میں ملتا

ہے۔مختلف ابواب میں منطقی ربط اور توازن ہے۔آغاز اور نقطۂ عروج بھی ہے۔نو ابواب کے اس ناول میں عنوانات بھی دیئے گئے ہیں:

پہلا باب	پریوں کا غول	دوسرا باب	پیاری زمرد تو کہاں گئی؟
تیسرا باب	ملاء اعلیٰ کا سفر	چوتھا باب	فردوسِ بریں
پانچواں باب	پھر وہی عالمِ عناصر	چھٹا باب	مردودِ ازلی
ساتواں باب	بلغان خاتون کا سفر	آٹھواں باب	افشائے راز
نواں باب	انتقام		

عنوان سے بھی کسی حد تک اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ تاریخی ناول ہے۔لیکن تاریخی ناول نگاری میں ''فردوس بریں'' کا اہم مقام ہے۔عبدالحلیم شرر نے ملت اسلامیہ کو ان کے اسلاف کے کارنامے دکھلا کر بیدار کرنے یا خوابِ غفلت سے جگانے کا کام کیا ہے۔تاریخ اسلام کا روشن ماضی اس ناول میں بھی ہے۔مسلمانوں کے وہ کارنامے دکھلائے گئے ہیں۔جنہیں پڑھ کر جوش پیدا ہوتا ہے۔اور پژمردہ حوصلوں کو نئی توانائی ملتی ہے۔

''فردوسِ بریں'' میں ایک جنتِ ارضی کی تفصیل ہے جسے فرقۂ باطنیہ کے سربراہ نے عیش موج کے لئے بنوایا تھا۔پہاڑوں کے بیچ میں ایسے پوشیدہ مقام پر یہ جنت تھی جہاں تک رسائی عام لوگوں کی نہیں ہو سکتی تھی۔اس جنت کی تفصیل شرر نے اس طرح بیان کی ہے۔پہلے پھول، چمن اور ہنر کا نظارہ دیکھئے:

> ''چمن ایسے ہیں جن میں مختلف رنگ کے پھولوں کو ترکیب دے کر زمین پر ایسی ایسی گلکاریاں کی گئی ہیں کہ عقلِ انسانی حیرت میں آجاتی ہے۔سارا مرغ زار اور ساری وادی جو کوسوں دور تک پھیلی ہوئی ہے اور جسے خوب صورت متوازی اور سرسبز و شاداب پہاڑوں نے اپنے حلقے میں کر لیا ہے از سرتا پا ان چمنوں اور پھولوں سے بھری ہے اور مختلف نہریں جو آبشاروں کی شان سے اور پانی کی چادریں بن بن کر پہاڑوں سے اتری ہیں ان چمنوں اور پھولوں کے درمیان جا بجا بہہ رہی ہیں

اوران کے پانی نے خواہ پھولوں کی خوشبو سے متاثر ہوکر یا کسی اور وجہ سے گلاب اور کیوڑے کی شان پیدا کرلی ہے۔ یہ نہریں زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ ہم ہی تسنیم و سلسبیل ہیں۔......'' (فردوسِ بریں ص:66)

اس جنت ارضی کی روش اور سڑک کے بارے میں شرر لکھتے ہیں:

''......راستوں اور روشوں کی ترتیب میں یہ معجز نما کیفیت پیدا ہوگئی ہے کہ ہر چمن کے ایک پہلو کو نہر دھوتی ہے تو اس کے دوسرے پہلو کو ایک چھوٹی سی خوشنما سڑک اپنے آغوش میں لیتی ہے۔ یہ سڑک چمن سے بھی زیادہ کمال صناعی دکھا رہی ہے۔ مختلف قسم اور مختلف رنگ کے سنگ ریزوں سے ان سڑکوں کی تعمیر میں کام لیا گیا ہے اور ہر سڑک پر ایک خاص رنگ کے سنگ ریزے بچھا کے کوئی سڑک فیروزے کی، کوئی زمرد کی، کوئی یاقوت کی اور کوئی نیلم کی بنا دی گئی ہے۔ پھر ترتیب میں یہ لطف ہے کہ جس رنگ کے پھولوں کا چمن ہے اسی کی مناسب و موزوں رنگ کی پتلی خوشنما سڑک بھی اس کے پہلو سے گزری ہے، نغمہ سنج طیور ان چمنوں میں اڑتے پھرتے ہیں۔ پھولوں کے قریب بیٹھ بیٹھ کر عشق و محبت کی داستان سناتے ہیں۔......'' (ایضاً ص:67-66)

چوں کہ ناول کا نام ''فردوسِ بریں'' ہے اور اس میں اس فردوس کی اہمیت بہت زیادہ ہے اس لئے شرر نے بھرپور طور پر دل کشی، جاذبیت اور دلچسپی سے اسے پہچان عطا کی ہے۔ ایک اور اقتباس دیکھیں:

''......جابجا نہروں کے کنارے سونے چاندی کے تخت بچھے ہیں جن پر ریشمی پھول دار کپڑوں کا فرش ہے۔ لوگ پر تکلف گاؤ تکیوں سے پیٹھ لگائے دل فریب اور ہوش ربا کمسن لڑکوں کو پہلو میں لئے بیٹھے ہیں اور جنت کی بے فکریوں سے لطف اٹھا رہے ہیں۔ خوبصورت آفتِ روزگار لڑکے کہیں تو سامنے دست بستہ کھڑے ہیں اور کہیں نہایت ہی نزاکت اور دل فریب حرکتوں سے ساقی

گری کرتے ہیں۔ شراب کے دور چل رہے ہیں اور گزک کے لئے سدھائے یا
قدرت کے سکھائے ہوئے طیور پھل دار درختوں سے میوہ توڑ توڑ کر لاتے ہیں
اور ان کے سامنے رکھ کر اڑ جاتے ہیں۔ پھل ہی نہیں یہ خوشنما طیور کپڑوں میں
لپٹے ہوئے کبابوں کی پوٹلیاں بھی لاتے ہیں اور ان لوگوں کے لئے مے کشی اور
شاہد پرستی کا پورا سامان فراہم کرتے ہیں۔'' (ایضاً ص:67)

پلاٹ کے لحاظ سے واقعات منفرد ہوتے ہوئے قصے کو اختتام تک پہنچانے میں مددگار ہیں۔ عبدالحلیم شرر نے ہمہ گیریت اور سنجیدگی کے ساتھ واقعات کو اس طرح مربوط کیا ہے کہ مرکزی پلاٹ کے ساتھ بعض ضمنی پلاٹ بالواسطہ بن گئے ہیں۔ ہر پلاٹ کے خاتمے کے وقت قاری کے ذہن میں یہ تجسس برقرار رہتا ہے کہ ''آگے کیا ہوگا؟'' یہ سسپنس والی کیفیت ہی ''فردوسِ بریں'' کی پلاٹ نگاری کی جان ہے اور قاری کو ناول کے آغاز سے اختتام تک پہنچنے میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ شرر کی پلاٹ نگاری کے متعلق وقار عظیم کا خیال ہے :

''......ناول کے پلاٹ کو اس نے نو بابوں میں تقسیم کیا ہے اور پلاٹ کے ارتقا
اور ربط کے مقاصد کو پورا کرنے کے علاوہ وہ ان بابوں کے ذریعہ دلچسپی پیدا
کرنے، اسے آہستہ آہستہ بڑھاتے رہنے اور قصے کے آخری حصے تک قائم
رکھنے، امید و بیم اور حیرت و سکون کے جذبات کو حسبِ موقع ابھارتے اور
دباتے رہنے کا کام بڑی ہوشیاری سے چابک دستی سے لیتا رہا ہے۔ قصے کے
آغاز سے لے کر اس کے خاتمے سے ذرا پہلے تک قاری کے دل میں یہ بنیادی
سوال پیدا ہوتا رہا ہے کہ ''اس کے بعد کیا ہوا؟'' اور ''دیکھیں اس کے بعد کیا
ہوا؟'' کا جگایا ہوا شوق اسے ایک نا معلوم منزل کی طرف بڑھاتا رہا ہے۔''

(مضمون ''فردوسِ بریں'' کتاب ''اردو کی چند مشہور کتابیں-ا'' ساحل احمد ص 97)

''فردوسِ بریں'' میں کرداروں کے افعال و حرکات اور مکالمات سے بھی واقعات کا اظہار تسلسل پیدا کرتا ہے۔ واقعات میں صداقت کا عنصر پیدا کرنے کیلئے اس ناول میں توازن ترتیب اور

ہیئت کا خاص خیال رکھا گیا ہے اور پلاٹ کو لچک دار بنایا گیا ہے۔ اس میں سکون، حیرت، تجسس اور طرح طرح کے جذبات کی عکاسی کی گئی ہے۔ قصے کو ایک حد تک پھیلانے کیلئے متضاد طاقتوں کا تصادم بھی دکھلایا گیا ہے۔ یہ کشمکش واقعات کے ساتھ آگے بڑھتی ہے۔ مناظر قدرت اور مناظر حیات کو دھیان میں رکھتے ہوئے اس ناول کو دلچسپ بنایا گیا ہے۔ ''فردوسِ بریں'' کے کرداروں کے حوالے سے وقار عظیم لکھتے ہیں :

> ''فردوسِ بریں کے کرداروں کی ساخت دونوں طرح کے فنی عمل سے ہوئی ہے اور ناول نگاری کی کامیابی یہ ہے کہ جس طرح پلاٹ کے کسی حصے کی طرف سے اس کے دل میں (بعض اوقات متحیر و متعجب ہو جانے کے باوجود) شبہ یہ بے یقینی نہیں پیدا ہوتی، اسی طرح کردار جو بھی جو کچھ کہتے اور کرتے ہیں وہ ان کے مزاج کی بنیادی خصوصیتوں سے ہم آہنگ ہے۔''

(مضمون ''فردوسِ بریں'' کتاب ''اردو کی چند مشہور کتابیں-۱'' ساحل احمد ص 104)

''فردوسِ بریں'' میں ارضی جنت کی نقشہ کشی کے ساتھ مرکز و توجہ کردار پر دی گئی ہے۔ اس ناول کے اہم کردار حسین، زمرد، شیخ وجودی اور بلغان خاتون ہیں۔ یہ بھی کردار جیتا جاگتا نقشہ پیش کرتے ہیں اور واقعات کو تابع بناتے ہیں۔ کردار کا ہر فعل دلچسپ ہے۔ متخیلہ سے کام لے کر یا زندگی سے ملتے جلتے واقعات کو پیش کر کے شرر نے جان ضرور پیدا کی ہے۔ تشریحی طریقہ اور ڈرامائی طریقہ سے بیان میں قوت پیدا کی گئی ہے۔ اس ناول کے بھی کرداروں کے جذبات، خیالات، ارادے اور احساسات اپنی حرکات اور اپنی بات چیت سے خود شناس بنتے ہیں۔ مختلف پہلو آہستہ آہستہ سامنے آتے ہیں جن میں اچھائیاں اور برائیاں دونوں ہیں۔ شرر نے فن پر گرفت رکھتے ہوئے مخصوص نظریے کو ارتقائی منازل سے گذارا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ مزاج اور فطرت میں تغیر پیدا کیا ہے۔ حسین کا عشق زمرد سے انتہا کو پہنچا ہوا ہے لیکن اسے بتایا جاتا ہے کہ زمرد مر چکی ہے اور جنت میں ہے۔ اسی مایوسی کی کیفیت میں اسے بشارت دی جاتی ہے کہ جنت میں وہ لے جایا جا سکتا ہے اور زمرد سے ملاقات کر سکتا ہے۔ بے ہوشی کی حالت میں اسے جنت لے جایا جاتا

ہے اور زمرد سے ملاقات اور جنت کی سیر کرا کے بے ہوشی کی حالت میں ہی دنیا میں بھیج دیا جاتا ہے۔ زمرد سے ملنے اور جنت دیکھنے کا نشہ اس پر اس طرح چھایا رہتا ہے کہ جن لوگوں نے اسے بشارت دی تھی وہ اس کے حقیقی چچا امام نجم الدین نیشاپوری اور نصر بن احمد کا خاتمہ اسی سے کرانا چاہتے ہیں لیکن جلد ہی اسے غلطی کا احساس ہوتا ہے اور یہ بھی علم میں آتا ہے کہ وہ جنت مصنوعی ہے۔ پھر کیا تھا۔ بلغان خان کے علم میں لا کر اس کی فوج کے ساتھ وہ مصنوعی جنت میں داخل ہو جانے میں کامیاب ہوتا ہے اور سخت معرکہ آرائی کے بعد مصنوعی جنت اور التونیہ کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ اس مقام کا تعارف پیش کرتے ہوئے عبدالحلیم شرر ناول کی ابتدا اس طرح کرتے ہیں:

> ''اب تو 651ھ ہے مگر اس سے ڈیڑھ سو سال پیشتر سیاحوں اور خاصیۂ حاجیوں کیلئے وہ کچی اور اونچی نیچی سڑک نہایت ہی اندیشہ ناک اور پُر خطر تھی جو بحرِ خضر (کیسپین سی) کے جنوبی ساحل سے شروع ہوتی ہے اور شہر آمل میں ہوتی ہوئی شاہنامے کے قدیم دیوستان یعنی ملک ماژندراں اور علاقہ رودبار سے گزرتی اور کوہسارِ طالقان کو شمالاً جنوباً قطع کرتی ہوئی شہر قزوین کو نکل گئی ہے۔'' (ایضاً ص:9)

حسین اور زمرد کے کردار پر شرر نے خصوصی توجہ دی ہے۔ مختلف مراحل پر یہ دونوں کردار اپنی فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ جیتے جاگتے کردار ہیں جن میں مختلف حالات کے مطابق تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ زمرد صرف حسن کی ملکہ ہی نہیں ہے بلکہ ذہانت اور دلیری اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ویسے عام عورت کی کمزوریاں بھی اس میں ہیں اور ہر موقع پر قربانی دینے کے لئے تیار رہتی ہے۔ بلغان خاتون کا کردار بھی متوجہ کرتا ہے۔ خصوصاً اس وقت اس کی صفات، شجاعت اور بہادری سامنے آتی ہے جب وہ پانچ سو سواروں کے ساتھ جنت ارضی کو برباد کرنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ شیخ علی وجودی منفی کردار کا حامل ہے۔ ولن کی صورت میں موجود رہتا ہے اور اپنی ذہانت، ہوشیاری اور عیاری سے سبھی کو مرعوب کرنے اور اپنے تابع بنانے میں کامیاب رہتا ہے۔

''فردوسِ بریں'' کی ایک اہم خصوصیت مکالمہ نگاری بھی ہے۔ شرر نے پلاٹ کے ارتقاء

میں صحیح و برمحل مکالموں کے استعمال سے ناول کو کامیابی سے ہم کنار کیا ہے۔ مکالمے مختصر، چست، برجستہ اور برمحل ہیں۔ واقعات کے ساتھ مکالمے کو وہ اس طرح جوڑتے ہیں کہ وہاں سے ہٹانا کسی بھی صورت سے مناسب نہیں ہے۔ شرر مکالمہ لکھتے وقت ڈرامانگاری کے دائرے میں نظر آتے ہیں۔ انکے مکالمے کردار کے ارادے، اس کے احساسات اور جذبات کو ظاہر کرتے ہیں اور مختلف معاملات پر انکی رائے کا پتہ چلتا ہے مثلاً جنت ارضی کے قصر میں داخل ہوتے وقت زمرد نے حسین سے کہا:

''یہاں کی مسرتیں تو بے شک دنیا کی عام مسرتوں سے بالا ہیں مگر یہ نہ سمجھو کہ تم دنیا سے نکل کر کسی اور جگہ آ گئے ہو۔''

حسین: پھر وہ سب واقعات جو گزر چکے ہیں ان کی نسبت کیا خیال کروں۔''

زمرد : سب میری مجبوری، میری بے دست و پائی اور تمہاری سادہ لوحی کا نتیجہ ہے۔

حسین: میں اس کا مطلب نہیں سمجھا۔

زمرد: گھبراؤ نہیں۔ سب سمجھ جاؤ گے۔ مگر افسوس، جس قدر زیادہ سمجھو گے اسی قدر زیادہ پریشان ہو گے اور اپنے کیے پر پچھتاؤ گے۔''

حسین: زمرد اب مجھے تیری صورت پر بھی شبہ معلوم ہوتا ہے۔ تو وہی زمرد ہے جو میرے ساتھ آمل سے آئی تھی؟'' (ایضاً ص:133)

شرر کے مکالموں میں بناوٹ نہیں ہے۔ ہر کردار کی بات چیت کا انداز اس کی فطرت کے مطابق کیا ہے جس سے انفرادیت ظاہر ہوتی ہے۔ عبدالحلیم شرر کے اس ناول کے تمام کردار عربی و عجمی ہیں لیکن گفتگو اور لہجہ خالص لکھنوی ہے۔ کہیں کہیں پر لکھنؤ کی زوال آمادہ تہذیب بھی سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

''فردوسِ بریں'' میں ناول میں پلاٹ منظم ہے، واقعات کی ترتیب دلکش ہے۔ کردار اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں اور منظر نگاری میں مرقع بیانی ہے۔ شرر چونکہ انگریزی ادب سے واقف تھے اسی لئے مغربی فن کو مشرقی مزاج کے سانچے میں انہوں نے کامیاب طریقے سے ڈھالا ہے۔

❖❖❖

ظفر اوگانوی: جدید اردو افسانے کا اہم نام

ظفر اوگانوی نے جب افسانہ نگاری شروع کی اُس وقت کئی سماجی، سیاسی اور زمینی انقلاب رونما ہو چکے تھے۔ نئی حقیقتیں قائم ہو رہی تھیں اور تخلیقی ذہن نئے سوالات اور نئی حسیت سے روشناس ہو رہا تھا۔ بہت سے مسائل اُن کے سامنے سانپ کی طرح پھن پھیلائے کھڑے تھے۔ ظفر اوگانوی نے تخلیقی رویے کی تشکیل کی اور افسانوں میں زمان و مکان کی وحدتوں کو توڑا تو حقائق کے اثبات کو جستجو کا سرچشمہ بنایا۔

ظفر اوگانوی جدیدیت کے علم بردار افسانہ نگار تھے، اس لئے کہ ۱۹۶۰ء کے بعد کی نسل میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ انھوں نے تشبیہی، استعاراتی اور کنایاتی انداز کے افسانے لکھے جن میں وقت کے تسلسل کو ذہنی روایت کی عظمت سے فطری کشش اور دل پذیری عطا کی ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں ہیئتی اور عصری حیات و اقدار کی معروضی ترجمانی کو اہمیت دی اور تنوع، نیرنگی اور بوقلمونی پیدا کر کے فن کا آئینہ بنایا ہے۔ رسالہ 'اقدار' شائع کر کے انہوں نے اپنے ہم خیالوں کی ایک جماعت تشکیل دی جو ہمیشہ ان کے ہمراہ چلتے رہے۔

ظفر اوگانوی مختلف الجہات شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا اصل میدان افسانہ نویسی تھا مگر اُن کی گرفت تنقید و تحقیق پر بھی اچھی خاصی تھی۔ صفیر بلگرامی پر اُن کی تحقیقی کتاب سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ دراصل یہ کتاب اُن کا تحقیقی مقالہ تھا جو ڈاکٹریٹ کے لئے علامہ جمیل مظہری کی نگرانی میں لکھا گیا تھا۔ یہ کتاب غالب اور صفیر بلگرامی کے ادبی پس منظر پر ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس اعتبار سے یہ اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے۔ اس کے علاوہ بھی ظفر اوگانوی کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین شائع ہو کر قبولیت پا چکے ہیں جس سے اُن کی تخلیقی اور تنقیدی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ظفر اوگانوی کے ادبی مضامین کو ڈاکٹر دبیر احمد نے ''اذہان و اشخاص'' (۲۰۰۲ء) کے نام سے ترتیب دیا ہے جس میں کل ۱۱ رمقالے شامل ہیں۔ یہ مضامین فنِ نقد پر

پورے اترتے ہیں۔ان پر تین کتابیں ''ظفر اوگانوی: حیات اور ادبی خدمات'' (ڈاکٹر دبیر احمد)، ''ظفر اوگانوی'' (مونوگراف برائے مغربی بنگال اردو اکاڈمی مصنف: ڈاکٹر دبیر احمد ۲۰۱۳ء)، ''ظفر اوگانوی: نقوش و آثار'' (مرتب: ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی ۲۰۱۴ء) اور ایک کتابچہ ''پروفیسر ظفر اوگانوی بحیثیت استاذ'' (اشرف احمد جعفری) منصۂ شہود پر آچکے ہیں۔ان کی رحلت کے بعد ماہنامہ ''زبان و ادب'' (پٹنہ) نے ان پر گوشہ بھی شائع کیا تھا۔

ظفر اوگانوی کا اصل میدان کہانی ہے۔وہ کہانی بُننے کے فن سے پوری طرح واقف تھے۔ترقی پسندی کا دور ختم ہو چکا تھا اور جدیدیت کا سورج ادباء کو اپنی جانب کھینچ رہا تھا۔جدید افسانوں کے متعلق فضیل جعفری نے بے حد جامع رائے دی ہے، ملاحظہ فرمائیں :

''جہاں تک جدید افسانوں کے موضوع اور تکنیک کا سوال ہے، متعلقہ افسانہ نگاروں نے سماج سے باہر نہیں، ان کے اندر ہی رہ کر افسانے لکھے۔فرق صرف یہ ہے کہ انھوں نے پیش رووں کی طرح خارجی ماحول کی عکاسی کسی طے شدہ اور بنے بنائے سانچے کی مدد سے نہیں، اپنے داخلی لینڈ اسکیپ کے توسط سے کی ہے۔نتیجے کے طور پر ان افسانوں میں ایک ایسی جارحانہ دانشوری پیدا ہو گئی ہے، جسے سمجھنے اور ہضم کرنے میں قاری کو دشواری پیدا ہوتی ہے۔نامانوس علامتوں، استعاروں اور پیکروں کے استعمال کا تعلق جدید افسانوں کی تکنیک سے ہے۔یہ کہیں کہیں شارٹ ہینڈ والی تکنیک بن گئی ہے جس میں خالی جگہوں کو پُر کرنے کا کام قاری خود کرتا ہے۔جدید افسانوں میں غیر ضروری تشریح اور تفصیل سے احتراز کا رجحان ملتا ہے۔بیانیہ میں واقعات کو ترتیب وار پیش کرنے کے بجائے انھیں فنی مہارت کے ساتھ بالواسطہ انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔'' (اردو افسانہ اور جدید افسانہ)

ظفر اوگانوی نے روایت پرستی کی ساری زنجیروں کو توڑ دیا اور جدیدیت کے دامن کو مضبوطی سے پکڑ لیا جس کی وجہ سے کئی معترضین پیدا ہو گئے جو ان پر ہمیشہ اعتراضات کرتے رہتے تھے۔انکی کہانیوں کے پہلے مجموعہ ''بیچ کا ورق'' میں کل گیارہ کہانیاں ''انٹرا موروس''، ''نیا آئینہ''، ''نئی سڑک''، ''احرام''،

''اپنا رنگ''، ''بیچ کا ورق''، ''قیادت''، ''باؤلی اور ٹینک''، ''پہاڑ پر ایک حادثہ''، ''کھوپڑیوں کے سوداگر''، ''ریس کے گھوڑے'' شامل ہیں۔ان کے علاوہ ان کے درجنوں افسانے شائع ہو چکے ہیں۔ڈاکٹر ظفر اوگانوی اور ان کے افسانوں کے مجموعہ ''بیچ کا ورق'' کے متعلق سالک لکھنوی نے لکھا ہے :

''ڈاکٹر ظفر اوگانوی کی ادبی جہتوں میں شاعری، افسانہ نگاری، تنقید، تحقیق سب شامل رہیں۔لیکن جو بھی شہرت ملی وہ ایک تجریدی و علامتی افسانہ نگار کی حیثیت سے ملی۔کلکتہ میں ان کی آمد نے جدیدیت پسندی کو بڑی توانائی عطا کی۔مغربی بنگال میں اگر انھیں جدیدیت پسند ادب کا معمار اور اس رنگ میں لکھنے والے ادیبوں کا سرخیل کہا جائے تو یہ ان کا حق ہے۔ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''بیچ کا ورق'' ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا۔اس مجموعہ میں جو افسانے ہیں وہ اتنے تجریدی اور علامتی ہیں کہ ہما شما کی سمجھ سے بالانظر آتے ہیں۔تاہم زبان بڑی رواں دواں اور منظر انگیز ہوتی ہے۔''

(کتاب ''بنگال میں اردو نثر کی تاریخ: آغاز تا حال'' ص:۳۱۹ اشاعت:۱۹۹۸ء)

اپنے افسانوں کے مجموعہ ''بیچ کا ورق'' کے پیش لفظ ''نئی کہانی'' میں ظفر اوگانوی اپنی کہانیوں کے متعلق لکھتے ہیں :

''......قلم کے تقاضے کیا ہیں۔اور اس سے قلم کار کس طرح عہد برآ ہوا ہے۔علامتیں (جزوی اور کلّی) کہاں بنیں اور کہاں بگڑ گئیں۔کہنے کا انداز کب کیسا ہوگا۔کھردرا پن آرٹ کی لطافت کا امین ہو جاتا ہے۔اور یہ سارا کچھ آج ایسا کیوں ہے۔میری کہانیاں یہی کچھ ہیں۔مجھے نہیں معلوم کہ ان پر کس طرح کے لوگ کسی نوعیت کے تجربے فرمائیں گے۔لیکن میرے لیے اردو کے وہی ناقد اہم ہیں جو بین الاقوامی ادبی، سیاسی اور سماجی نظریات واقدار کی خامیوں سے آگاہ ہیں اور جنھوں نے خلوصِ دل کے ساتھ اسی پس منظر میں نئی کہانی کے آرٹ کو سمجھنے کی کوشش بھی کی ہے۔''

ان کا ایک افسانہ ''قصہ ایک مجسمے کا'' فرقہ وارانہ فسادات پر مبنی ہے۔فساد سے پہلے آج جو حربے استعمال کئے جارہے ہیں اس کی جیتی جاگتی تصویر اس میں بیان کی گئی ہے کہ کس طرح ایک خاص گروہ کی شرپسندی اور اس کے ذریعہ پھیلائی ہوئی افواہوں پر شہر کی پُرسکون زندگی کو خاک وخون میں ڈبویا جاتا ہے۔ ''تلافی'' ایک اہم تخلیقی تجربہ ہے۔یہ کہانی بابری مسجد کے انہدام کے پس منظر میں لکھی گئی ہے کہ کس طرح اہل سیاست ایوان اقتدار تک پہنچنے کے لئے منصب کا استعمال کرتے ہیں۔اس موضوع پر یہ پُر اثر کہانی ہے۔اس کہانی میں شرما جی کے خاندان کو بچانے کے لئے جاوید نام کا ایک نوجوان اپنی جان کی قربانی پیش کرتا ہے۔شرما جی کو لوگوں نے اس اسپیشل ٹرین میں سوار ہوتے دیکھا تھا جو کارسیوکوں کو لے کر مسجد ڈھانے جارہی تھی۔اس کا انتقام لینے کیلئے مسلم اکثریت محلہ میں واقع شرما جی کے گھر کو گھیر لیا گیا۔وہ لوگ جو شرما جی کے گھر کو گھیرے ہوئے تھے وہ محلے کے نہیں تھے۔فسادیوں کی رہنمائی وہ لوگ کررہے تھے جن کو محلہ والوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ عام طور پر ملک میں جو فسادرونما ہوتے ہیں وہ خواہ کسی نوعیت کے ہوں اس کے پس پردہ کوئی گہری سازش ضرور ہوتی ہے جس میں مجرمین اور بھولے بھالے نوجوان مرکزی کردار ادا کرتے ہیں۔یہ لوگ اچانک قصبے، محلے یا شہر کی شریف اور پُرامن آبادی پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور پھر آگ وخون کا بھیانک کھیل شروع ہوجاتا ہے۔ظفر اوگانوی نے بالواسطہ طور پر اس سماجی برائی سے پردہ اٹھایا ہے اور یہ بتایا ہے کہ کس طرح منفی جذبے پر انسانی جذبے کی صداقت فتح یاب ہوتی ہے۔

''نکلا جو حرف دعا'' اصل اور نقل کی حقیقت پر مشتمل منفرد کہانی ہے۔عام زندگی میں رونما ہونے والے ایک معمولی واقعہ کو ایک خوبصورت کہانی میں ڈھالا گیا ہے۔ایک بھکارن جو لوگوں کو گالیاں اور بددعائیں دے کر بھیک مانگتی تھی اور لوگ بغیر بُرا مانے اس کی جھولی میں کچھ نہ کچھ ڈال دیا کرتے تھے۔پھر ہوا یہ کہ اس بھکارن کی موت ہوگئی۔وہ اپنی گالیوں اور بددعاؤں کے ساتھ اس دنیا سے چلی گئی جس کی وجہ سے یہ چوراہا سنسان ہوگیا۔لوگوں کے دلوں میں یہ خیال ابھرا کہ یہ سنسان چوراہا کوئی ایسا طوفان لاسکتا ہے جو سب کو ہلاک کردے گا اس لئے سبھوں کا فرض بنتا ہے کہ مرحومہ کی جگہ جلد سے جلد پُر کی جائے۔اس سے یہ تاثر اُبھرتا ہے کہ عصر حاضر کا انسان شور

اور ہنگاموں کا اس قدر عادی ہوگیا ہے کہ اگر ایک پل کو بھی سناٹا چھا جائے تو لوگوں کے دل دھڑ کنے لگتے ہیں۔آج کا مشینی معاشرہ کس طرح انسان کو اپنے باطن، اپنی روح اور اپنی داخلیت سے محروم کرتا جارہا ہے۔''جنگل میں اندھیری رات کا ایک منظر'' ایک استعاراتی کہانی ہے۔جنگل کائنات کا استعارہ ہے اور اندھیری رات بے معنی زندگی کی علامت ہے۔

جدیدیت کے زیر اثر اور بھی بہت سی علامتی اور استعاراتی کہانیاں لکھی گئی ہیں۔ظفر اوگانوی نے بھی ایسی کئی کہانیاں لکھ کر افسانہ نگاری کی روایت میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔انہوں نے اپنے افسانوں میں زندگی کی حقیقت اور نفسیاتی الجھنوں کو اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری اپنے آپ کو ہر کردار سے جُڑا ہوا محسوس کرتا ہے۔ان کے تمام افسانوں میں معاشرہ کا کوئی نہ کوئی کردار اپنی شکل میں نظر آتا ہے۔ظفر اوگانوی نے معاشرے سے جڑے رہ کر ان کی زندگی کا بھر پور مشاہدہ کیا تھا اور باریک بینی کے ساتھ اس کا گہرا جائزہ بھی لیا تھا۔یہی وجہ ہے کہ ان کے زیادہ تر افسانوں میں عصری فکر و شعور کی فنکارانہ آگہی ملتی ہے۔ان کا اسلوب بیان اور طریقۂ اظہار فنی تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ اور متوازن رہا ہے۔وہ منطقی استدلال کے رویوں کو اتنی ہی اہمیت دیتے ہیں جتنی فن اور قاری کی سوجھ بوجھ کے لئے ضروری ہے۔ان کے یہاں موضوعات کا تنوع اور تلون اپنی بھر پور سچائی کے ساتھ نمایاں ہے۔ظفر اوگانوی کی جدیدیت آمیز افسانوی اسلوب کے متعلق پروفیسر وہاب اشرفی رقم طراز ہیں:

> ''نئی صف میں ظفر اوگانوی سب سے آگے نظر آتے ہیں۔۱۹۶۰ء کے بعد کی تبدیلیوں کو انھوں نے سب سے پہلے محسوس کیا اور اپنے لیے ایک ایسی راہ اختیار کی جس کو دوسروں نے بھی پسند کیا۔ان کا ایک مزاج بن چکا تھا اور ان کا اپنا ایک اسلوب ہے جو دوسروں سے مختلف ہے۔''نیا آئینہ''،''بیچ کا ورق''،''قیادت'' اور''اندر کا المیہ''(اہرام) جیسے ان کے افسانوں کو خالد اصغر، انور سجاد، سریندر پرکاش، بلراج مینرا اور احمد ہمیش جیسے فن کاروں کے کسی بھی افسانے کے مقابلے میں پیش کیا جاسکتا ہے۔'' (بہار میں اردو افسانہ نگار ص:۷۳)

ظفر اوگانوی کے افسانوں کے کم و بیش تمام کردار اپنے آپ سے جنگ کرتے نظر آتے ہیں۔ زندگی کی بے یقینی، شخصیت کا بکھراؤ، مردم بیزاری، تنہائی کا خوف، ہجوم سے فرار جیسے موضوعات سے وہ اس لئے پیچھا نہیں چھڑا سکے کہ یہ سب آج کی زندگی کی وہ سچائیاں ہیں جن سے آنکھیں چار کئے بغیر ہم نہیں جی سکتے۔ وہ اپنے افسانہ ''آئینہ'' میں لکھتے ہیں:

''آج میرا ذہن خالی ہے، بالکل اس بھکاری کے خالی کاسے کی طرح جس میں رات گئے ایک پیسہ بھی نہ ڈالا گیا ہو اور وہ اپنی بوڑھی ماں، اپاہج بیوی کے پاس جانے سے گھبرا رہا ہو''۔

''مجھے معلوم تو بس اتنا ہے کہ آج کی دنیا بھی اس بھری ہوئی ایش ٹرے کی طرح ہے جو بے حد چھوٹی ہے جس میں سگریٹ کے ٹکڑے اور ماچس کی تیلیاں ضرورت سے زیادہ ہیں۔''

ظفر اوگانوی کے یہاں علامت نگاری اور حقیقت نگاری دو متضاد صورتوں میں نہیں ہے بلکہ حقیقت کو پیش کرنے کے لئے علامت ایک اسلوب ہے۔ ان افسانوں میں جگہ جگہ معنی خیز علامتوں نے جو اجتماعی شکل اختیار کی ہے، وہ افسانہ کی اندرونی کیفیات کو بیرونی معنویات سے آشکارا کر رہی ہے۔ زندگی کی بے ثباتی، مسائل کا جم غفیر، انسانی قدروں کا کھوکھلا پن، منفی رویہ ایسے تصورات ہیں جو ظفر اوگانوی کے افسانوں میں کبھی علامت، کبھی استعارے کی شکل میں ملتے ہیں اور افسانہ زندگی، سماج، فرض کے بنیادی سوالات سے متصادم نظر آتا ہے۔ ان کا دانشورانہ فکری رویہ ان سوالات سے بحث کرتا ہے۔ اس حوالے سے ان کے افسانوں سے چند اقتباسات دیکھئے:

''اس نے اندھیرے میں اس کو ٹٹولا تو لگا کہ اس پر کچھ ہندسے لکھے ہیں' شاید اس سڑک کی مسافت کا علامتی اظہار۔''

''یہ سڑک تمہاری جاگیر ہے کیا؟ راستوں پر تو کوئی بھی چل سکتا ہے اور ایک ساتھ کئی چل سکتے ہیں۔''

''میں ننگے بھوکے لوگوں میں رہ کر کچھ ایسا محسوس کرتی ہوں جیسے میرا اپنا وجود ختم ہو چکا ہے۔''

”جب آپ کو شانتی مل جائے اور آپ کو مردہ جسم کی کوئی ضرورت محسوس نہ ہو تو مجھ سے کہئے گا میں آپ کی لاش کے لئے کوئی ایسا اہرام بنادوں گا جہاں آپ کی لاش بالکل محفوظ رہے گی۔“ (افسانہ:اہرام)

”اب اس کو اپنی زندگی پر غصہ آنے لگا تھا۔خود سے نفرت ہونے لگی تھی مگر جان کس طرح دی جائے یہ مسئلہ بھی اس تاریک رات کے اندھیرے جنگل میں اتنا ہی گمبھیر ہے جتنا زندگی کو پالینا۔“

(افسانہ: جنگل میں اندھیری رات کا ایک منظر)

ظفر اوگانوی کے افسانوں کے جملوں میں جو معنوی ارتباط ملتے ہیں وہ انہیں اس عہد کے دوسرے افسانہ نگاروں سے ممتاز بناتے ہیں۔سماجی زندگی کا بکھراؤ،سیاسی انتشار،عدم تحفظ،نفسیاتی الجھن گویا عصری زندگی کے تمام رنگ کبھی ہلکے کبھی گاڑھے ملتے ہیں۔

ان کے مختلف افسانوں کے تجزیہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کے یہاں زندگی کن کن پہلوؤں سے منکشف ہوئی ہے اس کو سمجھنے کے لئے ان کے افسانہ ”ریس کے گھوڑے“ کا آخری جملہ دیکھیں:

”پھر صبح کی پہلی کرن میں ادھر سے گذرتی ہوئی ایک کار کی ہورن کی آواز سے گھوڑا چونکا اور سرپٹ بھاگ کھڑا ہوا۔“

ظفر اوگانوی کا کرب اُن کی ذات میں گم ہو کر پوری کائنات پر پھیل گیا ہے۔حال کی موجودگی کا احساس اور مستقبل کے خیال سے فرار کا کتنے شدید کرب کے ساتھ ان کے افسانوں میں اظہار ہوا ہے ذیل کے اقتباس میں دیکھیں:

”اگر ایسا نہیں ہے تو پھر میرا ذہن خالی کیوں ہے؟ میں اپنے جملوں میں ربط کیوں نہیں کر پا رہا ہوں۔اگر میں واقعی پاگل ہو گیا تو کیا ہوگا،میرے پیروں میں زنجیر کون ڈالے گا،،مجھ سے نفرت کون کرے گا اور مجھ سے کس کو محبت ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ میں سنجیدگی کے ساتھ یہ سوچنا چاہتا ہوں کہ پاگل نہیں ہوں بلکہ

میں ایک علامت ہوں اور مجھے یہ اہم کام آج ہی کر لینا ہے کہ آج ہی سب کچھ ہے اور آنے والا کل کیا پتہ آئے یا نہ آئے یا کیا لائے۔" (ریس کے گھوڑے)

....

"اس نے اپنے سات منزلہ مکان کی چھت پر آج پہلی بار یہ محسوس کیا کہ وہ اپنی بلندیوں میں بھی تنہا ہے اور تنہائی میں بھی بے مثال ہے۔ اس کے ایک گال پر فخر کی سرخی تھی اور دوسرے پر کرب کا پیلا پن۔ وہ اس ملے جلے احساس کے ساتھ چھت کی اس جانب آ گیا جہاں سے جھک کر عمارت کے لان کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اس نے نیچے، بہت ہی نیچے جھانکا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ ایک سناٹا...... خاموشی کی ایک بے مفہوم فضا، اس نے آنکھیں ملیں، پھر دیکھا پھولوں کی کیاریوں میں سورج کا پگھلا ہوا خون جم چکا تھا۔ زمین کے ہونٹوں پر پپڑیاں جم چکی تھیں۔" (بیچ کا ورق)

ظفر اوگانوی کے دیگر علامتی افسانوں میں "نئی سڑک" اور "شگاف" اہم ہیں۔ ان میں جو بنیادی علامتیں استعمال کی گئی ہیں ان کی تفہیم مشکل نہیں ہے۔ ان کے افسانے کا ہر کردار کسی نہ کسی المیے سے دوچار نظر آتا ہے اور یہی وہ تاثر ہے جو ان کے افسانے کو دلکشی عطا کرتا ہے اور آج کا انسان اس میں صاف دکھائی دیتا ہے۔

ظفر اوگانوی نے جدید اردو افسانہ کے افق کو وسیع کرنے میں زبردست رول ادا کیا ہے۔ انہوں نے افسانے کے معروضات کے انتخاب میں تنوع پیدا کیا ہے۔ اسلوب اور تکنیک کی سطح پر باوقار تجربے کیے ہیں۔ جدید افسانہ نگاری کی تاریخ کو روشن کرنے میں ان کا اہم اور لافانی رول ہے۔ زندگی کے مادی رشتوں کو انھوں نے زیادہ شعور عطا کیا ہے اور عصری، سماجی اور معاشرتی مسائل پر جبریت اور زندگی کے سنگین حقائق کو پیش نظر رکھ کر غور و فکر کا رجحان واضح کیا ہے اور ان کے افسانے معاشی اور معاشرتی صحت مندی کے ضامن ہیں۔

❖❖❖

عابد معز کے افسانوں کی شگفتگی

عابد معز اصلاً ڈاکٹر سید خواجہ معز الدین طبیب اخصائی تغذیہ (Medical Nutritionist) اور امراض استحالی (Metabolic Diseases) ہیں، مگر قلماً طبی ادب اور فکاہی ادب میں بیش بہا اضافہ کر کے اردو ادب کو تنوع بخشنے میں پیش پیش ہیں۔ اپنے بائیو ڈاٹا میں لکھا ہے:

> ''طنز و مزاح جسے بعض لوگ فکاہی ادب بھی کہتے ہیں میرا ادبی میدان ہے۔ ابتدا میں نے مضمون نگاری سے کی۔ شگفتہ افسانے لکھے اور کالم نگاری بھی کی۔ اپنی مادری زبان میں طبی یا سائنسی ادب تخلیق کرنے سے میں غافل نہیں رہا بلکہ اسے ایک ضرورت جانا۔ صحت، طب اور تغذیہ کے مختلف موضوعات پر میں نے اردو زبان میں مضامین، کتابچے اور کتابیں لکھی ہیں۔ اہم موضوعات پر سلسلہ وار مضامین بھی شائع ہوئے ہیں۔ ...... دسمبر ۲۰۱۶ء تک میری ۲۷ر چھوٹی بڑی کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں ۱۷ر کتابوں کا تعلق طب و تغذیہ سے ہے اور ۹ر طنز و مزاح کی کتابیں ہیں۔ ایک کتاب انگریزی زبان میں ہے۔''

(''عابد معز کی ادبی شناخت'' از: رفیق جعفر ص:۸۵)

یوں موصوف سنجیدہ اور فکاہی دونوں اسلوب میں اردو ادب کی خدمت والہانہ طور پر انجام دے رہے ہیں جن سے ان کی منفرد شناخت سامنے آئی ہے۔ ایک طرف اردو میں طبی اور سائنسی ادب کے فروغ دینے میں جٹے ہیں تو دوسری طرف کالم نگاری اور مزاح نگاری سے اخلاقی اور معاشرتی بالفاظ دیگر تہذیبی بگاڑ کی اصلاح میں منہمک ہیں۔ اوّل الذکر میدان میں ان کا اختصاص یہ ہے کہ طبی اور سائنسی اصطلاحات کو نہایت سنجیدگی سے سہل اسلوب میں جاگزیں کرتے رہے ہیں اور دوسرے میدان میں ان کی انفرادیت یہ ہے کہ ایک ماہر معالج کی طرح ادب کے قاری کو

کتنی اور کیسی ذہنی خوراک کس مقدار میں درکار ہے اسی لحاظ سے اپنی نگارشات میں موضوعات و مواد کو برتتے ہیں۔ اسی لئے ان کی مزاح نگاری کے اسلوب میں بڑا تنوع ملتا ہے۔ بقول کلیم چغتائی:

''عابد معز ایک 'طرحدار' انسان ہیں۔ شاید اسلئے وہ نئی طرحیں ڈالنے کی طرح طرح کی تدابیر سوچتے رہتے ہیں۔'' (مقدمہ گواہی: ''یہ نہ تھی ہماری قسمت'' ص:۱۰)

یہ ان کی طرح داری کے ہی نتیجے ہیں کہ اردو ادب میں شگفتہ افسانے کا اضافہ ہوا ہے۔

اردو مزاح نگاروں کے انشائیوں میں کہیں کہیں کہانی پن اور کردار نگاری ضرور ملتی ہے۔ شوکت تھانوی کے یہاں ایسے انشائیے خاصے ہیں۔ بعد ازاں باقاعدہ افسانہ کے عناصر ترکیبی کو ظریفانہ طور پر برتنے کا تجربہ عابد معز نے ہی کیا ہے۔ اس میں کہانی پن ہے، پلاٹ ہے، موضوع ہے، کردار ہے، مکالمہ ہے، نقطۂ عروج، وحدت تاثر اور انجام ہے مگر اسلوب طنزیہ و مزاحیہ ہے۔ اس لئے اسے شگفتہ افسانہ سے موسوم کیا ہے۔

تبدیلی فکر کے ساتھ فنون لطیفہ میں تکنیکی تجربے ہوتے رہے ہیں۔ اردو افسانہ بھی نت نئے تجربے سے گذرا ہے مگر فنی تجربے خواہ وہ تکنیکی ہوں، اسلوبیاتی سطح پر یا موضوعاتی سطح پر کئے گئے ہوں، وہی کامیاب ہوئے ہیں اور اپنی جڑیں جما پائے ہیں جو مزاج عام کو بھائے یعنی جو مزاج عام پر اپنے تاثر کا نقش ثبت کر پائے۔ عابد معز کے تجربے یعنی شگفتہ افسانے کو اتنی پذیرائی ملی کہ انہیں مجموعہ کی شکل دینی پڑی۔ لہٰذا ۲۰۱۱ء میں ۱۹ رشگفتہ افسانوں کا مجموعہ ''عرض کیا ہے'' کے نام سے شائع ہوا جو ہاتھوں ہاتھ نکل گیا اور ۲۰۱۴ء میں دوسرا ایڈیشن شائع کرانا پڑا۔ ۱۸ رافسانوں کا دوسرا مجموعہ ''یہ نہ تھی ہماری قسمت'' ۲۰۱۲ء میں شائع ہو کر بے حد مقبول ہوا۔ ہنوز قلم اسی رفتار سے اور دم خم کے ساتھ جاری ہے۔

بات نکلے بات سے اور وہ کہانی بنتی جائے، عابد معز کی مضحکہ خیزی کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کے اسلوب کا بنیادی عنصر مزاح ہے۔ ان کے ترکش میں طنز کے تیر کم ہی ہوتے ہیں کیونکہ بیشتر یہ خود کو مضحکہ بنا کر تنقید حیات کا کام انجام دیا کرتے ہیں لیکن جہاں حالات کی نزاکت نکتہ آفرینی پر مجبور کرتی ہے وہاں لطیف طنز سے بھی گریز نہیں کرتے۔ عموماً کہانیوں میں کردار کم ہوتے ہیں لیکن موضوع کی تصریح کے لئے ان ہی کرداروں کی زندگی سے جڑے تمام واقعات کی کڑیاں اس کے

پلاٹ کے تانے بانے بُنتے چلے جاتے ہیں۔

اب دیکھیں کہ مجموعہ ''عرض کیا ہے'' کا ایک افسانہ ہے ''وہ'' کون ہے ''وہ''؟'' اس کی جستجو قاری کو آخر تک باندھے رکھتی ہے۔ اس میں ازدواجی زندگی کے ایک پہلو پر انہوں نے کہانی بُنی ہے۔ اس کا پلاٹ، معاملاتِ اندرونِ خانہ کے تانے بانے سے بُنا گیا ہے، جہاں بقول سلطان اختر:

چلتا نہیں دانش وحکمت سے کوئی کام بنتی ہے یہاں بات حماقت سے زیادہ

ذرا دیکھیں! یہاں حماقتوں سے عابد معز کیسے پردہ اٹھاتے ہیں :

''صبح آنکھ کھلنے پر ہر شریف شوہر کی آنکھ بیوی سے ملتی ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ بیوی سے آنکھ لڑتی ہے۔ ازدواجی زندگی میں ہر صبح کوئی نہ کوئی ایسا مسئلہ درپیش رہتا ہے جس پر شوہر اور بیوی کی آنکھیں 'لڑ پڑتی' ہیں اور ان کے درمیان ایک نئی صبح کا آغاز اس قدیم لڑائی سے ہوتا ہے جو آدم اور حوّا کے جانشینوں کے درمیان روزِ اوّل سے چلی آرہی ہے۔''

اس تناظر میں خانگی معمولاتِ زندگی کے کام کاج نپٹانے کا دھونس ایک دوسرے پر جتلانے کے جو مکالمے یعنی نوک جھونک زن وشو کے درمیان شروع ہوتے ہیں، ان سے کہانی آگے بڑھتی ہے۔ بیوی کی شکوہ سنجی کا ایک سبب تیسرا کردار ''وہ'' ہے جو ویلن بن کر آتا ہے جسے بیوی سوتن باور کرتی ہے۔ بایں صورت زن وشو کی زبانیں جس طرح لڑتی ہیں وہ حس مزاح کو دو آتشہ کرتی ہیں۔ کلائمکس شوہر کے اعترافِ شکست پر یوں آتا ہے:

''آپ صحیح فرماتی ہیں:

''وہ'' آئے بزم میں اتنا تو میرؔ نے دیکھا پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

''وہ'' بہت پیاری، معصوم اور میٹھی ہے۔ اس کی آغوش میں پہنچ کر ہم دنیا سے بے خبر ہو جاتے ہیں اور ہم اپنی خیالی دنیا آباد کر لیتے ہیں۔ بستر سے اٹھنے کے بعد سے اس کا انتظار رہتا ہے۔ بعض وقت وہ جلد آتی ہے بعض مرتبہ بہت انتظار

کرواتی ہے۔ کبھی بے وفائی کرتی ہے۔ نہیں آتی تو اس کی جدائی بے چین کر دیتی
ہے۔ طبیعت بوجھل ہو جاتی ہے۔ گھنٹوں تڑپانے کے بعد جب آتی ہے تو پھر
ایک نشہ سا طاری ہو جاتا ہے۔''

تب بھید کھلتا ہے کہ ''وہ'' دراصل نیند ہے۔ اس افسانہ کا تھیم یہ ہے کہ روایتی متوسط گھرانے ترقی کی دوڑ میں شامل ہونے کی تگ و دو میں جن حالات سے جوجھتے ہیں، ان میں ذہنی سکون اور جسمانی راحت نیند ہی فراہم کرتی ہے۔ چونکہ عابد معز صحت کے ڈاکٹر ہیں، اس لئے نیند کی اہمیت و افادیت اپنے شگفتہ اسلوب میں یہاں اجاگر کر گئے ہیں اور اس کے توسط سے ازدواجی زندگی کے معمولات میں واقع کمیوں اور کج رویوں کو سامنے لا کر لمحہ فکریہ عطا کیا ہے۔

صاحبِ کتاب بننے کی آرزو کس کس گھاٹ کا پانی پلاتی ہے اور کس انجام کو پہنچتی ہے؟ اس کی سرگذشت ہر صاحبِ کتاب اپنے اندر گھونٹ لیا کرتا ہے مگر عابد معز اسے ''ہم صاحبِ کتاب ہوئے'' میں افسانہ بنا دیا ہے جو بظاہر لگتا ہے کہ اوّلاً صاحب کتاب بننے والے کی کھلّی اُڑائی گئی ہے مگر اصلاً یہ اردو نوازی کے میلان پر تازیانہ ہے۔ اس کا پلاٹ ابتدا تا انتہا واقعاتی تسلسل سے بالکل گوندھا ہوا ہے۔ اس کے کردار بطور مشیر کار چند ایڈیٹر صاحبان، ادباء و شعراء میں اثر و رسوخ رکھنے والے تجربہ کار مرزا صاحب، پھر کاتب، پبلشر اور جلد ساز ہیں۔ ان کے درمیان ہوئے مکالمے ہی افسانہ کی جان ہیں جو بظاہر مضحکہ خیز ہیں مگر حد درجہ عبرت انگیز ہیں۔ مثلاً :

''چند مہینوں میں کئی مرتبہ وعدہ خلافی کرنے کے بعد کاتب نے کتابت شدہ صفحات حوالے کئے۔ کاتب نے جلی حروف میں بڑا بڑا اور بہت واضح لکھا جس پر ہمیں اردو کے ابتدائی قاعدہ کا گمان ہوا۔ ہم نے کاتب سے شکایت کی تو کاتب نے موٹے عدسوں والی عینک کے اوپر سے آنکھیں نکال کر کہا: ''اردو پڑھنے والی نسل بوڑھی ہو چکی ہے۔ قریب کی نظر کمزور ہے۔ باریک لکھتا تو کتاب کے ساتھ محدّب عدسہ بھی دینا پڑتا۔ یوں بھی نوجوان نسل کی آنکھیں کون سی ٹھیک ہیں۔ ٹیلی ویژن بینی کے سبب کم سن بچے تک چشمہ لگانے لگے ہیں۔'' عذرِ لنگ سن کے خاموش ہونا پڑا۔''

''جلد ساز نے پُرخلوص مشورہ دیا: ''اردو کی کتاب ہے، مضبوط جلد سازی ہونی چاہئے۔ چمڑے کی جلد نہ سہی گتھے کی جلد ضرور بنوایئے......اردو کی کتاب ایک ہی مرتبہ چھپتی ہے۔ دوسری اشاعت کی نوبت نہیں آتی۔ عرصہ تک محفوظ رکھنے کے لئے مضبوط جلد ضروری ہے۔''

یوں تمام مکالمے مزاحاً گھڑے ہوئے نہیں بلکہ عین فطری ادائیگی پر محمول اور مربوط ہیں۔ ویسا ہی افسانہ کا انجام بھی ہے جس میں صاحبِ کتاب کا کرب اردو نوازوں کے رجحان پر مزاجاً بڑی لطافت سے طنز کا نشتر یوں چلاتا ہے:

''چند دن بعد کتاب چھپنے بلکہ چھپوانے کی خوشی ماند پڑنے لگی تو یوں محسوس ہوا جیسے کوئی کمزور اور معذور لڑکا مقابلے میں سب سے پیچھے رہ جاتا ہے تو اپنی خفت مٹانے کیلئے بازار سے کپ اور شیلڈ خریدتا ہے۔ ان پر اپنا نام کندہ کرواتا ہے اور الماری میں سجاتا ہے۔ ہماری کتابیں بھی ڈرائنگ روم کی الماری میں ایسے ہی سجی پڑی ہیں۔''

لہٰذا یہ لوازمات افسانہ کی تکمیل پر مبنی لطیف مزاح اور طنز کے امتزاج کا عبرت انگیز فن پارہ ہے۔

یہ دو افسانوں کا تجزیہ بطور مثال اس صراحت کے لئے پیش کیا ہے کہ متذکرہ دونوں افسانوی مجموعے میں شامل تمام افسانوں کا اسلوب مزاحیہ و طنزیہ ضرور ہے مگر یہ انشائیے نہیں ہیں کہ انشائیے میں غیر مربوط موضوعات و واقعات کا لامتناہی سلسلہ ہوتا ہے جنہیں مزے لے لے کر پڑھا تو جا سکتا ہے لیکن ان کے موضوع یا واقعہ کا مزے مزے سے بیان ممکن نہیں جبکہ ان فکاہی افسانے میں کہانی پن ہے، واقعاتی تجسس ہے، کردار ہے، دلچسپ مکالمہ ہے، تمہید ہے، نقطۂ عروج ہے اور انجام بھی ہے۔ لہٰذا قاری کی یادداشت ان کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے۔ اس لئے انشائیہ کے مقابلے یہ ذہن پر دیرپا تاثر چھوڑ جاتے ہیں جو ان کے واقعے کے مزیدار بیان کو ممکن بناتا ہے۔ اس طور افسانہ نگاری میں ڈاکٹر عابد معز کی نادرہ کاری کی کوشش کامیاب ہے کہ اردو کے فکاہی ادب کو نیا ذائقہ دیا ہے اور افسانوی ادب میں خوشگوار اضافہ کیا ہے۔

بیگ احساس کا افسانوی مجموعہ ''دخمہ''

پروفیسر بیگ احساس بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں ابھرنے والے افسانہ نگاروں میں سے ہیں مگر اپنے ہم عصروں کے مقابلے سبک رَو رہے۔ اب تک ان کے تین افسانوی مجموعے ''خوشۂ گندم''، ''حنظل'' اور ''دخمہ'' منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعہ ''دخمہ'' پر ساہتیہ اکاڈمی، دہلی نے 2018ء میں ایوارڈ سے نوازا ہے جس کی پذیرائی اکیسویں صدی میں ہو رہی ہے۔ افسانوں کے علاوہ انھوں نے تحقیق و تنقید پر بھی قلم اٹھایا اور ''کرشن چندر: شخصیت اور فن'' نیز ''شورِ جہاں'' جیسی اہم کتابیں اردو ادب کی نذر کیں۔ ''ہندستانی ادب کے معمار: شاذ تمکنت'' نامی مونوگراف بھی لکھا جس کی ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی ہوئی۔ ماہنامہ ''سب رس'' حیدر آباد کی ادارت بھی طویل عرصہ سے کرتے آرہے ہیں۔ علاوہ ازیں ''دکنی فرہنگ'' بھی مرتب کی۔ اپنی چند کہانیوں کا انگریزی ترجمہ "Twilight of the mind" کے نام سے کیا۔ ان سب کے باوجود افسانہ نگاری ہی ان کی پسندیدہ صنف رہی۔ وہ بنی بنائی افسانوی ڈگر پر چلے نہ ہر موضوع کے پیچھے دوڑے۔ کہانی پن کی جستجو میں یک سطحی بیانیہ کو راہ دی نہ علامت، استعارہ اور تجربہ کے سہارے کہانی بُنی۔ اپنی راہ الگ نکالی اور ایسا اسلوب برتا جو بیانیہ ہوتے ہوئے بھی مختلف ابعاد رکھتا ہے لیکن یہ ابعاد بیانیہ کے اندرونی تسلسل میں پیوست ہوتے ہیں۔ ان کا اسلوب، افسانہ کے نفس موضوع کے ساتھ بدلتا رہتا ہے لیکن اس پر ان کی خلاقانہ شان جاری وساری رہتی ہے۔ اس طور پر اپنے عہد، اس کے تضادات، کمزوریوں اور تقاضے و مطالبات ایسی شدت کے ساتھ اپنے افسانے میں لاتے ہیں کہ قاری کو ان میں انوکھا پن اور اچھوتا پن لگتا ہے جو متاثر بھی کرتا ہے۔

بیگ احساس کے اسلوب میں ایسی لچک ہے کہ جس موضوع کو اجالتے ہیں اسکا حق ادا ہو جاتا ہے۔ کہیں چونکا دینے والا پیرایہ، عبرت خیز انجام، فکر پیدا کر دینے والا لمحہ، فکری عناصر کی جامعیت کے

ساتھ برتاؤ، نفسِ خیال کو اجاگر کرنے کی ایسی کوشش جو صورتِ واقعہ کی بھرپور عکاسی کر دے، انکے افسانوں میں انفرادیت کی شان پیدا کرتی ہے۔ یہ افسانے جس طرح کا پیغام دیتے ہیں وہ قاری کو اسلئے متاثر کرتے ہیں کہ اپنے اسلوب کی سحر کاری سے معلوم و معمول کی بات کو نامعلوم، غیر معمولی اور بے مثل بنا دیتے ہیں۔ انکی کہانیوں کی فضا اور کرداروں کے درمیان پہنچ کر قاری کو اپنا محاسبہ کرنے، اپنے معاشرے، اس میں وقوع پذیر حالات، اس تناظر میں اپنی ذات اور حیثیت کو جاننے پہچاننے کی ترغیب ملتی ہے۔

بیگ احساس کے موضوعات بھی اوروں کی طرح اپنے گرد و پیش کے ہی ہوتے ہیں۔ مذہبی منافرت و عصبیت، فسادات کے اثرات و مضمرات، اقلیتوں پر توڑے گئے فرقہ پرست اکثریتی جماعتوں کے مظالم، تہذیبی اور معاشی طور پر زوال پذیر مسلم معاشرے کی زبوں حالی، رویے، رجحان، سماجی برائیاں، سرمایہ و محنت کی کشمکش، سیاسی چپقلش کی عکاسی دوسروں کے یہاں بھی ملتی ہے مگر ان پر بیگ احساس نے جس طرح کہانیاں تراشی ہیں ان میں ایک طباع اور طبع زاد ذہن کی منفرد کارفرمائی جھلکتی ہے۔ تاریخی و تہذیبی حوالے تو مشترکہ میراث ہیں مگر ان کا برتاؤ بیگ احساس کے یہاں مختلف ہے مثلاً ان کے افسانے ''دخمہ''، ''رنگ کا سایہ''، ''کھائی'' اور ''سنگ گراں'' میں ماضی سے حال اور حال سے ماضی قریب و بعید میں اتر جانے کا عمل اتنا دلکش ہے کہ قاری ان میں ڈوبتا ابھرتا نامحسوس طور پر منطقی انجام تک پہنچ جاتا ہے۔ اپنے عہد کی کروٹیں لیتی زندگی کو تاریخی و تہذیبی تناظر میں اس طرح آئینہ کرتے ہیں کہ ان سے جو ٹریجڈی ابھرتی ہے وہ ہڈیوں تک کو پگھلا دیتی ہے۔ معروف ناقد ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی اپنے مضمون ''بیگ احساس کے افسانے: انفرادو اختصاص'' میں بیگ احساس کی کہانیوں کے بنیادی اوصاف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> ''...... بیگ احساس کے افسانے جب نظر سے گزرے تو سنگِ گراں، کھائی، درد کے خیمے، دخمہ، سانسوں کے درمیاں اور دھار جیسی کہانیوں نے مجھے پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا۔ ان کہانیوں میں قاری کو مسحور کرنے، متاثر کرنے اور اسے دورخی قدروں، خودسر حقیقتوں اور بدلتی فکروں سے آگاہ کرنے کی پوری پوری صلاحیت موجود ہے۔ یہ خوبیاں بہت آسانی سے کسی کہانی میں پیدا نہیں

ہو جاتیں۔اس کے لئے شرط ہے کہ افسانہ نگار کا اسلوب دلچسپ ہو، اس کا
مطالعہ وسیع ہو اور وہ قاری کو نئے حقائق سے آگاہ کرنے کی اہلیت رکھتا ہو اور
بلاشبہ بیگ احساس کے پاس یہ تمام خوبیاں موجود ہیں۔''

(مطبوعہ ''سبق اردو'' اگست تا اکتوبر ۲۰۱۸ء ص: ۴۳)

ان کے افسانے بدلتے حالات اور رجحانات و عوامل کو اس طرح سامنے لاتے ہیں کہ مذہبی جنون اور آزاد خیالی، تہذیبی اقدار سے جڑاؤ اور اس سے بے گانگی آپس میں ٹکراتے اور ٹوٹ کر جلتے بجھتے ستارے کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔حیدرآبادی تہذیب کے پروردہ مسلم گھرانوں کے احساسِ تفاخر اور نئے دور کی معاشی الجھنوں سے نبرد آزما نئی نسل کے درمیان کشمکش دلکش انداز میں ابھر کر سامنے آتی ہے۔افسانہ ''کھائی''، ''دھار''، ''نمی دانم کہ''، ''دخمہ'' اور ''رنگ کا سایہ'' میں ان حالات کی عکاسی فنی رچاؤ کے ساتھ ملتی ہے اور متاثر کرتی ہے۔

افسانہ ''سانسوں کے درمیان'' اور ''دخمہ'' نئی تکنیک سے بُنا ہے۔یہ تکنیک 'شعور کی رو' کے مماثل ہے۔زمانہ کروٹیں بدلتا ہے تو ذہنی رو کس طرح بدلتی ہے اور اس کے کیا ثمرات برآمد ہوتے ہیں، ان کی عکاسی ماضی اور حال کے تناظر میں تمام تر جزئیات کے ساتھ ان افسانوں میں ملتی ہے۔ 'شعور کی رو' کی تکنیک کا تعلق موضوع سے زیادہ Method سے ہے جس کے تحت دماغ میں آئے بے ربط امور نئی ترتیب میں ڈھلتے ہیں مثلاً افسانہ ''سانسوں کے درمیان'' کا مرکزی کردار مختلف نفسیاتی کیفیات کے تحت تیزی سے محسوسات اور تخیلات کے ایک منطقہ سے دوسرے منطقہ میں حرکت کرتا ہے۔پہلے اس کے والد کو نازک حالت میں مہنگے ہسپتال میں بھرتی کیا جاتا ہے تو وہاں کی فیس کا انتظام اسے الجھن میں ڈالتا ہے اور جب اس کے والد کی حالت قدرے سنبھلتی ہے اور ICU سے Paying room میں منتقل کیا جاتا ہے تو وہ اس الجھن کا شکار ہو جاتا ہے کہ میاں بیوی کے پاس نئے کپڑے، جوتے وغیرہ تو ہیں نہیں، کیا کریں گے؟ انہیں دیکھ کر لوگ کیا کہیں گے؟ اس سوال کے سر اٹھاتے ہی افسانہ کے بنیادی قضیے مہنگے ہسپتال کی فیس اور والد کے مرجانے کا اندیشہ تحلیل ہو جاتے ہیں اور مرکزی کردار کی دبی ہوئی خواہشات یکے بعد دیگرے

اسے ایک منطقۂ وقت سے دوسرے میں ڈھکیلتی رہتی ہے اور وہ خود VIP ماحول میں ڈھلنے کی جتن میں لگ جاتا ہے تاکہ ہسپتال میں قیام کے دوران اگر والد مر گئے تو اپنے پرایوں کے جمع ہونے پر خود، گھر اور گھر والوں کی حالت بہتر دکھائے اور بھرم رہ جائے۔ بالآخر اس کا باپ، اپنے بیٹے، بہو اور پوتے پوتیوں کی زندگی میں جینے کی ایک نئی امنگ بھر کر قبر میں اتر جاتا ہے۔ اس طرح بیگ احساس نے افسانہ انجام تک پہنچانے کے درمیان معنویت اور تناظرات کی کئی تہیں جمائی ہیں۔

'دخمہ' اس گول عمارت کو کہتے ہیں جس کی اونچی چھت پر پارسیوں کی نعش رکھ دی جاتی ہے تاکہ اس پر تیز دھوپ پڑے اور گدھ اسے دیکھ کر آئے اور نعش کو نوچ کھائے۔ دخمہ کو تہذیبی اقدار اور رواداری کی پامالی کا استعارہ بنا کر افسانہ بُنا گیا ہے۔ اس کا مرکزی کردار ماضی بعید کے حیدر آباد کے غیر مصروف VIP علاقہ میں بنے شراب خانہ 'میکدہ' کے مالک پارسی سہراب کی آخری رسومات میں شامل ہے۔ وہ پارسی گٹھ کے گیٹ پر کھڑا ہے کہ اسے اندر جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اسی اثناء اس کی یادوں کا دریچہ کھلتا ہے اور وہ سہراب اور اس کے ''میکدہ'' کے حوالے سے حیدر آباد کی قدیم و جدید تہذیب و تمدن اور معاشرت، پارسیوں کے ورود و نابود، ان کے عقائد و رسومات اور معاشرتی رویے کی تفصیل، مسلمانوں کے تئیں قومی و بین الاقوامی سطح پر برتے گئے غیر مسلموں کے رویے کے بیان سے افسانہ کا تانا بانا بنتا چلا جاتا ہے جس میں ماضی اور حال کے متبدل حالات و رجحانات کی ایسی عکاسی ہوتی ہے کہ مستقبل کے مضمرات بھی نظر آنے لگتے ہیں۔ مرزا حامد بیگ کے لفظوں میں:

> ''دخمہ گاتھی (Gothic) طرزِ تعمیر کا افسانہ ہے، جس میں عقائد، رسومات، روایات، تاریخ، سیاست اور انسانی روابط کے متعلقات کی محرابیں اک دوجے میں پیوست ہیں۔ اس افسانے میں جس فراست کے ساتھ حیدر آباد میں ملوکیت کے خلاف چلنے والی کمیونسٹوں کی تلنگانہ تحریک اور آزادی (۱۹۴۷) کے بعد پولیس ایکشن نیز زبان کی بنیاد پر ریاستی حد بندیوں کا حوالہ دیکھنے کو ملتا ہے، اس طرح تو ابراہیم جلیس کی لانگ فکشن ''دو ملک، ایک کہانی'' میں بھی دیکھنے کو نہ ملا......
> پارسی گٹھ کی تفصیل اور میت سے متعلق پارسی رسوم و رواج کی تفصیل بھی حیران

کن ہے۔افسانہ نگار، اپنے ہرافسانے میں اس نوع کی حیرانی بانٹتے چلے آئے ہیں لیکن طریقۂ کار کے فرق کے ساتھ اس افسانہ میں یہ کام شعور کی رو کو مہارت کے ساتھ برت کر کیا گیا۔یوں ماضی اور حال اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ افسانہ کا حصہ بنتے ہیں...... زمانہ کس طرح کروٹ لے رہا ہے؟ اس کی تفصیل نہایت عمدگی سے اس دورانیے میں بیان کی گئی ہے جب سہراب کے اعزا اور چند ایک شناسا دخمہ کے اندر سہراب کی آخری رسومات میں مصروف رہے۔''

(افسانوی مجموعہ ''دخمہ'' ص:۱۴-۱۶)

ملوکیت کی جگہ جمہوریت نے لے لی تو تہذیب، معاشرت، سیاست، تجارت، لوگوں کے رجحانات ورویے، زندگی کا برتاؤ، کن کن مراحل سے گذرے اور کس طرف جارہے ہیں۔ملوکیت تھی تو کیا تھا، جمہوریت آئی تو کیا ہوا اور کیا ہورہا ہے؟ جمہوریت نے ہجومی نفسیات کو ہوا دی تو اس کے ثمرات کیسے ہیں؟ سب اس افسانہ میں نظر کے سامنے پھرنے لگتے ہیں۔

حیدرآباد میں عثمانی دور کے خاتمہ کے بعد کے پس منظر میں افسانہ ''رنگ کا سایہ'' بھی ظہور پایا ہے مگر یہ مسلم لڑکا اور ہندولڑکی کے محبت کی المناک کہانی ہے۔ تکنیکی اعتبار سے یہ تہہ دار بیانیہ پر مبنی ہے۔ دونوں کے والد نظام کی حکومت سے وابستہ تھے مگر پولیس ایکشن نے دونوں خاندانوں کو بے گھر کردیا۔ایک مدت تک اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بعد اتفاق سے دونوں کو شہر سے پرے بیڑی مزدور کالونی میں مکان مل جاتا ہے۔نوابی عہد کے خاتمہ کے ساتھ ہی حیدرآبادی معاشرہ کی فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور رواداری بھی ختم ہوجاتی ہے اور مذہبی منافرت ایسی جڑ پکڑ لیتی ہے کہ کالونی میں جو ایک کنواں ہوتا ہے اس کے ایک سرے پر ہندوؤں کی چرخی اور دوسرے سرے پر مسلمانوں کی چرخی لگی ہوتی ہے۔کنویں پر آتے جاتے اگر کسی مسلمان سے ہندو کا گھڑا مس کرجاتا ہے تو وہ ناپاک ہوجاتا ہے اور مسلمان کو اس کے لئے جھڑکی سہنی پڑتی ہے۔ایسی منافرت کی فضا میں دونوں کی محبت کا انجام یہ ہوتا ہے کہ مسلم لڑکے کو ماں کے ساتھ راتوں رات گھر چھوڑ کر نئے شہر میں اپنی بہن کے یہاں پناہ لینی پڑتی ہے۔پھر چار برسوں تک ان کے لئے کالونی میں لوٹنا ممکن نہیں ہوتا

اور بہن کے یہاں ناگوار حالات میں وقت کاٹا کرتا ہے۔ اس کی ماں گھر چھوڑنے کے صدمے سے بالآخر دم توڑ دیتی ہے اور اس کی وصیت کے مطابق جب ماں کو دفن کے لئے وہیں لے جا رہا ہوتا ہے جہاں اس کے والد مدفون تھے جس علاقہ کو چھوڑ کر کالونی میں آبسا تھا۔ کہانی کا آغاز اسی مرحلہ میں مرکزی کردار کے اندر ابلتے ہوئے لاوا کے پھوٹ پڑنے سے ہوتا ہے۔ وہ راوی ہے:

''ہم اسی جگہ جا رہے تھے جہاں سے ہمیں راتوں رات افراتفری کے عالم میں بھاگنا پڑا تھا۔ امّی کا تو صرف جسم ساتھ آیا تھا روح شاید وہیں بھٹک رہی تھی۔ پھر جسم بھی اس قابل نہیں رہا کہ ان کے وجود کا بار اٹھا سکتا۔ آج اس جسم کو اسی زمین کے سپرد کرنا تھا۔'' (ص:150)

پھر اس کی سوچ ان سوالات کے بھنور میں پھنستی ہے کہ...... ''کیا امّی کی موت کا ذمہ دار میں ہوں؟...... امی کو گھر چھوڑنے کا غم تھا لیکن گھر چھوڑ کر تو سب بھاگے تھے پھر اس کی ذمہ داری ہمارے عشق پر کیسے آ گئی؟'' یہی سوالات اسے دربدری کے پس منظر میں لے جاتے ہیں اور پھر ماضی کے واقعات و حادثات، محبت کی واردات، اپنی اور ماں کی نفسیاتی کشمکش کی کیفیات بیان کرتا تدفین کے مراحل سے گذرتا ہے۔

تیسرے دن قبرستان سے فاتحہ پڑھ کر لوٹتا ہے تو لکشمی کا بہنوئی ملیا رکشا والا مل جاتا ہے۔ اس سے مل کر وہ اپنا گھر دیکھنے کی خواہش ظاہر کرتا ہے تو ملیا اسے لے جاتا ہے۔ اسے اپنے گھر میں لکشمی براجمان ملتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو حیرت اور خوشی سے لبریز جذبات سے اک ٹک دیکھتے رہتے ہیں پھر گفتگو ہوتی ہے تو راوی کے ذہن کو جھٹکے پہ جھٹکا لگتا ہے کیونکہ ان لوگوں کے کالونی چھوڑنے کے بعد وہاں کچھ نہیں ہوا، فساد کی ہوا محض مسلمانوں کو کالونی سے بھگانے کیلئے بنائی گئی تھی جس کا بہانہ اس کا عشق بنا۔ دونوں کے بچھڑنے کے ایک سال بعد لکشمی کی شادی کر دی جاتی ہے مگر اس کے یہاں جولڑکا پیدا ہوتا ہے وہ اس کے محبوب کی شبیہ لے کر آتا ہے جس کے سبب لکشمی کا خاوند اسے چھوڑ دیتا ہے تو وہ خالی گھر لکشمی کو الاٹ کرا دیا جاتا ہے۔ یہ سنتے ہی راوی ٹپٹا کر بولتا ہے:

''لیکن لکشمی! تم تو جانتی ہو کہ ہمارے درمیان ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔'' تو لکشمی

بولتی ہے: ''ہاں، مگر کوئی ماننے کو تیار نہیں ہے، خسماں کھا کھا کے تھک گئی۔ ان (خاوند) سے کتنا عاجزی کی، نہیں مانے آخر چھوڑ دیا ہم کو— بڑی بے غیرتی کی زندگی ہے۔ انا (بہنوئی) اور یہ بچہ نہیں ہوتا تو باؤلی میں کود کر مر جاتی۔''

یہیں پر کہانی راوی کو ادھیڑ بُن میں چھوڑ کر ختم ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی پہلی محبت کو یوں ہی دم توڑتا تڑپتا چھوڑ دے یا گلے لگالے اور گلے لگائے تو کیسے؟

اس کہانی کے کینوس سے کئی رنگ ابھرتے اور توجہ چاہتے ہیں۔ وہ یہ کہ حیدرآباد میں پولیس ایکشن کے بعد سب کچھ لٹ جانے پر بھی مسلم گھرانوں کا احساسِ تفاخر نہیں مرتا۔ عہد نظام کی معاشرتی رواداری میں جو مذہبی عصبیت اور منافرت کا زہر گھلتا ہے اس کا اثر زندگی کے ہر شعبے پر پڑتا ہے۔ اس کے برعکس لکشمی اور اس کے کنبہ کے لوگوں میں جو حیدرآبادی تہذیب کا رچاؤ ہے وہ ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ حالات کے تحت اس کالونی میں جو بھی تھے سب بیڑی مزدور تھے مگر لکشمی کے خاندان کا لوگوں کے ساتھ وہی مؤدبانہ رویہ تھا جو اسے نوابی تہذیب سے ملا تھا۔ اس لئے یہ خاندان مرکزی کردار اور اس کی ماں سے عزت و احترام کا سلوک کرتا ہے اور لکشمی کو تو اپنے عاشق کی شکل و شباہت نواب زادہ کی سی لگتی ہے۔ وہ اس پر فریفتہ ہو جاتی ہے اور اپنے دل و دماغ میں اس نواب زادہ کی شبیہ اس طرح بٹھا لیتی ہے کہ اس سے کبھی جنسی تعلق نہ قائم کرنے اور بچھڑنے کے باوجود جب بچہ جنم دیتی ہے تو اسی کے شبیہ کا ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں لکشمی تہمت کی مار سے تڑپتی رہتی ہے۔ یہ پہلو محبت کی واردات کو لازوال بنا دیتا ہے۔ دوسری طرف لکشمی کا عاشق بھی اسے نہیں بھول پاتا جبکہ صدمے سے دوچار اپنی ماں کی موت کا ذمہ دار گردانا جاتا ہے۔ اس کی ٹیس سے وہ نفسیاتی کشمکش سے دوچار تھا ہی لکشمی سے دوبارہ ملنے کے بعد اس کے اندر دوسری کشمکش جنم لے لیتی ہے۔ افسانہ کے کینوس پر ایک بیوہ کے بچوں سمیت کالونی میں اٹھ آنے کا ناسٹلجیا کئی رنگ بدلتا ہے اور ہر رنگ پلاٹ میں جاذبِ نظر ہے۔ افسانہ کی طوالت اکتاہٹ پیدا نہ کرے اس کے لئے بڑی چابک دستی سے بیڑی مزدور کالونی سے متعلق یادوں کے بہاؤ کو توڑ توڑ کر بیان کیا گیا ہے مگر پلاٹ میں جھول نہیں آیا ہے۔ اس طور اپنی بُنت کے اعتبار سے یہ ایک شاہکار افسانہ بن گیا ہے۔

بیگ احساس نے عائلی زندگی کی بھی رنگارنگ عکاسی کی ہے اور زمانہ کے تغیرات سے پیدا سلگتے الجھتے مسائل کو سامنے کیا ہے۔ اس تعلق کے افسانوں میں ''سنگِ گراں'' اور ''نجات'' کے ٹریٹمنٹ نے مجھے خاصا متاثر کیا۔ ان میں نسوانی احساسات وجذبات کی فطری اور نکتہ سنج عکاسی ملتی ہے۔ افسانہ ''سنگ گراں'' میں مذہبی کٹرپن راست نسوانی فطرت سے کیسے الجھتا ہے؟ اس کا منظرنامہ سوچ کو مہمیز کرتا ہے۔ عہدنو میں روایات کا شیرازہ بکھر گیا ہے، مشترکہ خاندانی نظام ٹوٹ گیا ہے، ایسے میں کیا کیا بکھیڑے جنم لیتے ہیں؟ اس کا کوائف افسانہ کا تانا بانا بنتا ہے۔ ایک روایتی مذہبی گھرانے کی پروردہ لڑکی جاب کرتی ہے اور اپنے والدین کے علم میں لائے بغیر کورٹ میریج کر لیتی ہے مگر خاوند کے پاس اپنا گھر نہیں ہوتا، نہ کرایہ پر مکان لینے کی بضاعت ہوتی ہے۔ ایسے میں لڑکی کی کوکھ میں بچہ وجود پاتا ہے۔ خاوند کو بچہ کا وجود گوارہ نہیں اور لڑکی کو بھی حمل کے افشا پر گھر سے نکالے جانے کا خوف ہے۔ ایسی صورت میں لڑکی ممتا کی پکار پر حد درجہ ذہنی تناؤ اور نفسیاتی کشمکش سے گزرتی ہے اور بالآخر اسقاطِ حمل کرانے پر مجبور ہو جاتی ہے مگر جب MTP کے ذریعہ اس کے بچہ کو اندھے کنویں میں دھکیل دیا جاتا ہے ایسے میں اس کی ممتا کھلی آنکھوں سے خواب دیکھتی ہے :

''شاید وہ محفوظ ہے۔ کوئی قافلہ اِدھر سے گذرے گا تو اسے باہر نکالے گا...... اسکی وجاہت نازک انگلیوں کو زخمی کرے گی اور پھر وہ سات مقفل دروازے کی پرواہ کئے بغیر بھاگے گا تو دروازے خود بخود کھلتے جائیں گے لیکن قید خانے سے معبر بن کر نکلے گا۔ اس وقت تک وہ بینائی کھو چکی ہوگی۔ اس کا بیٹا اسے اندھیروں سے نکالے گا۔''

یہ افسانہ کا اختتامیہ ہے جس میں اس کا بچہ ماضی بعید کے یوسفؑ کے استعارے میں ڈھل گیا ہے۔ اس طور اس سادہ بیانیہ افسانہ میں کئی معنوی ابعاد کی جھلک ملتی ہے۔

افسانہ ''نجات'' عائلی زندگی پر پڑے ان حالات کا عکاس ہے جو 'نائن الیون' کے بعد وبا کی طرح دنیا میں پھیلے ہیں۔ آزاد خیالی اور رواداری، مذہبی کٹرپن کے نرغے میں آئی جس کے نتیجہ میں افسانہ کے کردار کٹر مذہبی انجینئر فرحان کے لئے ایک مغربی ملک میں رہنا اور روزی کمانا ناممکن ہو گیا۔ کیوں اور کیسے؟ اس کا جواب کھوجنے پر افسانہ، قاری کو بڑی چابک دستی سے لگا دیتا ہے۔

فرحان احساسِ محرومی کا شکار ہو جاتا ہے پھر اسے جنون کا عارضہ لاحق ہو جاتا ہے۔ اس کے جنون کا شکار اس کی بیوی عاشی جس طرح ہوتی ہے، وہ نوعیتیں عاشی کے لئے روح فرسا ہوتی ہیں۔ اس کے باوجود وہ ہندوستانی پتی ورتا بیوی کی طرح اپنا سہاگ بچانے کی ہر کوشش کرتی ہے لیکن جب فرحان کے جنون کا طوفان تھمتا ہے تو عاشی فرحان سے طلاق لینے کا فیصلہ کر لیتی ہے کیوں؟ یہی افسانہ کا کلائمکس ہے جو لمحہ فکر یہ چھوڑ جاتا ہے۔ وہ فرحان کے دوست مظہر کو بتاتی ہے:

> ''میں آپ کو کیسے بتاؤں۔ میں تو ویسی ہی رہ گئی۔ پہلے نفرت اور دیوانگی کی وجہ سے دور رہتے تھے اب شرمندگی اور احسان کی وجہ سے دور رہتے ہیں...... میں انہیں اس عذاب سے نجات دلانا چاہتی ہوں۔''

یہ فقرے کئی معنوی ابعاد چھوڑ جاتے ہیں۔ نسوانی حساسیت کو جس طرح بیگ احساس نے اس میں اجالا ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔

نسوانی احساس و جذبات کا نقیب افسانہ ''شکستہ پر'' بھی ہے مگر اس میں ماڈرن کلچر کے اثر سے اُبھی نفسیاتی الجھاؤ اور سوچ کی دھارا منعکس ہوتی ہے۔ اس میں مرکزی کردار سشما، اس کا شوہر سمیر اور ان کی بیٹی سمن کے نفسیاتی الجھاؤ کی گتھیاں سہج سہج کھلتی ہیں اور قاری کی توجہ کو جکڑتی جاتی ہیں۔ بالآخر جب سمن اچانک گھر چھوڑ جاتی ہے اس موقع پر سشما کی داخلی کشمکش اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکا کر اور چہرہ پر طمانیت ظاہر کر کے اس کرب سے نجات دے دیتی ہے۔ سشما کی ایسی کیفیت اس کی سرشت میں داخل روایتی تہذیبی اقدار اور ماڈرن کلچر کے برتے گئے شعار کے درمیان کشمکش کا مظہر ہے۔ یہ کیفیت و نوعیت افسانہ کے سادہ بیانیہ کو بھی معنوی سطح پر اٹھا کر کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہے۔ یہی بیگ احساس کی افسانہ نگاری کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس طرح بیگ احساس نے اپنے افسانوں میں انسانی صورتِ حال اور رویے کے مختلف پہلوؤں کی فنکارانہ تجسیم کی ہے۔ افسانوں کے پلاٹ میں یہ جس تکنیک کو برتتے ہیں وہ ٹریٹمنٹ میں بدل جاتا ہے اور افسانے میں فکری گہرائی در آتی ہے۔ اس فکری عناصر میں جامعیت ہوتی ہے کہ یہ کفایت لفظی سے کام لیتے ہیں، جن سے اکیسویں صدی کے اردو افسانوں میں ان کی انفرادی اساس اجاگر ہوتی ہے۔ ❖❖❖

صدیق عالم: ''چارنک کی کشتی'' اور عورتوں کے مسائل

صدیق عالم برصغیر کے ان چند نمایاں ناموں میں سے ایک ہیں جنھوں نے اپنے فکشن میں عورتوں کی اس تصویر کو پیش کرنے تک خود کو محدود نہیں رکھا ہے جسے ہم اپنے معاشرے میں دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں بلکہ وہ اس کے اندر کی عورت کو سامنے لانے پر قادر ہیں جن تک ہماری نظروں کی رسائی ممکن نہیں ہوتی۔ جہاں تک ان کے ناول ''چارنک کی کشتی'' میں نسوانی کرداروں کا تعلق ہے تو ان پر روشنی ڈالنے سے پہلے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ تھوڑا بہت صدیق عالم کے بارے میں بتا دیا جائے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ بنیادی طور پر وہ فکشن نگار ہونے کے باوجود انھوں نے شاعری کے اتنے نئے تجربے کیے ہیں کہ وہ حیران کن ہیں بلکہ اپنے اس جنون میں انھوں نے نثری نظم نگاری میں کمال دکھاتے ہوئے اپنے ناول ''چارنک کی کشتی'' کو نثری نظم کی ہیئت میں لکھ ڈالا ہے۔ پڑھنے والے اسے ناول کی ایک کمزوری سمجھ سکتے ہیں مگر میں اس سے اتفاق نہیں رکھتا۔ اس بحث سے قطع نظر میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ کسی بھی تخلیق کو کسی preconceived notion کے ساتھ پڑھنا دانشمندی نہیں ہے۔

ناول ''چارنک کی کشتی'' میں چھوٹے بڑے بہت سارے نسوانی کردار ہیں جن میں دو اہم نسوانی کردار کو میں نے سمجھنے کی کوشش کی ہے، ایک اینگلو انڈین لڑکی ایلین اور دوسری کلیسا۔ اختصار کی خاطر میں نے صرف کلیسا کی تصویر کشی تک اپنے آپ کو محدود رکھا ہے۔ بظاہر اس ناول میں عورتوں کے استحصال کی کہانی بیان کی گئی ہے مگر یہ قرأت اس کردار کے ساتھ انصاف کرنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ دراصل کردار کلیسا کے ذریعے ہم اس catchment تک پہنچ جاتے ہیں جہاں سے یہ لڑکیاں لائی جاتی ہیں۔ ہندوستان کے تقریباً ہر بڑے شہر میں عورتوں کا کاروبار ہوتا ہے، مگر یہاں ناول نگار کا مقصد محض اس کاروبار کی تصویر کشی کرنا نہیں ہے بلکہ اس سارے

نظام کی طرف توجہ کرنا ہے جس سے یہ سارا کاروبار جڑا ہوا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں ہمیں اپنے معاشرے کا پورا چہرا دکھائی دینے لگتا ہے۔ اس لئے صدیق عالم نے اس ناول میں خواتین کے اس مسئلے کو منٹو کی طرح نہیں بیان کرتے ہوئے قحبہ خانوں تک خود کو محدود نہیں رکھا ہے بلکہ اس نے اس کاروبار کی جڑیں ہمارے اس مقدس معاشرے کے اندر تک کھود نکالی ہیں جہاں سے یہ استحصال اپنی نمو حاصل کرتا ہے۔ میرا مطلب ہمارے شہروں کے مضافات اور بظاہر اس پاک و صاف زندگی سے ہے جسے ہم اپنے آس پاس دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں کیوں کہ اس پر تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ مذہب کی ملمع کاری ہوتی ہے۔ مشرقی پاکستان جب بنگلہ دیش بنا تو مظلوم اور ناچار پناہ گزینوں کا انخلاء شروع ہوا اور ان میں سے کچھ اس گاؤں میں آگئے جس کا نقشہ صدیق عالم نے کھینچا ہے۔ کردار 'بجرل' اور 'مکھانی بیگم' سے کہانی آگے بڑھتی ہے۔ دونوں کے اپنے نصب العین ہیں۔ ان کے وضع قطع کی عمل داری الگ ہے۔ صدیق عالم بتاتے ہیں :

"تھے گھنگھریالے بجرل کے سینے کے نیم سیاہ بال
ان میں تھی پیوست مکھانی بیگم کی پانچوں انگلیاں
مکھانی کہ تھی چست بدن، فربہ اندام"

مکھانی کا بوڑھا جاں بلب شوہر یہ سب دیکھتا ہے لیکن بجرل اور مکھانی ذاتی ضرورتوں کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ مکھانی کے بارے میں ناول نگار لکھتے ہیں :

"ارے مکھانی کا جسم ہے وہ استھان
کہ اس میں جنم جنمانتر کے لیے ڈوب جائے انسان
وہ بوڑھا جانے کب دم توڑ دے"

بوڑھے شوہر سے اولاد نہ پانے کا دکھ مکھانی کو ہے۔ وہ بجرل کو بتاتی ہے :

"کیا کیا نہ کیا میں نے گنڈا اور تعویذ
ڈال نہ سکا میری کوکھ میں مگر وہ بیج
تم سے ڈرتی ہوں، تم ہو بلا کے زرخیز

آئندہ احتیاط ضروری ہے

آخر میں ٹھہری ایک عورت''

لیکن بجرل کی نظر اس کی جوان ہوتی ہوئی بیٹی کلیسا پر بھی ہے۔ یہ لڑکی چرچ کے احاطے میں اسے ملی تھی۔ تب بوڑھے شوہر کی پہلی بیوی نے اس کا نام کلیسا رکھ دیا تھا۔ صدیق عالم رقم طراز ہیں :

گاؤں کی جل پری تھی وہ، کلیسا تھا اس کا نام

ایک تتلی کی طرح منڈلاتی رہتی صبح تا شام

کیچڑ بھرے پانی میں ٹخنوں تک غرق

کنول کے نیلے پھولوں کو لامبے ڈنٹھلوں پر کھینچتی

سورج کی تیز کرنوں سے بچنے کے لیے

اپنی خوب صورت آنکھیں بھینچتی''

اسی سلسلے کی آگے کی باتیں اس طرح ہیں :

''حاجی قطب الدین کاظمی بیٹھے تھے دروازے پر

مکھانی بیگم اس کی ٹانگوں کو پلا رہی تھی تیل

ثواب بٹورنے میں مصروف تھی بجرل کی رکھیل''

صدیق عالم نے جس ماحول کا ذکر کیا ہے، یہ مسکین طبقہ ہے جہاں عورتیں اپنا وجود سمیٹتی رہتی ہیں اور مرد خاص کر بوڑھا مرد غصہ بھی اتارتا رہتا ہے لیکن اس گھر کا مسئلہ ہی کچھ اور تھا۔ سنی میاں جیسا مرد غیرت مند اور بے حیا بھی تھا۔ اس نے ایک دن انتہا ہی کر دی :

''جس شام سنی میاں نے کیا مکھانی کا تعاقب

اور اسے بجرل کے ساتھ داخل ہوتے دیکھا

ایک مخدوش حجرے میں

کلیسا نے اپنے باپ کی آنکھوں میں دیکھی وہ نفرت

کہ ڈری سہمی وہ دبک گئی گھر کے اندر

جیسے ایک پر کٹا پرندہ پنجرے کے اندر
مگر سنی میاں نے اسے جھنجھوڑ کر جگایا
اسے سینے سے لگایا
اس سے ہم بستر ہونے کی کوشش میں
ہو گئیں اس کے دل کی دھڑکنیں تیز''

یہاں صدیق عالم نے آج کی مجبور، بے بس، ٹھکرائی ہوئی اور فیشن ایبل عورتوں کے مسائل پر گہری نظر ڈالی ہے :

''ختم ہوا وہ دور جب بیوی ہوتی تھی کنیز
ایثار و محبت کا ہوتی تھی پتلا
اب تو عورتیں جسمانی پیاس مٹاتی ہیں
شوہر کہیں اور ہوتا ہے
اپنا حسن وہ کہیں اور لٹاتی ہیں''

کلیسا کی کہانی آگے بڑھتی ہے۔ اس کے درد کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ سنی میاں اپنا غصہ، جنسی غصہ اس پر اتار رہا ہے:

''کلیسا نے چیخ کر باپ کو پیچھے ڈھکیلا
مگر وہ کمزور نازک لڑکی
جلد ہی مفتوح، آنکھیں اشک ریز
بن گئی تھی بوڑھے سنی میاں کی کنیز''

دریں اثنا جب سنی میاں کا انتقال ہو جاتا ہے تو عدت کی مدت پوری ہو جانے کے بعد بجرل اپنی بیوی کو گنگا پار بھیج دیتا ہے اور مکھانی بیگم سے نکاح کر لیتا ہے۔ کلیسا دریا کے کنارے گھومتی بھاگتی رہتی ہے، لیکن اکثر رات میں اسے سنی میاں کی حرکتیں یاد آتی ہیں۔ صدیق عالم لکھتے ہیں :

''اکثر رات رات بھر جاگتی رہتی
جانے تھے وہ کس کے انجانے ہاتھ
جو کھیلتے رہتے اس کے جسم کے ساتھ
اس کی ٹانگوں کے بیچ آتے
اس کا سینہ سہلاتے
اور اکثر رات کی خاموشی میں
کلیسا اپنے کانوں میں ڈالتی انگلیاں
کہ ڈوبتی ابھرتی سانسیں بتاتیں ایک ننگی داستان''

بجرل سے کلیسا بہت حد تک مانوس ہو چکی تھی اور بجرل کی آنکھیں کلیسا کا سراپا ناپتی رہتیں۔

اور ایک دن کا واقعہ ہے :

''جس دن پہلی بار اس نے کلیسا کو سینے سے لگایا
کلیسا کی ہڈیوں میں دوڑ گئی کپکپی
اس نے رد کرنا چاہا بجرل کا بوسہ
کہ اس کے پیٹ پر پڑا ایک زبردست گھونسہ
حرام زادی! کسی دن دبا دوں گا تیرا ٹیٹوا
مکھانی کا بھاری بدن تو صرف ایک بہانہ تھا
مجھے تو اپنے نازک پھول تک آنا تھا
تجھے ایک دن بجرل کے ہاتھوں کھلنا ہے''

اور کلیسا کی جھجک ختم ہو جاتی ہے۔ وہ اکثر اس کی حرکتوں پر ہنسنے لگتی ہے۔ صدیق عالم نے آگے کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا ہے :

''اس کی للچاتی آنکھیں دیکھ کر وہ لوٹ پوٹ جاتی
اس سے اپنا ناڑا چھڑاتی

اس کی لائی ہوئی مٹھائیاں کھاتی
اس کے رخساروں پر مچلنے لگا تھا
ایک مکار تبسم
بجرل ایک کتے کی طرح ہلاتا رہتا دم"

دوسری طرف یہ بھی ہے کہ:

"حاجی کی آنکھیں اس پر چمکاتیں بجلی
بجرل بھی وصول کرتا اپنے حصے کا مال
اس نے بھی حاجی پر تان رکھا تھا کلیسا کا جال"

پھر ایسا ہوا کہ بجرل دو فربہ اندام شریف زادوں کو لے آیا۔ ایک کا نام عبدالرب لشکر تھا۔ اس نے کلیسا کو دیکھ کر بجرل کو مشورہ دیا کہ حاجی اسے اڑا لے جائے، اس سے پہلے ہم دونوں کچھ پیسہ بنالیں۔ کلیسا کے لیے بیس ہزار روپے مل سکتے ہیں۔

بجرل کے منہ میں رس گلہ آگیا۔ اس نے کلیسا کو حاجی سے دور رکھنے کی کوشش کی کہ بوڑھا اس سے مباشرت کرنہیں سکتا کہ اس کی کمر میں دم ہی نہیں ہے۔ مکھانی خواب دیکھ رہی تھی کہ حاجی سے کلیسا کی شادی ہو جانے پر ہماری قسمت سدھر جائے گی۔ وہ بڑے گھر کی ساس کہلائے گی لیکن لشکر کے ساتھ شہر میں رہ کر اچھی زندگی کی لالچ دے کر بجرل نے کلیسا کو شیشے میں اتار لیا اور آخر ایک رات چپکے سے بیٹی پر ایا دھن کی طرح اس نے اسے لشکر کے حوالے کر دیا۔ کلیسا نے پہلی بار بڑا شہر، کلکتہ دیکھا۔ لشکر نے اسے شیث محمد اور شیخ طوطا کے حوالے کر دیا۔ ان دونوں کے بارے میں صدیق عالم گویا ہیں :

"چاندنی کی ایک گلی سے چلاتے تھے کاروبار
دونوں ساجھے دار
شیث محمد اور شیخ طوطا
بلیک میں ٹکٹ بیچنے کے لیے

عورتیں چھوڑ رکھی تھیں سینما ہالوں پر

پالتے تھے جیب کترے

مسخ بھکاری پھیلا رکھے تھے ہر چوک ہرنا کے پر

شیخ طوطا نے حقارت سے کلیسا پر نظر ڈالی

اتنی بڑی رقم کے بدلے کیا اٹھالایا موالی

اس غریب کو نچوڑ کر لوگ کیا پائیں گے؟

گاہک کتے نہیں کہ سوکھی ہڈی چبائیں گے

فی الحال اسے کرزن پارک میں کام پر لگادو

خوب کھلاؤ پلاؤ، کرو تندرست

مجھے چاہیے اس کا بدن چست

اتنا رکھنا ہے خیال

اس کے کنوارے پن پر نہ آئے آنچ

آج کل گاہک نہیں جھجکتے کروانے سے ڈاکٹری جانچ''

کلیسا کو دن بھر گھر کے کام کاج کے لیے جی توڑ محنت کرنی پڑتی اور شام کو سجا سنوار کر کرزن پارک لائی جاتی جہاں اس کے بدن کو ڈرائیور، دوافروش، کلرک اور عطار چھوتے جس کے لیے وہ پیسے دیتے اور جس کا آدھا حصہ پولیس لے جاتی۔ کلیسا یہ سب کرنا نہیں چاہتی تھی لیکن لاچار تھی۔ شہر کے اس غلیظ چہرے کے بیچ اسے رہنا تھا، ننگے پیروں وہ بہت دور نکل آئی تھی۔

صدیق عالم نے بظاہر ایک سامنے کی کہانی بیان کی ہے مگر اس کا پس منظر کافی وسیع اور پیچیدہ ہے۔ ناول نگار کا مقصد صرف یہ نہیں کہ اس کی تصویر کشی کی جائے کہ گاؤں کے ماحول میں غربت کی زندگی جینے والی عورتیں کیسے کیسے مسائل سے جوجھتی ہیں اور کون سی قوتیں ہیں جو انھیں فطرت کے اس صاف ستھرے ماحول سے اٹھا کر بڑے بڑے شہروں کے قحبہ خانوں تک لے آتی ہیں یہاں تک کہ باگماری (شہر کا ایک معروف قبرستان) جیسی جگہ میں چنوادی جاتی ہیں بلکہ وہ یہ

بھی بتانا چاہتے ہیں کہ قدرت کا یہ انتظام نہیں ہے، یہ نظام خود انسان کا اپنا ڈھالا ہوا ہے جس نے عورت کو ایک commodity کے طور پر استعمال کرنے کیلئے تہذیب وتمدن کے تمام ہتھکنڈے استعمال کرر کھے ہیں یہاں تک کہ خدا کے نام کا سہارا لینے سے بھی نہیں جھجکتے۔ انھوں نے کہانی بیان کرتے ہوئے اس حقیقت کا خیال رکھا ہے کہ عورتوں کی جنسی خواہشیں ہوتی ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے اپنے جذبات ہوتے ہیں۔ بوڑھا مرد جوان جسم کو تسکین نہیں پہنچا سکتا۔ یہیں سے جنسی بے راہ روی کی شروعات ہوتی ہے اور مذکورہ کردار و واقعات ہمارے سامنے ہوتے ہیں اور ان سب کے درمیان عورت کہیں مکھانی تو کہیں کلیسا بن کر ہمارے سماج کی سچائی بیان کرتی ہے۔ یہ ایک مسئلہ ہے جس پر سوچنا ہی پڑتا ہے۔

اسلم جمشید پوری: ایک ہمہ جہت فن کار

پروفیسر اسلم جمشید پوری، اردو فکشن کا ایک معروف نام ہے جو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ میں صدر، شعبۂ اردو ہیں مگر انہوں نے اپنے تخلیقی جوہر، اپنی طبعی جودت، تنقیدی ذکاوت اور علمی وادبی کاز کے فروغ کی سرگرمیوں سے اپنی منفرد شناخت بنائی ہے۔ طلبا اور نو آموز قلمکاروں کی تربیت، ان میں تحقیقی وتنقیدی بصیرت اور تخلیقی جوہر کو نکھارنے سنوارنے حتیٰ کہ میڈیا کے جدید وسائل سے آشنا کرنے کی مختلف النوع کاوشوں نے انہیں مقبول بنایا تو ان کی افسانہ نگاری، فکشن تنقید، تحقیق تعمق، ترجمہ نگاری اور صحافتی کارکردگیوں نے اردو دنیا میں انہیں معتبر بنایا۔

اسلم جمشید پوری بنیادی طور پر تخلیق کار ہیں اور اظہار کا وسیلہ صنف افسانہ ہے۔ ۱۹۸۱ء سے اس صنف میں اپنا تخلیقی جوہر دکھار ہے ہیں۔ اشاعتِ اخبارات ورسائل کے علاوہ ۹ر افسانوی مجموعے منظر عام پر لا چکے ہیں۔ بڑوں کی ذہنی سیرابی کے ساتھ بچوں کی آبیاری کیلئے خوب کہانیاں لکھی ہیں۔ انہوں نے زمانے کے تشنج کو اپنی تخلیقیت میں ضم کر کے افسانہ بُنا ہے۔ ان میں گاؤں، شہر، مرد، عورت، جذباتی وجنسی مسائل، جبر واستبداد، استحصال، ناکامی، کامرانی، بیرون خانہ اور درونِ خانہ کے رنگارنگ کوائف، کیفیتیں اور نوعیتیں ان کے فن سے ہم آمیز ہو کر بڑے دلکش انداز میں صفحاتِ قرطاس پر ابھری ہیں۔ ان کے افسانے اس لئے دلکش ہوتے ہیں کہ یہ واقعہ، کردار، مکالمے اور فکری نکات اپنی کہانیوں میں اس طور ہم آمیز کرتے ہیں کہ وہ قاری کے اندر انہماک و تجسس پیدا کر دیتے ہیں اور قاری کہانی کے بہاؤ میں ایسا بہہ جاتا ہے کہ افسانہ ختم ہو جاتا ہے مگر اس کا تاثر ذہن پر مسلط رہتا ہے۔ انہوں نے کئی شاہکار افسانے دیئے ہیں اور کئی کردار جیسے 'لینڈرا'، 'شبراتی' کا ننھا ساجد، ببلی اور ظفر وغیرہ ناقابل فراموش کردار دیئے ہیں۔ یہ کردار سازی پر دستگاہ رکھتے ہیں تو زبان واسلوب، واقعہ نگاری، منظر کشی کی انہیں مہارت حاصل ہے۔ یہ اپنے

موضوعات کو بیشتر سادہ و برجستہ اسلوب میں برتتے ہیں مگر موضوع کے تقاضے کے تحت تمثیل، تلمیح اور استعارے سے بھی خوب کام لیتے ہیں۔ افسانہ کے دامن کو بھی ترفع عطا کرتے ہیں۔ اسلئے افسانہ نگاری میں یہ اپنی معتبر شناخت رکھتے ہیں۔ عابد سہیل موصوف کی افسانہ نگاری کے متعلق لکھتے ہیں :

''مصنف نے کہا ہے کہ وہ مختصر یعنی بہت مختصر افسانے لکھتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ افسانے کی لمبائی مصنف نہیں طے کرتا۔ یہ کام تو افسانے کا سروکار، اس کا Treatment اور اس کے کردار و واقعات کرتے ہیں۔ مصنف نے جن کہانیوں کو طویل کہانیاں کہا ہے، وہ بس اتنی طویل ہیں جتنی عام کہانیاں ہوتی ہیں بلکہ شاید ان سے کم ہی اور وہ برا نہ مانیں تو عرض کروں کہ ان کی طویل کہانیاں ان کی چھوٹی کہانیوں سے کہیں اچھی ہیں۔ اسلئے میں اور ان کے قاری ایسی کہانیاں پڑھنی پسند کریں گے جنھیں وہ طویل کہانیاں کہتے ہیں۔ اس طرح کی کہانیوں میں کرداروں کو آپ اپنے آپ کو منکشف کرنے اور واقعات کو خود قائم کرنے اور بیان کو بیانیہ بننے کا موقع ملتا ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ بیانیہ ہمیشہ بیان سے طویل ہوتا ہے۔''

(اسلم جمشید پوری کی افسانہ نگاری: ''لینڈرا'' کے آئینے میں
مشمولہ ''مژگاں'' کولکاتا اپریل تا جون ۲۰۱۶ء ص:۲۸۸)

بچوں کیلئے ادب لکھنا آسان نہیں ہوتا۔ بچی عمر کی ذہانت وافتاد، اس کی نفسیات پر گرفت اور زبان وبیان پر قدرت حاصل ہو تبھی کوئی بچوں کو اپنی طرف متوجہ کرسکتا ہے۔ اسلم جمشید پوری نے اس میدان کو بھی سر کرلیا ہے۔ اخبارات و رسائل میں چھپی کہانیوں کے علاوہ دو کہانیوں کے مجموعے بنام ''ممتا کی آواز'' اور ''عقلمند لڑکا'' بھی خاصے مقبول ہوئے۔ بچوں کی ذہنی نشو ونما اور ادبی تربیت کیلئے انہوں نے سات حصوں پر مشتمل ''کائناتِ اردو'' کی اشاعت جس کے کئی ایڈیشن چھپے۔ یہ سب ادبِ اطفال میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میدانِ تحقیق میں ان کا اختصاص یہ ہے کہ ان کے متعدد مضامین ومقالے رسائل اور سیمیناروں میں موجبِ بحث بنے تو دوسری طرف انہوں نے اپنی نگرانی میں ریسرچ اسکالروں سے متعدد مقالے لکھوا کر ادب کے تشنہ جہات کو سیراب کیا۔ انکی تحقیقی بصیرت

اور تعمق کے نمونے انکی کتاب ''تفہیم شعر، تحقیقی وتنقیدی مضامین'' میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ سہ ماہی ''مژگاں'' کولکاتا نے اپریل تا جون ۲۰۱۶ء کے شمارہ میں انکی ادبی خدمات پر مبسوط گوشہ بھی شائع کیا ہے۔

تنقید میں اسلم جمشید پوری نے ''فکشن تنقید'' کو مرکزِ توجہ بنا رکھا ہے کیونکہ اوّلاً تو یہ خود فکشن کی دنیا کے تخلیق کار ہیں اور فن پر بڑی دوررس اور گہری نظر رکھتے ہیں۔ دوسرے پچھلے تقریباً تیس برسوں سے فکشن بالخصوص افسانہ اردو کے فروغ اور معاشرتی حساسیت کو اجاگر کرنے کا وسیلہ بنا ہوا ہے۔ اس لئے یہ فکشن تنقید کے میدان میں فطری مناسبت کے سبب اترے اور اپنی نگارشات سے ادبی دنیا میں اپنی منفرد شناخت قائم کی۔ وہ اس طرح کہ مروجہ تنقیدی نظر اور نظریئے سے ہٹ کر فنی اساس تنقیدی رویہ اختیار کیا اور ناول، ناولٹ اور افسانے کی تعبیر وتشریح تقاضائے وقت اور عقل و خرد کی روشنی میں کرنے کی سعی کی ہے۔ ان کا زورِ قلم قاری اور تخلیق کار کے درمیان باہمی رشتہ استوار کرنے میں صَرف ہو رہا ہے کیونکہ انہوں نے حالات کے تناظر سے یہی اخذ کیا :

> ''نئی نسل کی تنقیدات سے ایک اور طلسم ٹوٹتا ہوا محسوس ہو رہا ہے کہ اب ناقدین ادب کے بلند و بالا ایوان مسمار ہو رہے ہیں اور انکی جگہ تنقیدی جھونپڑیاں خاصی تعداد میں ابھر رہی ہیں۔ ان کچی دیواروں اور پھوس کی چھتوں والے مکانوں سے فرمانات و احکامات جاری نہیں ہوتے ہیں۔ یہاں ایک دوسرے کو زیر کرنے کی ریس بھی نہیں ہے۔ ان کچے مکانوں میں ادب کو اپنے اپنے طور پر سمجھنے اور سمجھانے کا عمل جاری ہے۔ ادب کی گروہ بندیاں خود اپنی موت مر رہی ہیں اور ابھر رہا ہے ایک نیا یکساں سماج، جس میں ناقد اور تخلیق کار ایک ہی صف میں ہم کلام ہیں۔ ایک دوسرے کو سمجھنے اور پرکھنے کا عمل نئے رشتے استوار کر رہا ہے۔ قاری اور تخلیق کار کے درمیان نت نئے رشتے استوار ہو رہے ہیں کہ قاری کہانیوں اور ناولوں میں باضابطہ کردار کی شکل میں شامل ہو رہا ہے۔ قاری اپنے دکھ درد کی ترجمانی پر مصنف سے باز پرس بھی کر رہا ہے۔ ایسے میں قاری اور فکشن نگار کے درمیان نئے رابطے بن رہے ہیں۔''

(اردو فکشن: تنقید اور تجزیہ، اسلم جمشید پوری، ٹائٹل پیج)

تنقید نگاری کے اس تناظر میں سیمیناروں میں پیش کردہ مقالات اور رسائل کے مضامین کے علاوہ یہ کتابیں ''جدیدیت اور اردو افسانہ، ترقی پسند اردو افسانہ اور چند اہم افسانہ نگار، اردو افسانہ: تعبیر و تنقید، اردو فکشن: تنقید و تجزیہ، تفہیم شعر، تحقیقی و تنقیدی مضامین، اردو فکشن کے پانچ رنگ، تجزیہ''، ''مابعد جدیدیت اور اردو افسانہ'' پیش کر چکے ہیں۔

بحیثیت فنکار، موصوف فنی نکات کی باریکیوں سے بخوبی آگاہ ہیں، اس لئے یہ ناول، ناولٹ، افسانے پر جو تنقید و تجزیہ رقم کرتے ہیں وہ قاری اساس ہوتا ہے اور متوجہ کرتا ہے۔ ان کی تنقیدی نگارشات میں تنقیدی نظر اور نظریے، ترقی پسند، جدیدیت اور مابعد جدیدیت رجحانات پر تخلیقی حوالے سے جو مبحث ملتے ہیں وہ قابل توجہ ہوتے ہیں۔ تجزیہ بھی تنقیدی اساس رکھتا ہے۔ کیونکہ اس میں تخلیق کے متن اور بین المتون کو سمجھنا اور سمجھانا ہوتا ہے۔ تجزیہ نگاری پر انہوں نے خاصا زورِ قلم صرف کیا ہے۔ ان کا تجزیہ بڑا نپا تلا اور سلجھا ہوتا ہے۔ کسی ناول، ناولٹ یا افسانہ کی پرتیں یہ اس طرح کھولتے ہیں کہ فکر و فن کا ہر گوشہ روشن ہو جاتا ہے اور قاری میں انہیں پڑھنے کی کسک پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر وہ پڑھا ہوا ہوتا ہے تو ان کا تجزیہ دیکھنے کے بعد پھر اس کی طرف رجوع کرتا ہے۔ انہوں نے اپنی تجزیہ نگاری میں ہر مروّجہ پیرائے کو برتا ہے اور کہیں نیا انداز بھی اپنایا ہے۔ لگتا ہے ایسی کوشش انہوں نے دانستہ کی ہے تاکہ ہر طریقۂ تجزیہ نگاری سے لوگ بیک وقت آشنا ہو سکیں۔ ان تجزیہ نگاری کا مجموعہ ''تجزیہ'' اس کی واضح مثال ہے۔ اس مجموعہ میں انیسویں تا اکیسویں صدی کے اہم ناول، ناولٹس اور افسانے جو ہر ادبی رجحان کی نمائندگی کرتے ہیں کے رنگارنگ تجزیے یکجا ہیں۔ اسی طرح کی تنقیدی کاوشیں کتاب ''اردو فکشن کے پانچ رنگ'' میں بھی ملتی ہیں جو ان کی تنقیدی نگارشات کو نیا رنگ دینے کی قابل تحسین کاوش ہے۔

اسلم جمشید پوری کے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا میں بھی کنٹری بیوشن کے انمٹ نقوش ثبت ہیں۔ یہ دورِ طالب علمی سے ہی صحافت سے وابستہ رہے۔ جھارکھنڈ کے ہندی جریدے ''ادت وانی، آج، آواز، پربھات خبر کی مجلس ادارت میں شامل رہے۔ بہار، بنگال اور دہلی کے متعدد جرائد میں کالم نگاری کی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی سے ۱۹۹۴ء میں وال میگزین ''ہم سخن''، دہلی سے ۱۹۹۸ء

میں ہندی میگزین ''یونیورسل ایڈ'' چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی سے ۲۰۰۳ء میں ''ہماری آواز'' (اردو، ہندی)، میرٹھ سے ہندی میگزین ''فرنٹ میڈیا'' اور ۲۰۱۰ء میں کلچرل کاؤنسل، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کا ترجمان سہ ماہی ''پریاس'' جاری کیا۔

آل انڈیا ریڈیو جمشید پور، رانچی، دہلی اور دوردرشن، سہارا سے، ٹوٹل ٹی وی، ای ٹی وی، سٹی چینل سے ڈیڑھ سو سے زیادہ پروگرام نشر کر چکے ہیں۔ ۱۰۴ رقسطوں میں ڈی ڈی ٹو چینل پر نشر ہونے والے ریوتی شرن شرما کے ساتھ سیریل ''خوشی'' کی اسکرپٹ کے علاوہ سیریل ''آپ بیتی، جگ بیتی، شمع جلتی رہی، چاند اور چکور، جانے کتنے موڑ، سانچ کو آنچ، ابن الوقت، روشنی، گلدستہ، اور 'مرکزِ علم' کی اسکرپٹ لکھی ہیں۔ ڈاکیومنٹری فلمیں ''دھرم ایک وراثت''، ''ہماری وراثت''، ''ادھورا بچپن''، ''شانِ امروہہ'' وغیرہ بنائیں اور چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی پر بھی ایک دستاویزی فلم تیار کی ہے۔ ان کے توسط سے انہوں نے اپنی خدمات کی جستجو اور مہارت کا سکہ جمایا ہے تو دوسری طرف معاشرتی بہبود کی فکر سے اپنی وابستگی کا نقش ثبت کیا ہے۔ اس طرح اسلم جمشید پوری نے اپنی فکر، اپنے فن، اپنی کارکردگی اور سرگرمیوں سے شعبہ ہائے زندگی کے مختلف النوع جہات کو آئینہ کیا ہے، کیونکہ بقول ڈاکٹر صالحہ رشید:

> ''ڈاکٹر اسلم نے حساس طبیعت پائی ہے جس میں اضطراب بھی درآیا ہے اور یہ اضطراب سنجیدگی، فکرمندی اور تجربہ پسندی سے عبارت ہے جو ذات کی حدیں پار کرتا ہوا اجتماعیت میں داخل ہو گیا ہے۔ آپ عملی طور پر ہمہ وقت معاشرہ کی بہبود کیلئے کوشاں رہتے ہیں۔ چونکہ آپ فنکار ہیں اس لئے معاشرتی سرگرمیاں آپ کی فکر ونظر پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں اور یہیں سے سماج کو ادب سے جوڑنے کے عمل کا آغاز ہوتا ہے۔'' (اسلم جمشید پوری: اردو افسانے کی ایک منفرد آواز، ص: ۲۳)

ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے سماج سے ادب کو جوڑنے کے عمل کی ہر جہت میں اپنی انفرادیت پیدا کر کے اپنی شناخت بنائی ہے اور اپنی طرف لوگوں کو متوجہ کیا ہے جو یقیناً بڑی بات ہے۔

❖❖❖

ڈاکٹر امام اعظم کی کتابیں

اور یہ کتابیں / جریدے

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
New Delhi , INDIA
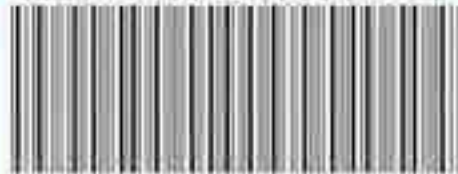
ISBN 978-93-89358-19-3
978- 93- 89358- 19- 3
www.ephbooks.com